اُمُّ الکتاب



اُمُّ الکتاب

(تفسیر سورۂ فاتحہ)

ابوالکلام آزاد

مکتبۂ احباب
وسن پورہ۔ لاہور



میرے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں ہے، جس میں شک کے سارے کانٹے نہ چبھ چکے ہوں، اور میری روح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں ہے جو انکار کی ساری آزمائشوں میں سے نہ گذر چکا ہو۔ میں نے زہر کے گھونٹ بھی ہر جام سے پئے ہیں، اور تریاق کے نسخے بھی ہر دارالشفا کے آزمائے ہیں۔ میں جب پیاسا تھا تو میری لب تشنگیاں دوسروں کی طرح نہ تھیں۔ اور جب سیراب ہوا تو میری سیرابی کا سر چشمہ بھی شاہراہ عام پر نہ تھا۔

راہے کہ خضر داشت ز سرچشمہ دور بود
لب تشنگی ز راہے دگر بردہ ایم ما!

اس تمام عرصہ کی جستجو و طلب کے بعد قرآن کو جیسا کچھ اور جتنا کچھ سمجھ سکا ہوں میں نے اس کتاب کے صفحوں پر پھیلا دیا ہے۔

ابوالکلام آزاد

فہرس

طابع : اشرف پریس لاہور
ناشر : مکتبۂ احباب لاہور
قیمت : پانچ روپے آٹھ آنے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱)

سُورت کی اہمیّت اور خصوصیات

یہ قرآن کی سب سے پہلی سُورت ہے۔ اس لیے فاتحۃ الکتاب کے نام سے پُکاری جاتی ہے۔

جو بات زیادہ اہم ہوتی ہے، قدرتی طور پر پہلی اور نمایاں جگہ پاتی ہے۔ یہ سورت قرآن کی تمام سورتوں میں خاص اہمیت رکھتی تھی، اس لیے قدرتی طور پر اس کی موزون جگہ قرآن کے پہلے صفحے ہی میں قرار پائی۔ چنانچہ خود قرآن نے اس کا ذکر ایسے لفظوں میں کیا ہے، جس سے اس کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

وَلَقَدۡ اٰتَیۡنٰکَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ وَالۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِیۡمَ (۱۵ : ۸۷)	اے پیغمبر! یہ واقعہ ہے کہ ہم نے تمہیں سات دُہرائی جانے والی چیزیں عطا فرمائیں اور قرآنِ عظیم۔

احادیث و آثار سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس آیت میں "سات دُہرائی جانے والی چیزوں" سے مقصود یہی سورت ہے۔ کیونکہ یہ سات آیتوں کا مجموعہ ہے اور ہمیشہ نماز میں دُہرائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت کو اَلسَّبۡعُ الۡمَثَانِیۡ

اساس القرآن کے معنی ہیں قرآن کی بنیاد۔ الکافیہ کے معنی ہیں ایسی چیز جو کفایت کرنے والی ہو۔ الکنز خزانہ کو کہتے ہیں۔

علاوہ بریں ایک سے زیادہ حدیثیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کے یہ اوصاف عہدِ نبوت میں عام طور پر مشہور تھے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ابی بن کعب کو یہ سورت تلقین کی اور فرمایا "اس کے مثل کوئی سورت نہیں"۔ ایک دوسری روایت[۱] میں اسے "سب سے بڑی سورت" اور "سب سے بہتر سورت" بھی فرمایا ہے۔

سورۂ فاتحہ میں دینِ حق کے تمام مقاصد کا خلاصہ موجود ہے

چنانچہ اس سورت کے مطالب پر نظر ڈالتے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں اور قرآن کے بقیہ حصے میں اجمال اور تفصیل کا سا تعلق پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی قرآن کی تمام سورتوں میں دینِ حق کے جو مقاصد بہ تفصیل بیان کیے گئے ہیں، سورۂ فاتحہ میں انہی کا بہ شکلِ اجمال بیان موجود ہے۔ اگر ایک شخص قرآن میں سے اور کچھ نہ پڑھ سکے، صرف اس سورت کے مطالب ذہن نشین کر لے، جب بھی وہ دینِ حق اور خدا پرستی کے بنیادی مقاصد معلوم کر لے گا۔ اور یہی قرآن کی تمام تفصیلات کا ماحصل ہے۔

علاوہ بریں جب اس پہلو پر غور کیا جائے کہ سورت کا پیرایہ دعائیہ ہے اور اسے روزانہ عبادت کا ایک لازمی جزو قرار دیا گیا ہے، تو اس کی یہ خصوصیت اور زیادہ

---

[۱] ابوسعید بن معلی کی روایت میں جس کی تخریج پچھلے حاشیہ میں گذر چکی ہے اسے "اعظم سورۃ فی القرآن" فرمایا ہے اور مسند کی روایت ابن جابر میں "اخیر" کا لفظ ہے۔ ۱۲

بھی کہتے ہیں[1]۔

احادیث و آثار میں اس کے دوسرے نام بھی آئے ہیں جن سے اس کی خصوصیات کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً اُمّ القرآن، الکافیہ، الکنز، اساس القرآن[2]۔

عربی میں "اُمّ" کا اطلاق تمام ایسی چیزوں پر ہوتا ہے جو ایک طرح کی جامعیت رکھتی ہوں، یا بہت سی چیزوں میں مقدم اور نمایاں ہوں، یا پھر کوئی ایسی اوپر کی چیز ہو جس کے نیچے اس کے بہت سے توابع ہوں۔ چنانچہ سر کے درمیانی حصّے کو اُمّ الرّاس کہتے ہیں، کیونکہ وہ دماغ کا مرکز ہے۔ فوج کے جھنڈے کو اُمّ کہتے ہیں کیونکہ تمام فوج اسی کے نیچے جمع ہوتی ہے۔ مکّہ کو اُمّ القریٰ کہتے تھے، کیونکہ خانۂ کعبہ اور حج کی وجہ سے عرب کی تمام آبادیوں کے جمع ہونے کی جگہ تھی۔ پس اس سورت کو اُمّ القرآن کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ایک ایسی سورت ہے جس میں مطالب قرآنی کی جامعیت اور مرکزیت ہے یا جو قرآن کی عام سورتوں میں اپنی نمایاں اور مقدّم جگہ رکھتی ہے۔

---

[1] امام بخاری اور اصحاب سنن نے ابوسعید بن المعلّٰی سے روایت کی ہے: الحمد للہ ربّ العٰلمین ھی السبع المثانی والقرآن العظیم الذی اوتیتہ۔ اور امام مالک، ترمذی اور حاکم نے ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلعم نے ابی ابن کعبؓ کو سورۂ فاتحہ تلقین کی اور یہی الفاظ فرمائے اسی طرح طبری نے حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ وغیرہم سے روایت کی ہے کہ السبع المثانی فاتحۃ الکتاب۔ ابن مسعودؓ کی اسناد منقطع ہے۔ لیکن ابن عباسؓ کی سعید بن جبیرؓ ابوالعالیہ سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔ اس کے علاوہ ائمۂ تابعین کی ایک بہت بڑی جماعت اسی طرف گئی ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں تمام روایات جمع کر دی ہیں۔ (شرح کتاب التفسیر جلد ۸ صفحہ ۱۲۰ طبع اولیٰ)

[2] صحیح بخاری، موطا، ابوداؤد، ابن ماجہ اور مسند میں با ختلاف الفاظ اس مضمون کی روایت موجود ہیں ۱۲

جس قدر ٹھوکریں لگی ہیں، صفات ہی کے تصور میں لگی ہیں

(۲) قانونِ مجازات کا اعتقاد۔ یعنی جس طرح دنیا میں ہر چیز کا ایک خاصہ اور قدرتی تاثیر ہے، اسی طرح انسانی اعمال کے بھی معنوی خواص اور نتائج ہیں نیک عمل کا نتیجہ اچھائی ہے۔ بُرے کا بُرائی۔

(۳) معاد کا یقین۔ یعنی انسان کی زندگی اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کے بعد بھی زندگی ہے اور جزا کا معاملہ پیش آنے والا ہے۔

(۴) فلاح وسعادت کی راہ اور اس کی پہچان۔

سورۂ فاتحہ کا اسلوب بیان

اب غور کرو، ان باتوں کا خلاصہ اس سورت میں کس خوبی کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔ ایک طرف زیادہ سے زیادہ مختصر، حتیٰ کہ گِنے ہوئے الفاظ ہیں۔ دوسری طرف ایسے نپے تُلے الفاظ کہ ان کے معانی سے پوری وضاحت اور دل نشینی پیدا ہو گئی ہے۔ ساتھ ہی نہایت سیدھا سادہ بیان ہے۔ کسی طرح کا پیچ و خم نہیں۔ کسی طرح کا اُلجھاؤ نہیں۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ دنیا میں جو چیز جتنی زیادہ حقیقت سے قریب ہوتی ہے، اتنی ہی زیادہ سہل اور دل نشین بھی ہوتی ہے۔ اور خود فطرت کا یہ حال ہے کہ کسی گوشے میں بھی اُلجھی ہوئی نہیں ہے۔ اُلجھاؤ جس قدر بھی پیدا ہوتا ہے، بناوٹ اور تکلّف سے پیدا ہوتا ہے۔ پس جو بات سچّی اور حقیقی ہوگی، ضروری ہے کہ سیدھی سادی اور دلنشین بھی ہو۔ دل نشینی کی انتہا یہ ہے کہ جب کبھی کوئی ایسی بات تمہارے سامنے آجائے تو ذہن کو کسی طرح کی اجنبیت محسوس نہ ہو۔ وہ اس طرح قبول کرلے گویا پیشتر سے سمجھی بوجھی ہوئی بات تھی۔ اُردو کے ایک شاعر نے اسی حقیقت

نمایاں ہوجاتی ہے، اور واضح ہوجاتا ہے کہ اس اجمال و تفصیل میں بہت بڑی مصلحت پوشیدہ تھی۔ مقصود یہ تھا کہ قرآن کے مفصّل بیانات کا ایک مختصر اور سیدھا سادہ خلاصہ بھی ہو جسے ہر انسان بآسانی ذہن نشین کرلے، اور پھر ہمیشہ اپنی دعاؤں اور عبادتوں میں دُہراتا رہے۔ یہ اس کی دینی زندگی کا دستور العمل، خداپرستی کے عقائد کا خلاصہ، اور روحانی تصوّرات کا نصب العین ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس سورت کا ذکر کرتے ہوئے سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ کہہ کر اس کی خصوصیت کی طرف اشارہ کردیا۔ یعنی ہمیشہ دہرائے جانے اور وِرد رکھنے ہی میں اس کے نزول کی حکمت پوشیدہ ہے۔ کوئی شخص کتنا ہی نادان اور اَن پڑھ ہو، لیکن ان چار سطروں کا یاد کرلینا اور ان کا سیدھا سادہ مطلب سمجھ لینا اس کے لیے کچھ دشوار نہیں ہوسکتا۔ اگر ایک انسان اس سے زیادہ قرآن میں سے کچھ نہ پڑھ سکا جب بھی اس نے دینِ حق کا بنیادی سبق حاصل کرلیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان کے لیے اس سورت کا سیکھنا اور پڑھنا ناگزیر ہوا۔ اور نماز کی دعا اس کے سوا کوئی نہ ہوسکی، کہ لَا صَلٰوةَ اِلَّا بِفَاتِحَةِ الْکِتَابِ (صحیحین) اور اسی لیے صحابۂ کرام اسے "سورۃ الصلوٰۃ" کے نام سے پکارتے تھے۔ یعنی وہ سورت جس کے بغیر نماز نہیں پڑھی جاسکتی! ایک انسان اس سے زیادہ قرآن میں سے جس قدر پڑھے اور سیکھے مزید معرفت و بصیرت کا ذریعہ ہوگا لیکن اس سے کم کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔

دینِ حق کا ماحصل

دینِ حق کا تمام تر ماحصل کیا ہے؟ جس قدر غور کیا جائے گا، ان چار باتوں سے باہر کوئی بات دکھائی نہ دے گی:-

(۱) خدا کی صفات کا ٹھیک تصوّر، اس لیے کہ انسان کو خداپرستی کی راہ میں

آجاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے اس سے زیادہ صاف اور سہل بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ عرفی نے یہی حقیقت ایک دوسرے پیرائے میں بیان کی ہے:

ہر کس نشناسندۂ راز ست، وگرنہ — اینہا ہمہ راز ست کہ معلوم عوام ست!

دنیا میں جب کبھی وحی الٰہی کی ہدایت نمودار ہوئی ہے، اس نے یہ نہیں کیا ہے کہ انسان کو نئی نئی باتیں سکھادی ہوں۔ کیونکہ خدا پرستی کے بارے میں کوئی انوکھی بات سکھائی ہی نہیں جا سکتی۔ اس کا کام صرف یہ رہا ہے کہ انسان کے وجدانی عقائد کو علم و اعتراف کی ٹھیک ٹھیک تعبیر بتادے اور یہی سورۂ فاتحہ کی خصوصیت ہے، اس سورت نے نوعِ انسانی کے وجدانی تصوّرات ایک ایسی تعبیر سے سنوار دیئے کہ ہر عقیدہ، ہر فکر، ہر جذبہ اپنی شکل و نوعیت میں نمودار ہو گیا، اور چونکہ یہ تعبیر حقیقتِ حال کی سچی تعبیر ہے، اس لیے جب کبھی ایک انسان راستبازی کے ساتھ اس پر غور کرے گا، بے اختیار پکار اٹھے گا کہ اس کا ہر بول، اور ہر لفظ اس کے دل و دماغ کی قدرتی آواز ہے!

دینِ حق کی مہمات | پھر دیکھو، اگرچہ اپنی نوعیت میں وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ ایک خدا پرست انسان کی سیدھی سادی دعا ہے، لیکن کس طرح اس کے ہر لفظ اور ہر اسلوب سے دینِ حق کا کوئی نہ کوئی اہم مقصد واضح ہو گیا ہے، اور کس طرح اس کے الفاظ نہایت اہم معانی و دقائق کی نگرانی کر رہے ہیں۔

(۱) خدا کے تصوّر کے بارے میں انسان کی ایک بڑی غلطی یہ رہی ہے کہ اس کے تصوّر کو محبت کی جگہ خوف و دہشت کی چیز بنا لیا تھا۔ سورۂ فاتحہ کے سب سے پہلے لفظ نے اس گمراہی کا ازالہ کر دیا۔

کی طرف اشارہ کیا ہے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اب غور کرو کہ جہاں تک انسان کی خدا پرستی اور خدا پرستی کے تصورات کا تعلق ہے، اس سے زیادہ سیدھی سادی باتیں اور کیا ہوسکتی ہیں جو اس سورت میں بیان کی گئی ہیں۔ اور پھر اس سے زیادہ سہل اور دل نشین اسلوب بیان کیا ہوسکتا ہے؟ سات چھوٹے چھوٹے بول ہیں، ہر بول پانچ لفظوں سے زیادہ کا نہیں، اور ہر لفظ صاف اور دل نشین معانی کا نگینہ ہے جو اس انگوٹھی میں جڑ دیا گیا ہے۔ اللہ کو مخاطب کر کے ان صفتوں سے پکارا گیا ہے جن کا جلوہ شب و روز انسان کے مشاہدے میں آتا رہتا ہے، اگرچہ اپنی جہالت و غفلت سے ان میں غور و فکر نہیں کرتا۔ پھر اس کی بندگی کا اقرار ہے، اس کی مددگاریوں کا اعتراف ہے، اور زندگی کی لغزشوں سے بچ کر سیدھی راہ لگ چلنے کی طلبگاری ہے کوئی مشکل خیال نہیں، کوئی انوکھی بات نہیں، کوئی عجیب و غریب راز نہیں اب کہ ہم بار بار یہ سورت پڑھتے رہتے ہیں، اور صدیوں سے اس کے مطالب نوع انسانی کے سامنے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہمارے دینی تصورات کی ایک بہت ہی معمولی سی بات ہے، لیکن یہی معمولی بات جس وقت تک دنیا کے سامنے نہیں آئی تھی، اس سے زیادہ کوئی غیر معلوم اور ناقابل حل بات بھی نہ تھی۔ دنیا میں حقیقت اور سچائی کی ہر بات کا یہی حال ہے جب تک سامنے نہیں آتی، معلوم ہوتا ہے، اس سے زیادہ مشکل بات کوئی نہیں، جب سامنے

(۴) ربوبیت اور رحمت کے بعد مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے وصف نے بھی یہ حقیقت آشکارا کردی کہ اگر کائنات میں صفاتِ رحمت و جمال کے ساتھ قہر و جلال بھی اپنی نمود رکھتی ہیں، تو یہ اس لیے نہیں کہ پروردگار عالم میں غضب و انتقام ہے، بلکہ اس لیے ہے کہ وہ عادل ہے اور اس کی حکمت نے ہر چیز کے لیے اس کا ایک خاصہ اور نتیجہ مقرر کر دیا ہے۔ عدل منافیِ رحمت نہیں ہے بلکہ عین رحمت ہے۔

(۵) عبادت کے لیے، نہیں کہا کہ نَعْبُدُكَ بلکہ کہا اِيَّاكَ نَعْبُدُ یعنی یہ نہیں کہا کہ "تیری عبادت کرتے ہیں" بلکہ حصر کے ساتھ کہا "صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔" اور پھر اس کے ساتھ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کہہ کر استعانت کا بھی اسی حصر کے ساتھ ذکر کردیا۔ اس اسلوب بیان نے توحید کے تمام مقصد پورے کر دیے، اور شرک کی ساری راہیں بند ہوگئیں۔

(۶) سعادت و فلاح کی راہ کو صِرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ یعنی سیدھی راہ سے تعبیر کیا جس سے زیادہ بہتر اور قدرتی تعبیر نہیں ہوسکتی کیونکہ کوئی نہیں جو سیدھی اور ٹیڑھی راہ میں امتیاز نہ رکھتا ہو، اور پہلی راہ کا خواہشمند نہ ہو۔

(۷) پھر اس کے لیے ایک ایسی سیدھی سادی اور جانی بوجھی ہوئی شناخت بتا دی جس کا اذعان قدرتی طور پر ہر انسان کے اندر موجود ہے، اور جو محض ایک ذہنی تعریف ہونے کی جگہ ایک موجود و مشہود حقیقت نمایاں کر دیتی ہے۔ یعنی وہ راہ جو انعام یافتہ انسانوں کی راہ ہے، کوئی ملک کوئی قوم، کوئی زمانہ کوئی فرد ہو، لیکن انسان ہمیشہ دیکھتا ہے کہ زندگی کی دو راہیں یہاں صاف موجود ہیں، ایک راہ کامیاب انسانوں کی راہ ہے، ایک ناکام انسانوں کی۔ پس ایک

اس کی ابتدا **حمد** کے اعتراف سے ہوتی ہے۔ حمد ثناء جمیل کو کہتے ہیں یعنی اچھی صفتوں کی تعریف کرنے کو۔ ثنا رجمیل اسی کی کی جاسکتی ہے جس میں خوبی و جمال ہو۔ پس حمد کے ساتھ خوف و دہشت کا تصور جمع نہیں ہو سکتا۔ جو ذات محمود ہو گی، وہ خوفناک نہیں ہوسکتی۔

پھر **حمد** کے بعد خدا کی عالمگیر **ربوبیت**، **رحمت** اور **عدالت** کا ذکر کیا ہے۔ اور اس طرح صفاتِ الٰہی کی ایک ایسی مکمل شبیہ کھینچ دی ہے جو انسان کو وہ سب کچھ دے دیتی ہے جس کی انسانیت کے نشوو ارتقا کے لیے ضرورت ہے، اور ان تمام گمراہیوں سے محفوظ کر دیتی ہے جو اس راہ میں اسے پیش آسکتی ہیں۔

(۲) **رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ** میں خدا کی عالمگیر ربوبیت کا اعتراف ہے جو ہر فرد، ہر جماعت، ہر قوم، ہر ملک، ہر گوشۂ وجود کے لیے ہے، اور اس لیے یہ اعتراف ان تمام تنگ نظریوں کا خاتمہ کر دیتا ہے جو دنیا کی مختلف قوموں اور نسلوں میں پیدا ہو گئی تھیں اور ہر قوم اپنی جگہ سمجھنے لگی تھی کہ خدا کی برکتیں اور سعادتیں صرف اسی کے لیے ہیں۔ کسی دوسری قوم کا ان میں حصّہ نہیں۔

(۳) **مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ** میں "الدّین" کا لفظ جزا کے قانون کا اعتراف ہے، اور جزا کو "دین" کے لفظ سے تعبیر کر کے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ جزا انسانی اعمال کے قدرتی نتائج و خواص ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ خدا کا غضب و انتقام بندوں کو عذاب دینا چاہتا ہو، کیونکہ "الدّین" کے معنی بدلہ و مکافات کے ہیں۔

(۲)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ

حمد عربی میں حمد کے معنی ثناء جمیل کے ہیں۔ یعنی اچھی صفتیں بیان کرنے کے۔ اگر کسی کی بری صفتیں بیان کی جائیں، تو یہ حمد نہ ہوگی۔ حمد پر الف لام ہے یہ استغراق کے لیے بھی ہوسکتا ہے، جنس کے لیے بھی۔ پس اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے معنی یہ ہوئے کہ حمد و ثنا میں سے جو کچھ اور جیسا کچھ بھی کہا جا سکتا ہے، وہ سب اللہ کے لیے ہے، کیونکہ خوبیوں اور کمالوں میں سے جو کچھ بھی ہے، سب اسی سے ہے۔ اور اسی میں ہے، اور اگر حسن موجود ہے تو نگاہ عشق کیوں نہ ہو۔ اور اگر محمودیت جلوہ افروز ہے تو زبان حمد و ستائش کیوں خاموش رہے؟

آئینۂ ما روئے ترا عکس پذیر است
گر تو نہ نمائی گنہ از جانب ما نیست

حمد سے سورت کی ابتدا کیوں کی گئی؟ اس لیے کہ معرفتِ الٰہی کی راہ میں انسان کا پہلا تاثر یہی ہے یعنی جب کبھی ایک صادق انسان اس راہ میں قدم اٹھائے گا تو سب سے پہلی حالت جو اس کے فکر و وجدان پر طاری ہوگی، وہ قدرتی طور پر وہی ہوگی جسے یہاں تحمید و ستائش سے تعبیر کیا گیا ہے۔

انسان کے لیے معرفتِ حق کی راہ کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے، صرف ایک ہی راہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ کائناتِ خلقت میں تفکّر و تدبّر کرے۔ مصنوعات کا

واضح اور آشکارا بات کے لیے سب سے بہتر علامت یہی ہو سکتی تھی کہ اس کی طرف انگلی اٹھادی جائے۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا، ایک معلوم بات کو مجہول بنادینا تھا۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس سورت کے لیے دعا کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے، کیونکہ اگر تعلیم وامر کا پیرایہ اختیار کیا جاتا تو اس کی نوعیت کی ساری تاثیر جاتی رہتی دعائیہ اسلوب ہمیں بتاتا ہے کہ سرراست بانہ انسان کی جو خداپرستی کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے، صدائے حال کیا ہوتی ہے اور کیا ہونی چاہیئے؟ یہ گویا خداپرستی کے فکرووجدان کا سرجوش ہے جو ایک طالب صادق کی زبان پر بے اختیار ابل پڑتا ہے۔

بخشش و فیضان کا جتنا بھی اعتراف ہوگا، مصنوع و مخلوق کے لیے نہیں ہوگا صانع و خالق ہی کے لیے ہوگا۔

عبارا تنا شتّٰی و حُسنُك واحدٌ　　　　و کُلٌّ اِلٰی ذاك الجمالِ یشیرُ!

اَللّٰه　نزولِ قرآن سے پہلے عربی میں اللہ کا لفظ خدا کے لیے بطور اسمِ ذات کے مستعمل تھا جیسا کہ شعراءِ جاہلیت کے کلام سے ظاہر ہے۔ یعنی خدا کی تمام صفتیں اس کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔ یہ کسی خاص صفت کے لیے نہیں بولا جاتا تھا۔ قرآن نے بھی یہی لفظ بطور اسمِ ذات کے اختیار کیا اور تمام صفتوں کو اس کی طرف نسبت دی:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ　　　اور اللہ کے لیے حُسن و خوبی کے نام ہیں (یعنی صفتیں) پس چاہیئے کہ اسے ان صفتوں کے ساتھ پکارو!

(۷: ۱۷۹)

قرآن نے یہ لفظ محض اسلئے اختیار کیا کہ لغت کی مطابقت کا مقتضا یہی تھا یا اس سے بھی زیادہ کوئی معنوی موزونیت اس میں پوشیدہ ہے؟

جب ہم اس لفظ کی معنوی دلالت پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے، اس غرض کے لیے سب سے زیادہ موزوں لفظ یہی تھا۔

نوعِ انسانی کے دینی تصوّرات کا ایک قدیم عہد جو تاریخ کی روشنی میں آیا ہے، مظاہر فطرت کی پرستش کا عہد ہے۔ اسی پرستش نے بتدریج اصنام پرستی کی صورت اختیار کی۔ اصنام پرستی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مختلف زبانوں میں بہت سے الفاظ دیوتاؤں کے لیے پیدا ہوگئے، اور جوں جوں پرستش کی نوعیّت میں وسعت ہوتی گئی، الفاظ کا تنوع بھی بڑھتا گیا، لیکن چونکہ یہ بات انسان کی

مطالعہ اسے صانع تک پہنچا دے گا۔ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳: ۱۸۸)

اب فرض کرو ایک طالبِ صادق اس راہ میں قدم اُٹھاتا ہے اور کائناتِ خلقت کے مظاہر و آثار کا مطالعہ کرتا ہے، تو سب سے پہلا اثر جو اس کے دل و دماغ پر طاری ہوگا، وہ کیا ہوگا؟ وہ دیکھے گا کہ خود اس کا وجود اور اس کے وجود سے باہر کی ہر چیز ایک صانعِ حکیم اور مدبّر قدیر کی کارفرمائیوں کی جلوہ گاہ ہے اور اس کی ربوبیت اور رحمت کا ہاتھ ایک ایک ذرّہ خلقت میں صاف نظر آرہا ہے۔ پس قدرتی طور پر اس کی روح جوشِ ستائش اور محویتِ جمال سے معمور ہو جائے گی۔ وہ بے اختیار پکار اُٹھے گا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ! ساری حمد و ستائش اسی کے لیے ہے جو اپنی کارفرمائی کے ہر گوشے میں سرچشمۂ رحمت و فیضان اور معنیٔ حسن و کمال ہے!

اس راہ میں فکرِ انسانی کی سب سے بڑی گمراہی یہ رہی ہے کہ اس کی نظریں مصنوعات کے جلووں میں محو ہو کر رہ جائیں، آگے بڑھنے کی کوشش نہ کریں۔ وہ پردوں کے نقش و نگار کو دیکھ کر بے خود ہو جاتا مگر اس کی جستجو نہ کرتا جس نے اپنے جمالِ صنعت پر یہ دل آویز پردے ڈال رکھے ہیں۔ دنیا میں مظاہرِ فطرت کی پرستش کی بنیاد اسی کوتاہ نظری سے پڑی۔ پس اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کا اعتراف اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ کائناتِ ہستی کا تمام فیضان و جمال خواہ کسی گوشے اور کسی شکل میں ہو، صرف ایک صانعِ حقیقی کی صفتوں ہی کا ظہور ہے۔ اس لیے حسن و جمال کے لیے جتنی بھی شیفتگی ہوگی، خوبی و کمال کے لیے جتنی بھی مدحت طرازی ہوگی

مطلق کی ہستی میں غور و خوض کرے گا، اس کی عقل کی حیرانی اور درماندگی بڑھتی ہی جائے گی۔ یہاں تک کہ وہ معلوم کرلے گا کہ اس کی راہ کی ابتدا بھی عجز و حیرت سے ہوتی ہے، اور انتہا بھی عجز و حیرت ہی ہے۔!

اے بروں از وہم و قال و قیلِ من	خاک بر فرقِ من و تمثیلِ من!

اب غور کرو، خدا کی ذات کے لیے انسان کی زبان سے نکلے ہوئے لفظوں میں، اس سے زیادہ موزوں لفظ اور کونسا ہو سکتا ہے؟ اگر خدا کو اس کی صفتوں سے پکارتا ہے، تو بلا شبہ اس کی صفتیں بے شمار ہیں، لیکن اگر صفات سے الگ ہو کر اس کی ذات کی طرف اشارہ کرتا ہے، تو وہ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ایک متحیّر کر دینے والی ذات ہے، اور جو کچھ اس کی نسبت کہا جا سکتا ہے، وہ عجز و درماندگی کے اعتراف کے سوا کچھ نہیں ہے۔ فرض کرو، نوعِ انسانی نے اس وقت تک خدا کی ہستی یا خلقتِ کائنات کی اصلیت کے بارے میں جو کچھ سوچا اور سمجھا ہے، وہ سب کچھ سامنے رکھ کر ہم ایک موزوں سے موزوں لفظ تجویز کرنا چاہیں تو وہ کیا ہوگا؟ اس سے زیادہ اور اس سے بہتر کوئی لفظ تجویز کیا جا سکتا ہے؟

یہی وجہ ہے کہ جب کبھی اس راہ میں عرفان و بصیرت کی کوئی بڑی سے بڑی بات کہی گئی، وہ یہی تھی کہ زیادہ سے زیادہ خود رفتگیوں کا اعتراف کیا گیا، اور ادراک کا منتہٰی مرتبہ یہی قرار پایا کہ ادراک کی نارسائی کا ادراک حاصل ہو جائے۔ عُرفا کے دل و زبان کی صدا ہمیشہ یہی رہی کہ رب زدنی فیک تحیّراً[1]

---

[1] یعنی خدایا، ایسا کر کہ تیری ہستی میں ہمارا تحیّر بڑھتا رہے" کیونکہ یہاں تحیّر جہل کا نہیں بلکہ معرفت کا نتیجہ ہے ۱۲

فطرت کے خلاف تھی کہ ایک ایسی ہستی کے تصوّر سے خالی الذہن رہے جو سب سے اعلیٰ اور سب کی پیدا کرنے والی ہستی ہو، اس لیے دیوتاؤں کی پرستش کے ساتھ ایک سب سے بڑی اور سب پر حکمران ہستی کا تصوّر بھی کم و بیش ہمیشہ موجود رہا، اور اس لیے جہاں اور بے شمار الفاظ دیوتاؤں اور ان کی معبودانہ صفتوں کے لیے پیدا ہو گئے، وہاں کوئی نہ کوئی لفظ ایسا بھی ضرور مستعمل رہا جس کے ذریعے اس ان دیکھی اور اعلیٰ ترین ہستی کی طرف اشارہ کیا جاتا تھا۔

چنانچہ سامی زبانوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف و اصوات کی ایک خاص ترکیب ہے جو معبودیت کے معنی میں مستعمل رہی ہے۔ اور عبرانی، سریانی آرامی، کلدانی، حمیری، عربی وغیرہ تمام زبانوں میں اس کا یہ لغوی خاصہ پایا جاتا ہے۔ یہ الف، لام اور ہ کا مادّہ ہے، اور مختلف شکلوں میں مشتق ہوا ہے کلدانی و سریانی کا "الاہیا" عبرانی کا "الوہ" اور عربی کا "اِلٰہ" اسی سے ہے، اور بلاشبہ یہی "اِلٰہ" ہے جو حرفِ تعریف کے اضافہ کے بعد اللہ ہو گیا ہے، اور تعریف نے اسے صرف خالقِ کائنات کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔

لیکن اگر اللہ "اِلٰہ" سے ہے تو اِلٰہ کے معنی کیا ہیں؟ علماءِ لغت و اشتقاق کے مختلف اقوال ہیں۔ مگر سب سے زیادہ قوی قول یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل "الہ" ہے اور "الہ" کے معنی تحیّر اور درماندگی کے ہیں۔ بعضوں نے اسے "ولہ" سے ماخوذ بتایا ہے اور اس کے معنی بھی یہی ہیں۔ پس خالقِ کائنات کے لیے یہ لفظ اس لیے اسم قرار پایا کہ اس بارے میں انسان جو کچھ جانتا اور جان سکتا ہے، وہ عقل کے تحیّر اور ادراک کی درماندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے وہ جس قدر بھی اس ذاتِ

(۳)

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

رُبُوبیّت

حمد کے بعد بالترتیب چار صفتیں بیان کی گئی ہیں: ربّ العٰلمین، الرّحمٰن الرّحیم، مٰلِکِ یَوْمِ الدِّین[1] چونکہ الرّحمٰن اور الرّحیم کا تعلق ایک ہی صفت کے دو مختلف پہلوؤں سے ہے، اس لیے دوسرے لفظوں میں انھیں یوں تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ ربوبیت، رحمت، عدالت، تین صفتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

"اِلٰہ" کی طرح "ربّ" بھی سامی زبانوں کا ایک کثیر الاستعمال مادہ ہے۔ عبرانی، سریانی اور عربی تینوں زبانوں میں اس کے معنی پالنے کے ہیں، اور چونکہ پرورش کی ضرورت کا احساس انسانی زندگی کے بنیادی احساسات میں سے ہے اس لیے اسے بھی قدیم ترین سامی تعبیرات میں سے سمجھنا چاہیئے۔ پھر چونکہ معلّم، اُستاد اور آقا کسی نہ کسی اعتبار سے پرورش کرنے والے ہی ہوتے ہیں، اس لیے اس کا اطلاق ان معنوں میں بھی ہونے لگا۔ چنانچہ عبرانی اور آرامی کا "ربی" اور "رباہ" پرورش کنندہ، معلّم اور آقا تینوں معنی رکھتا تھا اور قدیم مصری اور خالدی زبان کا ایک لفظ "رابو" بھی انہی معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ اور ان ملکوں

---

[1] مفرداتِ راغب اصفہانی ۱۲

اور حکماء کی حکمت و دانش کا فیصلہ بھی ہمیشہ یہی ہوا کہ :

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد!

چونکہ یہ اسم خدا کے لیے بطور اسمِ ذات کے استعمال میں آیا، اس لیے قدرتی طور پر ان تمام صفتوں پر حاوی ہو گیا جن کا خدا کی ذات کے لیے تصوّر کیا جا سکتا ہے اگر ہم خدا کا تصوّر اس کی کسی صفت کے ساتھ کریں، مثلاً الرّبّ یا الرّحِیم کہیں تو یہ تصوّر صرف ایک خاص صفت ہی میں محدود ہو گا۔ یعنی ہمارے ذہن میں ایک ایسی ہستی کا تصوّر پیدا ہو جائے گا جس میں ربوبیت یا رحمت ہے۔ لیکن جب ہم اللہ کا لفظ بولتے ہیں تو فوراً ہمارا ذہن ایک ایسی ہستی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو ان تمام صفاتِ حُسن و کمال سے متّصف ہے جو اس کی نسبت بیان کیے گئے ہیں، اور جو اس میں ہونے چاہئیں۔

وقت تک جاری رہنا چاہیئے جب تک بچہ اپنے جسم و ذہن کی حدِّ بلوغ تک نہ پہنچ جائے۔ پھر پرورش کی ضرورتیں، ایک دو نہیں بے شمار ہیں۔ ان کی نوعیت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ اور ضروری ہے کہ ہر عمر اور ہر حالت کے مطابق محبّت کا جوش، نگرانی کی نگاہ، اور زندگی کا سروسامان ملتا رہے۔ حکمتِ الٰہی نے ماں کی محبت میں ربوبیت کے یہ تمام خدوخال پیدا کر دیے ہیں۔ یہ ماں کی ربوبیت ہے جو پیدائش کے دن سے لے کر بلوغ تک، بچّہ کو پالتی، بچاتی، سنبھالتی اور ہر وقت اور ہر حالت کے مطابق اس کی ضروریاتِ پرورش کا سروسامان مہیّا کرتی رہتی ہے۔

جب بچّے کا معدہ دودھ کے سوا کسی غذا کا متحمّل نہ تھا تو اسے دودھ ہی پلایا جاتا تھا۔ جب دودھ سے زیادہ قوی غذا کی ضرورت ہوئی تو ویسی ہی غذا دی جانے لگی۔ جب اس کے پاؤں میں کھڑے ہونے کی سکت نہ تھی تو ماں اسے گود میں اٹھائے پھرتی تھی۔ جب کھڑے ہونے کے قابل ہُوا تو اُنگلی پکڑلی اور ایک ایک قدم چلانے لگی۔ پس یہ بات کہ ہر حالت اور ضرورت کے مطابق ضروریات مہیّا ہوتی رہیں۔ اور نگرانی و حفاظت کا ایک مسلسل اہتمام جاری رہا۔ یہ وہ صورتِ حال ہے جس سے ربوبیّت کے مفہوم کا تصوّر کیا جا سکتا ہے۔

مجازی ربوبیت کی یہ ناقص اور محدود مثال سامنے لاؤ، اور ربوبیت الٰہی کی غیر محدود حقیقت کا تصوّر کرو۔ اس کے رَبُّ الْعٰلَمِیْن ہونے کے معنی یہ ہوئے کہ جس طرح اس کی خالقیّت نے کائنات ہستی اور اس کی ہر چیز پیدا کی ہے، اسی طرح اس کی ربوبیّت نے ہر مخلوق کی پرورش کا سروسامان بھی کر دیا ہے۔

کی قدیم ترین سامی وحدت کی خبر دیتا ہے۔

بہرحال عربی میں "ربوبیت" کے معنی پالنے کے ہیں، لیکن پالنے کو اس کے وسیع اور کامل معنوں میں لینا چاہیئے۔ اسی لیے بعض ائمۂ لغت نے اس کی تعریف اِن لفظوں میں کی ہے: ھو انشاء الشیئ حالاً فحالاً الی حد التمام۔[1]
یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے، اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق اس طرح نشو ونما دیتے رہنا کہ اپنی حدِ کمال تک پہنچ جائے۔ اگر ایک شخص بھوکے کو کھانا کھلا دے، یا محتاج کو روپیہ دے دے تو یہ اس کا کرم ہوگا، جود ہوگا، احسان ہوگا، لیکن وہ بات نہ ہوگی جسے ربوبیت کہتے ہیں۔ ربوبیت کے لیے ضروری ہے کہ پرورش اور نگہداشت کا ایک جاری اور مسلسل اہتمام ہو، اور ایک وجود کو اس کی تکمیل وبلوغ کے لیے وقتاً فوقتاً جیسی کچھ ضرورتیں پیش آتی رہیں، ان سب کا سر وسامان ہوتا رہے۔ نیز ضروری ہے کہ یہ سب کچھ محبّت وشفقت کے ساتھ ہو۔ کیونکہ جو عمل محبّت وشفقت کے عاطفہ سے خالی ہوگا، ربوبیت نہیں ہو سکتا۔

رُبوبیت کا ایک ناقص نمونہ ہم اس پرورش میں دیکھ سکتے ہیں جس کا جوش ماں کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو محض گوشت پوست کا ایک متحرک لوتھڑا ہوتا ہے، اور زندگی اور نمو کی جتنی قوتیں بھی رکھتا ہے سب کی سب پرورش وتربیت کی محتاج ہوتی ہیں۔ یہ پرورش محبت وشفقت، حفاظت ونگہداشت اور بخشش واعانت کا ایک طول طویل سلسلہ ہے۔ اور اسے اس

---

[1] مفرداتِ راغب اصفہانی ۱۲

وَفِي الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۙ وَ فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (۵۱ : ۲۰، ۲۱)

ان لوگوں کے لیے جو (سچائی پر) یقین رکھنے والے ہیں، زمین میں (خدا کی کارفرمائیوں کی) کتنی ہی نشانیاں ہیں اور خود تمہارے وجود میں بھی۔ پھر کیا تم دیکھتے نہیں؟

نظامِ رُبُوبیّت

لیکن سامانِ زندگی کی بخشائش میں اور ربوبیت کے عمل میں جو فرق ہے، اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر دنیا میں ایسے عناصر، عناصر کی ایسی ترکیب اور اشیا کی ایسی بناوٹ موجود ہے، جو زندگی اور نشوونما کے لیے سودمند ہے، تو محض اس کی موجودگی ربوبیت سے تعبیر نہیں کی جاسکتی۔ ایسا ہونا قدرتِ الٰہی کی رحمت ہے، بخشش ہے، احسان ہے، مگر وہ بات نہیں جسے ربوبیت کہتے ہیں۔ ربوبیت یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں دنیا میں سودمند اشیا کی موجودگی کے ساتھ ان کی بخشش و تقسیم کا بھی ایک نظام موجود ہے اور فطرت صرف بخشتی ہی نہیں، بلکہ جو کچھ بخشتی ہے، ایک مقررہ انتظام اور ایک منضبط ترتیب و مناسبت کے ساتھ بخشتی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہم دیکھتے ہیں، ہر وجود کو زندگی اور بقا کے لیے جس جس چیز کی ضرورت تھی، اور جس جس وقت، اور جیسی جیسی مقدار میں ضرورت تھی، ٹھیک ٹھیک اسی طرح، انہی وقتوں میں اور اسی مقدار میں اسے مل رہی ہے، اور اس نظم و انضباط سے تمام کارخانۂ حیات چل رہا ہے۔

پانی کی بخشش و تقسیم کا نظم

زندگی کے لیے پانی اور رطوبت کی ضرورت ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ پانی کے وافر ذخیرے ہر طرف موجود ہیں، لیکن اگر صرف اتنا ہی ہوتا، تو یہ زندگی کے لیے کافی نہ تھا، کیونکہ زندگی کے لیے صرف یہی ضروری نہیں کہ پانی موجود

اور یہ پرورش کا سامان ایک ایسے عجیب و غریب نظام کے ساتھ ہے کہ ہر وجود کو زندگی اور بقا کے لیے جو کچھ مطلوب تھا، وہ سب کچھ مل رہا ہے۔ اور اس طرح مل رہا ہے کہ ہر حالت کی رعایت ہے، ہر ضرورت کا لحاظ ہے، ہر تبدیلی کی نگرانی ہے۔ اور ہر کمی بیشی ضبط میں آچکی ہے۔ چیونٹی اپنے بل میں رینگ رہی ہے، کیڑے مکوڑے کوڑے کرکٹ میں ملے ہوئے ہیں، مچھلیاں دریا میں تیر رہی ہیں، پرند ہوا میں اُڑ رہے ہیں، پھول باغ میں کھل رہے ہیں، ہاتھی جنگل میں دوڑ رہا ہے اور ستارے فضا میں گردش کر رہے ہیں۔ لیکن فطرت کے پاس سب کے لیے یکساں طور پر پرورش کی گود اور نگرانی کی آنکھ ہے، اور کوئی نہیں جو فیضانِ ربوبیت سے محروم ہو۔ اگر مثالوں کی جستجو میں تھوڑی سی کاوش جائز رکھی جائے تو مخلوقات کی بے شمار قسمیں ایسی ملیں گی جو اتنی حقیر اور بے مقدار ہیں کہ غیر مسلّح آنکھ[1] سے ہم انھیں دیکھ بھی نہیں سکتے۔ تاہم ربوبیت الٰہی نے جس طرح اور جس نظام کے ساتھ ہاتھی جیسی جسیم اور انسان جیسی عقیل مخلوق کے لیے سامانِ پرورش مہیّا کر دیا ہے، ٹھیک اسی طرح اور ویسے ہی نظام کے ساتھ ان کے لیے بھی زندگی اور بقا کی ہر چیز مہیّا کی ہے اور پھر یہ جو کچھ بھی ہے، انسان کے وجود سے باہر ہے۔ اگر انسان اپنے وجود کو دیکھے، تو خود اس کی زندگی اور زندگی کا ہر لمحہ ربوبیتِ الٰہی کی کرشمہ سازیوں کی ایک پوری کائنات ہے!

---

[1] NAKED EYE غیر مسلّح آنکھ یعنی ایسی آنکھ جو اپنی قدرتی نگاہ سے دیکھ رہی ہو، زیادہ قوّت کے ساتھ دیکھنے کا کوئی آلہ مثلاً خوردبین اس کے ساتھ نہ ہو۔

اندازے کے ساتھ بخشتی ہے اور یہ اندازہ ایک خاص قانون کے ماتحت ٹھہرایا ہوا ہے

وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَعْلُومٍ (۱۵: ۲۱)	اور کوئی شے نہیں جس کے ہمارے پاس ذخیرے موجود نہ ہوں لیکن ہمارا طریق کار یہ ہے کہ جو کچھ نازل کرتے ہیں ایک مقررہ مقدار میں نازل کرتے ہیں
وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ (۱۳: ۸)	اور اللہ کے نزدیک ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر ہے۔
إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ (۵۴: ۴۹)	ہم نے جتنی چیزیں بھی پیدا کی ہیں، ایک اندازے کے ساتھ پیدا کی ہیں۔

یہ کیا بات ہے کہ دنیا میں صرف یہی نہیں ہے کہ پانی موجود ہے بلکہ ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ موجود ہے؟ یہ کیوں ہے کہ پہلے سورج کی شعاعیں، سمندر سے ڈول بھر بھر کر فضا میں پانی کی چادریں بچھا دیں، پھر ہواؤں کے جھونکے انھیں حرکت میں لائیں، اور پانی کی بوندیں بنا کر ایک خاص وقت اور خاص محل میں برسا دیں؟ پھر یہ کیوں ہے کہ جب کبھی پانی برسے تو ایک خاص ترتیب اور مقدار ہی سے برسے، اور اس طرح برسے کہ زمین کی بالائی سطح پر اس کی ایک خاص مقدار بہنے لگے۔ اور اندرونی حصّوں تک ایک خاص مقدار میں نمی پہنچے؟ کیوں ایسا ہوا کہ پہلے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کے تودے جمتے ہیں، پھر موسم کی تبدیلی سے پگھلنے لگتے ہیں، پھر ان کے پگھلنے سے پانی کے سرچشمے اُبلنے لگتے ہیں، پھر چشموں سے دریا کی جدولیں بہنے لگتی ہیں، پھر یہ جدولیں پیچ و خم کھاتی ہوئی

بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ایک خاص انتظام، ایک خاص ترتیب، اور ایک خاص مقرّرہ مقدار کے ساتھ موجود ہو۔ پس یہ جو دنیا میں پانی کے بننے اور تقسیم ہونے کا ایک خاص انتظام پایا جاتا ہے، اور فطرت صرف پانی بناتی ہی نہیں، بلکہ ایک خاص ترتیب و مناسبت کے ساتھ بناتی اور ایک خاص اندازہ کے ساتھ بانٹتی رہتی ہے، تو یہی ربوبیت ہے، اور اسی سے ربوبیّت کے تمام اعمال کا تصوّر کرنا چاہیئے۔

قرآن کہتا ہے، یہ اللہ کی رحمت ہے جس نے پانی جیسا جوہرِ حیات پیدا کر دیا، لیکن یہ اس کی ربوبیت ہے جو پانی کو ایک ایک بوند کر کے ٹپکاتی، زمین کے ایک ایک گوشے تک پہنچاتی، ایک خاص مقدار اور حالت میں تقسیم کرتی، ایک خاص موسم اور محل میں برساتی، اور پھر زمین کے ایک ایک تشنہ ذرّے کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر سیراب کر دیتی ہے!

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً	اور دیکھو! ہم نے آسمان سے ایک خاص
بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ	اندازے کے ساتھ پانی برسایا۔ پھر اسے زمین
وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ	میں ٹھہرائے رکھا اور ہم اس پر بھی قادر ہیں
فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ	کہ جس طرح برسایا تھا اسی طرح اُسے
اَعْنَابٍ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ	واپس لے جائیں، (پھر دیکھو) اسی پانی سے ہم
وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ (۲۳: ۱۸-۱۹)	نے کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا

کر دیئے جن میں بے شمار پھل لگتے ہیں۔ اور انہی سے تم اپنی غذا بھی حاصل کرتے ہو۔

تقدیرِ اشیاء یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جابجا اشیاء کے قدر اور مقدار کا ذکر کیا ہے یعنی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ فطرت کائنات جو کچھ بنتی ہے، ایک خاص

اور مفاہمت پائی جاتی ہے۔ ہوا سب سے زیادہ ضروری تھی، کیونکہ پانی اور غذا کے بغیر کچھ عرصہ تک زندگی ممکن ہے مگر ہوا کے بغیر ممکن نہیں۔ پس اس کا سامان اتنا وافر اور عام ہے کہ کوئی جگہ، کوئی گوشہ، کوئی وقت نہیں جو اس سے خالی ہو۔ فضا میں ہوا کا بے حد و کنار سمندر پھیلا ہوا ہے۔ جب کبھی اور جہاں کہیں سانس لو، زندگی کا یہ سب سے زیادہ ضروری جوہر تمھارے لیے خود بخود مہیا ہو جائے گا۔ ہوا کے بعد دوسرے درجے پر پانی ہے: وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ، اس لیے اس کی بخشائش کی فراوانی و عمومیت ہوا سے کم مگر ہر چیز سے زیادہ ہے۔ زمین کے نیچے آبِ شیریں کی سوتیں بہہ رہی ہیں۔ زمین کے اوپر بھی ہر طرف دریا رواں ہیں، پھر ان دونوں ذخیروں کے علاوہ فضائے آسمانی کا بھی کارخانہ ہے جو شب و روز سرگرمِ کار رہتا ہے، وہ سمندر کا شوراب کھینچتا ہے، اسے صاف و شیریں بنا کر جمع کرتا رہتا ہے۔ پھر حسبِ ضرورت زمین کے حوالے کر دیتا ہے، پانی کے بعد غذا کی ضرورت تھی۔ لہذا ہوا اور پانی سے کم، مگر اور تمام چیزوں سے زیادہ اس کا دسترخوانِ کرم بھی خشکی اور تری میں بچھا ہوا ہے اور کوئی مخلوق نہیں جس کے گرد و پیش اس کی غذا کا ذخیرہ موجود نہ ہو۔

نظامِ پرورش پھر سامانِ پرورش کے اس عالمگیر نظام پر غور کرو، جو اپنے ہر گوشۂ عمل میں پروردگی کی گود اور بخششِ حیات کا سرچشمہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ تمام کارخانہ صرف اسی لیے بنا ہے کہ زندگی بخشے اور زندگی کی ہر استعداد کی رکھوالی کرے۔ سورج اس لیے ہے کہ روشنی کے لیے چراغ کا اور گرمی کے لیے تنور کا کام دے اور اپنی کرنوں کے ڈول بھر بھر کر سمندر سے پانی کھینچتا رہے۔ ہوائیں اس لیے

دور دور تک دوڑ جاتی ہیں، اور سینکڑوں ہزاروں میلوں تک اپنی وادیاں شاداب کر دیتی ہیں؟

کیوں یہ سب کچھ ایسا ہی ہوا؟ کیوں ایسا نہ ہوا کہ پانی موجود ہوتا مگر اس انتظام اور ترتیب کے ساتھ نہ ہوتا؟

قرآن کہتا ہے: اس لیے کہ کائناتِ ہستی میں ربوبیّتِ الٰہی کارفرما ہے اور ربوبیت کا مقتضا یہی تھا کہ پانی اسی ترتیب سے بنے اور اسی ترتیب و مقدار سے تقسیم ہو۔ یہ رحمت و حکمت تھی جس نے پانی پیدا کیا۔ مگر یہ ربوبیت ہے جو اسے اس طرح کام میں لائی کہ پرورش اور رکھوالی کی تمام ضرورتیں پوری ہو گئیں

اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ	یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ پہلے ہوائیں چلتی
فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ	ہیں، پھر ہوائیں بادلوں کو چھیڑ کر حرکت میں
فِی السَّمَآءِ کَیْفَ یَشَآءُ وَ	میں لاتی ہیں، پھر وہ جس طرح چاہتا ہے،
یَجْعَلُهٗ کِسَفًا فَتَرَی الْوَدْقَ	انھیں فضا میں پھیلا دیتا ہے، اور انھیں
یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ	ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے، پھر تم دیکھتے
اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ	ہو کہ بادلوں میں سے مینہ نکل رہا ہے۔ پھر
عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ	جن لوگوں کو بارش کی یہ برکت ملنی تھی مل چکتی
(۳۰ : ۴۸)	ہے تو وہ اچانک خوش وقت ہو جاتے ہیں۔

عناصرِ حیات پھر اس حقیقت پر بھی غور کرو کہ زندگی کے لیے جن چیزوں کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، انھی کی بخشائش سب سے زیادہ اور عام ہے اور جن کی ضرورت خاص خاص حالتوں اور گوشوں کے لیے تھی، انھی میں اختصاص

شاداب اور عطر بیز پھول سے کتنا ہی مختلف دکھائی دے، لیکن دونوں کی پرورش کے اصول و احوال پر نظر ڈالو گے تو صاف نظر آ جائے گا کہ دونوں کو ایک ہی طریقہ سے سامانِ پرورش مِلا ہے اور دونوں ایک ہی طرح پالے پوسے جا رہے ہیں۔ انسان کا بچّہ اور درخت کا پودا تمھاری نظروں میں کتنی بے جوڑ چیزیں ہیں؟ لیکن اگر ان کی نشو و نما کے طریقوں کا کھوج لگاؤ گے تو دیکھ لو گے کہ قانونِ پرورش کی یکسانیت نے دونوں کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر دیا ہے۔ پتھر کی چٹان ہو، یا پھول کی کلی، انسان کا بچّہ ہو یا چیونٹی کا انڈا، سب کے لیے پیدائش ہے۔ اور قبل اس کے کہ پیدائش ظہور میں آئے، سامان پرورش مہیا ہو جاتا ہے۔ پھر طفولیّت کا دور ہے، اور اس دور کی ضروریات ہیں۔ انسان کا بچّہ بھی اپنی طفولیت رکھتا ہے۔ درخت کے مولودِ نباتی کے لیے بھی طفولیت ہے، اور تمھاری چشمِ ظاہر بین کے لیے کتنا ہی عجیب کیوں نہ ہو، لیکن پتّھر کی چٹان اور مٹّی کا تودہ بھی اپنی اپنی طفولیت رکھتا ہے۔ پھر طفولیت رُشد و بلوغ کی طرف بڑھتی ہے اور جوں جوں بڑھتی جاتی ہے، اس کی روز افزوں حالت کے مطابق یکے بعد دیگرے سامانِ پرورش میں بھی تبدیلیاں ہوتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ہر وجود اپنے سنِ کمال تک پہنچ جاتا ہے۔ اور جب سنِ کمال تک پہنچ گیا تو از سرِ نو ضعف و انحطاط کا دور شروع ہو جاتا ہے، پھر اس ضعف و انحطاط کا خاتمہ بھی سب کے لیے ایک ہی طرح ہے، کسی دائرے میں اسے مر جانا کہتے ہیں، کسی میں مُرجھا جانا، اور کسی میں پامال ہو جانا۔ الفاظ متعدّد ہو گئے، مگر حقیقت میں تعدّد نہیں ہوا۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ ضُعْفٍ — یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ اس نے تمھیں

ہیں کہ اپنی سردی اور گرمی سے مطلوبہ اثرات پیدا کرتی رہیں، اور کبھی پانی کے ذرات جما کر ابر کی چادریں بچھا دیں، کبھی ابر کو پانی بنا کر بارش بنا دیں۔ زمین اس لیے ہے کہ نشوونما کے خزانوں سے ہمیشہ معمور رہے، اور ہر دانے کے لیے اپنی گود میں زندگی اور ہر پودے کے لیے اپنے سینہ میں پرورد گی رکھے۔ مختصر یہ کہ کارخانۂ ہستی کا ہر گوشہ صرف اسی کام میں لگا ہوا ہے کہ ہر قوت استعداد ڈھونڈھ رہی ہے اور ہر تاثیر اثر پذیری کے انتظار میں ہے۔ جونہی کسی وجود میں بڑھنے اور نشوونما پانے کی استعداد پیدا ہوتی ہے، معاً تمام کارخانۂ ہستی اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ سورج کی تمام کارفرمائیاں، فضا کے تمام تغیرات، زمین کی تمام قوتیں، عناصر کی تمام سرگرمیاں، صرف اس انتظار میں رہتی ہیں کہ کب چیونٹی کے انڈے سے ایک بچہ ہوتا ہے، اور کب دہقان کی جھولی سے زمین پر ایک دانہ گرتا ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ	اور آسمان و زمین میں جو کچھ بھی ہے،
وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ	سب کو اللہ نے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔ بلاشبہ ان لوگوں کے لیے جو غور و
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ	فکر کرنے والے ہیں، اس بات میں
يَّتَفَكَّرُوْنَ (۴۵: ۱۳)	(معرفتِ حقیقت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں

نظامِ ربوبیت کی وحدت

سب سے زیادہ عجیب مگر سب سے زیادہ نمایاں حقیقت نظامِ ربوبیت کی یکسانیت اور ہم آہنگی ہے۔ یعنی ہر وجود کی پرورش کا سروسامان جس طرح اور جس اسلوب پر کیا گیا ہے، وہ ہر گوشے میں ایک ہی ہے، اور ایک ہی اصل و قاعدہ رکھتا ہے۔ پتھر کا ایک ٹکڑا انھیں گلاب کے

وہ پیدا ہوتا ہے، اس کی غذا اپنی ساری خاصیتوں، مناسبتوں، اور شرطوں کے ساتھ خود بخود مہیا ہو جاتی ہے اور ایسی جگہ مہیا ہوتی ہے جو حالتِ طفولیت میں اس کے لیے سب سے قریب تر اور سب سے موزوں جگہ ہے۔ ماں بچے کو جوشِ محبت میں سینے سے لگا لیتی ہے، اور وہیں اس کی غذا کا سرچشمہ بھی موجود ہوتا ہے! پھر دیکھو، اس غذا کی نوعیت اور مزاج میں اس کی حالت کا درجہ بدرجہ کس قدر لحاظ رکھا گیا ہے؟ اور کس طرح یکے بعد دیگرے اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے؟ ابتدا میں بچے کا معدہ اتنا کمزور ہوتا ہے کہ اسے بہت ہی ہلکے قوام کا دودھ ملنا چاہیے۔ چنانچہ نہ صرف انسان بلکہ تمام حیوانات میں ماں کا دودھ بہت ہی پتلے قوام کا ہوتا ہے، لیکن جوں جوں بچے کی عمر بڑھتی جاتی ہے اور معدہ قوی ہوتا جاتا ہے دودھ کا قوام بھی بدلتا جاتا ہے اور مائیت کے مقابلہ میں دہنیت بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ بچے کا عہد رضاعت پورا ہو جاتا ہے، اور اس کا معدہ عام غذاؤں کے ہضم کرنے کی استعداد پیدا کر لیتا ہے۔ جوں ہی اس کا وقت آتا ہے، ماں کا دودھ خشک ہونا شروع ہو جاتا ہے، یہ گویا ربوبیتِ الٰہی کا اشارہ ہوتا ہے کہ اب اس کے لیے دودھ کی ضرورت نہیں رہی، ہر طرح کی غذائیں استعمال کر سکتا ہے:

وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا (۴۶ : ۱۵)	اور حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت (کم از کم) تیس مہینوں کی ہے۔

پھر ربوبیتِ الٰہی کی اس کارسازی پر غور کرو کہ کس طرح ماں کی فطرت میں بچے کی محبت ودیعت کر دی گئی ہے، اور کس طرح اس جذبے کو طبیعتِ بشری کے تمام جذبات میں سب سے زیادہ پُرجوش اور سب سے زیادہ ناقابلِ تسخیر بنا دیا گیا

ثُمَّ جَعَلَ مِنۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً	یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ اس نے تمھیں
ثُمَّ جَعَلَ مِنۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا	اس طرح پیدا کیا کہ پہلے ناتوانی کی حالت
وَّشَيْبَةً ۚ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ	ہوتی ہے، پھر ناتوانی کے بعد قوت آتی ہے
وَهُوَ الْعَلِيْمُ	پھر قوت کے بعد دوبارہ ناتوانی اور بڑھاپا ہوتا
الْقَدِيْرُ	ہے۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ وہ علم
(۳۰: ۵۴)	اور قدرت رکھنے والا ہے

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ	کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان
مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ	سے پانی برسایا، پھر زمین میں اس کے
يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ	چشمے رواں ہو گئے، پھر اسی پانی سے
يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا	رنگ برنگ کی کھیتیاں لہلہا اٹھیں،
اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ	پھر ان کی نشوونما میں ترقی ہوئی اور پوری
مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ	طرح پک کر تیار ہو گئیں، (پھر ترقی کے بعد زوال
حُطَامًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ	طاری ہوا اور) تم دیکھتے ہو کہ ان پر زردی
لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ۝	چھا گئی، پھر بالآخر خشک ہو کر چورا چورا ہو گئیں۔ بلاشبہ
(۳۹: ۲۱)	دانشمندوں کے لیے اس صورتِ حال میں بڑی ہی عبرت ہے

جہاں تک حیوانات کا تعلق ہے، ایک قسم ان جانوروں کی ہے جن کے بچے دودھ سے پرورش پاتے ہیں اور ایک ان کی ہے جو عام غذاؤں سے پرورش پاتے ہیں۔ غور کرو، نظامِ ربوبیت نے دونوں کی پرورش کے لیے کیسا عجیب سروسامان مہیا کر دیا ہے۔ دودھ سے پرورش پانے والے حیوانات میں انسان بھی داخل ہے۔ سب سے پہلے انسان اپنی ہی ہستی کا مطالعہ کرے، جونہی

یہ نظامِ ربوبیت کی کارفرمائی ہے اور اس کا مقتضیٰ بھی تھا۔ ربوبیت چاہتی ہے کہ بچے کی پرورش ہو۔ اس لئے پرورش کا ذریعہ ماں کے جذبۂ محبّت میں رکھ دیا تھا۔ جب بچے کی عمر اس حد تک پہنچ گئی کہ ماں کی پرورش کی احتیاج باقی نہ رہی تو اس ذریعے کی ضرورت بھی باقی نہ رہی۔ اس کا باقی رہنا ماں کیلئے بوجھ اور بچے کیلئے رکاوٹ ہوتا۔ بچّے کی احتیاج کا سب سے زیادہ نازک وقت اس کی نئی نئی طفولیت تھی۔ اس لیے ماں کی محبّت میں بھی سب سے زیادہ جوش اسی وقت تھا۔ پھر جوں جوں بچّہ بڑھتا گیا، احتیاج کم ہوتی گئی؛ اس لیے محبت کی گرمجوشیاں بھی گھٹتی گئیں فطرت نے محبّتِ مادری کا دامن بچّے کی احتیاجِ پرورش سے باندھ دیا تھا۔ جب احتیاج زیادہ تھی تو محبت کی سرگرمی بھی زیادہ تھی۔ جب احتیاج کم ہوگئی تو محبت بھی تغافل کرنے لگی۔[۱]

جن حیوانات کے بچّے انڈوں سے پیدا ہوتے ہیں، ان کی جسمانی ساخت اور طبیعت دودھ والے حیوانات سے مختلف ہوتی ہے: اس لیے وہ اوّل دن ہی سے معمولی غذائیں کھا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ کھلانے کے لیے کوئی شفیق

---

[۱] انسان میں ماں کی محبّت بلوغ کے بعد بھی بدستور باقی رہتی ہے، اور بعض حالتوں میں اس کے انفعالات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ عہدِ طفولیت کی محبت میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن یہ صورتِ حال غالباً انسان کی مدنی و عقلی زندگی کے نشوونما کا نتیجہ ہے، نہ کہ فطرتِ حیوانی کا۔ ابتدائی انسان میں بھی یہ علاقہ فطرۃً اسی حد تک ہوگا کہ بچّہ سنِ تمیز تک پہنچ جائے۔ لیکن بعد کو نسل و خاندان کی تشکیل اور اجتماعی احساسات کی ترقی سے مادی رشتہ ایک دائمی رشتہ بن گیا ۱۲

ہے؟ دنیا کی کونسی قوت ہے جو اس جوش کا مقابلہ کر سکتی ہے جسے ماں کی مامتا کہتے ہیں ؟ جس بچے کی پیدائش اس کے لیے زندگی کی سب سے بڑی مصیبت تھی:

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَّ — اس کی ماں نے اسے تکلیف کے ساتھ

وَضَعَتْهُ كُرْهًا (۴۶: ۱۵) — پیٹ میں رکھا۔ اور تکلیف کے ساتھ جنا

اسی کی محبت اس کے اندر زندگی کا سب سے بڑا جذبہ مشتعل کر دیتی ہے جب تک بچہ سنِ بلوغ تک نہیں پہنچ جاتا، وہ اپنے لیے نہیں بلکہ بچے کے لیے زندہ رہنا چاہتی ہے۔ زندگی کی کوئی خود فراموشی نہیں جو اس پر طاری نہ ہوتی ہو، اور راحت و آسائش کی کوئی قربانی نہیں جس سے اسے گریز ہو۔ حبِ ذات جو فطرتِ انسانی کا سب سے زیادہ طاقتور جذبہ ہے اور جس کے انفعالات کے بغیر کوئی مخلوق زندہ نہیں رہ سکتی وہ بھی اس جذبۂ خود فراموشی کے مقابلہ میں مضمحل ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ بات کہ ایک ماں نے بچے کے مجنونانہ عشق میں اپنی زندگی قربان کر دی، فطرتِ مادری کا ایک ایسا معمولی واقعہ ہے جو ہمیشہ پیش آتا رہتا ہے۔ اور ہم اس میں کسی طرح کی غرابت محسوس نہیں کرتے۔

لیکن پھر دیکھو، کارسازِ فطرت کی یہ کیسی کرشمہ سازی ہے کہ جوں جوں بچے کی عمر بڑھتی جاتی ہے، محبتِ مادری کا یہ شعلہ خود بخود دھیما پڑتا جاتا ہے، اور پھر ایک وقت آتا ہے جب حیوانات میں تو بالکل ہی بجھ جاتا ہے اور انسان میں بھی اس کی گرمجوشیاں باقی نہیں رہتیں۔ یہ انقلاب کیوں ہوتا ہے؟ ایسا کیوں ہے کہ بچے کے پیدا ہوتے ہی محبت کا ایک عظیم ترین جذبہ جنبش میں آجائے، اور پھر ایک خاص وقت تک قائم رہ کر خود بخود غائب ہو جائے؟ اس لیے کہ

طرح کی حالت ٹھہرا دینے کے۔ خواہ یہ ٹھہراؤ کمیت میں ہو یا کیفیت میں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فطرت نے ہر وجود کی جسمانی ساخت اور معنوی قویٰ کے لیے ایک خاص طرح کا اندازہ ٹھہرا دیا ہے جس سے وہ باہر نہیں جا سکتا، اور یہ اندازہ ایسا ہے جو اس کی زندگی اور نشوونما کے تمام احوال و ظروف سے ٹھیک ٹھیک مناسبت رکھتا ہے:

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ	اور اس نے تمام چیزیں پیدا کیں، پھر ہر چیز کے لیے
فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا	اس کی حالت اور ضرورت کے مطابق ایک خاص اندازہ
(۲:۲۵)	ٹھہرا دیا:

یہ کیا چیز ہے کہ ہر گردوپیش میں اور اس کی پیداوار میں ہمیشہ مطابقت پائی جاتی ہے اور یہ ایک ایسا قانون خلقت ہے جو کبھی متغیر نہیں ہو سکتا؟ یہ کیوں ہے؟ کہ ہر مخلوق اپنی ظاہری و باطنی بناوٹ میں ویسی ہی ہوتی ہے، جیسا اس کا گردوپیش ہے، اور ہر گردوپیش ویسا ہی ہوتا ہے جیسی اس کی مخلوقات ہوتی ہے؟ یہ اس حکیم و قدیر کی ٹھہرائی ہوئی تقدیر ہے اور اس نے ہر چیز کی خلقت و زندگی کے لیے ایسا ہی اندازہ مقرر کر دیا ہے، اس کا یہ قانون تقدیر صرف حیوانات و نباتات ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ کائنات ہستی کی ہر چیز کے لیے ہے۔ ستاروں کا یہ پورا نظام گردش بھی اسی تقدیر کی حدبندیوں پر قائم ہے:

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا	اور (دیکھو) سورج کے لیے جو قرار گاہ
ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝	ٹھہرا دی گئی ہے وہ اسی پر چلتا ہے اور یہ
(۳۶ : ۳۸)	عزیز و علیم خدا کی اس کے لیے تقدیر ہے۔

مخلوقات اور اس کے گردوپیش کی مطابقت کا یہی قانون ہے جس نے دونوں میں

نگرانی موجود ہو۔ چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ بچہ انڈے سے نکلتے ہی غذا ڈھونڈھنے لگتا ہے اور ماں چن چن کر اس کے سامنے ڈالتی اور منہ میں لے لے کر کھانے کی تلقین کرتی ہے۔ یا ایسا کرتی ہے کہ خود کھا لیتی ہے مگر ہضم نہیں کرتی اپنے اندر نرم اور ہلکا بنا کر محفوظ رکھتی ہے۔ اور جب بچہ غذا کے لیے منہ کھولتا ہے تو اس کے اندر اُتار دیتی ہے۔

رُبُوبیّتِ معنوی

پھر اس سے بھی عجیب تر نظام ربوبیت کا معنوی پہلو ہے۔ خارج میں زندگی اور پرورش کا اتنا ہی سروسامان کیا جاتا لیکن وہ کچھ مفید نہیں ہو سکتا تھا اگر ہر وجود کے اندر اس سے کام لینے کی ٹھیک ٹھیک استعداد نہ ہوتی اور اس کے ظاہری و باطنی قویٰ اس کا ساتھ نہ دیتے۔ پس یہ ربوبیت ہی کا فیضان ہے کہ ہم دیکھتے ہیں ہر مخلوق کی ظاہری و باطنی بناوٹ اسطرح کی واقع ہوئی ہے کہ اس کی ہر قوت اس کے سامانِ پرورش کی نوعیت کے مطابق ہوتی ہے اور اس کی ہر چیز اسے زندہ رہنے اور نشوونما پانے میں مدد دیتی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی مخلوق اپنے جسم و قویٰ کی ایسی نوعیت رکھتی ہو جو اس کے حالاتِ پرورش کے مقتضیات کے خلاف ہو۔ اس سلسلے میں جو حقائق مشاہدہ و تفکر سے نمایاں ہوتے ہیں، ان میں دو باتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ اس لیے جا بجا قرآن حکیم نے ان پر توجہ دلائی ہے۔ ایک کو وہ تقدیر سے تعبیر کرتا ہے دوسری کو ہدایت سے۔

تقدیر تقدیر کے معنی اندازہ کر دینے کے ہیں۔ یعنی کسی چیز کے لیے ایک خاص

دنیا کے سامانِ حیات و پرورش سے فائدہ اُٹھا سکتی۔ اور زندگی کی سرگرمیاں ظہور میں آسکتیں۔

لیکن ربوبیتِ الٰہی کی یہ ہدایت کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے: یہ وجدان کا فطری الہام اور حواس و ادراک کی قدرتی استعداد ہے۔ وہ کہتا ہے: یہ فطرت کی وہ رہنمائی ہے جو ہر مخلوق کے اندر پہلے وجدان کا الہام بن کر نمودار ہوتی ہے، پھر حواس و ادراک کا چراغ روشن کر دیتی ہے۔ یہ ہدایت کے مختلف مراتب ہیں سے وجدان اور ادراک کی ہدایت کے مراتب ہیں۔

ہدایتِ وجدان — وجدان کی ہدایت یہ ہے جو ہم دیکھتے ہیں، ہر مخلوق کی طبیعت میں کوئی ایسا اندرونی الہام موجود ہے جو اسے زندگی اور پرورش کی راہوں پر خود بخود لگا دیتا ہے اور وہ باہر کی رہنمائی و تعلیم کی محتاج نہیں ہوتی۔ انسان کا بچہ ہو یا حیوان کا، جونہی شکمِ مادر سے باہر آتا ہے، خود بخود معلوم کر لیتا ہے کہ اس کی غذا ماں کے سینے میں ہے، اور جب پستان منہ میں لیتا ہے، تو جانتا ہے کہ اسے زور زور سے چوسنا چاہیئے۔ بلّی کے بچّوں کو ہم ہمیشہ دیکھتے ہیں کہ ابھی ابھی پیدا ہوئے ہیں، ان کی آنکھیں بھی نہیں کھُلی ہیں، لیکن ماں جوشِ محبت میں انھیں چاٹ رہی ہے۔ وہ اس کے سینے پر منہ مار رہے ہیں۔ یہ بچّہ جس نے عالمِ ہستی میں ابھی ابھی قدم رکھا ہے، جسے خارج کے موثرات نے چھوا تک نہیں، کس طرح معلوم کر لیتا ہے کہ اسے پستان منہ میں لے لینا چاہیئے، اور اس کی غذا کا سرچشمہ یہیں ہے؟ وہ کونسا فرشتہ ہے جو اس وقت اس کے کان میں پھونک دیتا ہے کہ اس طرح اپنی غذا حاصل کرلے؟ یقیناً وہ وجدانی ہدایت کا فرشتہ ہے، اور یہی وجدانی ہدایت ہے جو قبل اس کے کہ حواس و ادراک کی روشنی نمودار ہو، ہر مخلوق کو اس کی پرورش و زندگی کی راہوں پر

باہم دگر مناسبت پیدا کردی ہے۔ اور ہر مخلوق اپنے چاروں طرف وہی پاتی ہے جس میں اس کے لیے پرورش اور نشو و نما کا سامان ہوتا ہے۔ پرند کا جسم اڑنے والا ہے، مچھلی کا تیرنے والا، چارپایوں کا چلنے والا، حشرات کا رینگنے والا، اس لیے کہ ان میں سے ہر نوع کا گرد و پیش ویسے ہی جسم کے لیے موزوں ہے جیسا اسے ملا ہے، اور اس لیے کہ ان میں سے ہر نوع کی جسمانی ساخت ویسا ہی گرد و پیش چاہتی ہے، جیسا گرد و پیش اسے حاصل ہے۔ دریا میں پرند پیدا نہیں ہوتا، اس لیے کہ یہ گرد و پیش اس کے لیے مفید پرورش نہیں۔ خشکی میں مچھلیاں پیدا نہیں ہو سکتیں، کیونکہ خشکی ان کے لیے موزوں نہیں۔ اگر فطرت کی اس تقدیر کے خلاف، ایک خاص گرد و پیش کی مخلوق دوسرے قسم کے گرد و پیش میں چلی جاتی ہے، تو یا تو وہاں زندہ نہیں رہتی یا رہتی ہے تو پھر بتدریج اس کی جسمانی ساخت اور طبیعت بھی ویسی ہی ہو جاتی ہے جیسی اس گرد و پیش میں ہونی چاہیئے۔

پھر ان میں سے ہر نوع کے لیے مقامی موثرات کے مختلف گرد و پیش ہیں، اور ہر گرد و پیش کا یہی حال ہے، سرد آب و ہوا کی پیداوار، سرد آب و ہوا ہی کے لیے ہے، گرم کی گرم کے لیے۔ قطب شمالی کے قرب و جوار کا ریچھ خطِ استوا کے قرب میں نظر نہیں آسکتا، اور منطقہ حارہ کے جانور منطقہ باردہ میں معدوم ہیں۔

ہدایت ہدایت کے معنی راہ دکھلانے راہ پر لگا دینے، رہنمائی کرنے کے ہیں۔ اور اس کے مختلف مراتب اور اقسام ہیں۔ تفصیل آگے آئیگی۔ یہاں صرف اس مرتبۂ ہدایت کا ذکر کرنا ہے جو تمام مخلوقات پر ان کی پرورش کی راہیں کھولتا، انھیں زندگی کی راہ پر لگاتا، اور ضروریاتِ زندگی کی طلب و حصول میں رہنمائی کرتا ہے۔ فطرت کی یہ ہدایت ربوبیت کی ہدایت ہے، اور اگر ہدایتِ ربوبیت کی دستگیری نہ ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ کوئی مخلوق بھی

اور حفاظت و نگرانی کے تمام فرائض حُسن و خوبی کے ساتھ انجام دیتے رہتے ہیں۔ پھر اس حواس و ادراک کی یہ ہدایت ہر حیوان کے لیے ایک ہی طرح کی نہیں ہے، بلکہ ہر وجود کو اتنی ہی اور ویسی ہی استعداد دی گئی ہے جتنی اور جیسی استعداد اس کے احوال و ظروف کے لیے ضروری تھی۔ چیونٹی کی قوتِ شامہ نہایت دور رس ہوتی ہے، اس لیے کہ اسی قوت کے ذریعے وہ اپنی غذا حاصل کر سکتی ہے۔ چیل اور عقاب کی نگاہ تیز ہوتی ہے، کیونکہ اگر ان کی نگاہ تیز نہ ہو تو بلندی میں اڑتے ہوئے اپنا شکار دیکھ نہ سکیں۔ یہ سوال بالکل غیر ضروری ہے کہ حیوانات کے حواس و ادراک کی یہ حالت اول دن سے تھی یا احوال و ظروف کی ضروریات اور قانونِ مطابقت کے مؤثرات سے بتدریج ظہور میں آئی۔ اس لیے کہ خواہ کوئی صورت ہو، بہر حال فطرت کی بخشی ہوئی استعداد ہے اور نشو و ارتقاء کا قانون بھی فطرت ہی کا ٹھہرایا ہوا قانون ہے۔

چنانچہ یہی مرتبۂ ہدایت ہے جس کو قرآن نے ربوبیتِ الٰہی کی وحی سے تعبیر کیا ہے عربی میں وحی کے معنی مخفی ایماء اور اشارے کے ہیں۔ یہ گویا فطرت کی وہ اندرونی سرگوشی ہے جو ہر مخلوق پر اس کی راہ عمل کھول دیتی ہے:

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ	اور دیکھو تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی
اَنِ اتَّخِذِىْ مِنَ الْجِبَالِ	کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں میں اور
بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا	درختوں میں اور ان ٹٹیوں میں جو اس غرض سے
يَعْرِشُوْنَ (۱۶: ۶۸)	بلند کی جاتی ہیں، اپنے لیے چھتے بنائے۔

اور یہی وہ ربوبیتِ الٰہی کی ہدایت ہے جس کی طرف حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی زبانی اشارہ کیا گیا ہے۔ فرعون نے جب پوچھا: فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ؟ تمہارا

لگا دیتی ہو۔

تمھارے گھر میں پلی ہوئی بلّی ضرور ہوگی۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ بلّی اپنی عمر میں پہلی مرتبہ حاملہ ہوئی ہو۔ اس حالت، کا اُسے کوئی تجربہ حاصل نہیں۔ تاہم اس کے اندر کوئی چیز ہو جو اسے بتا دیتی ہو کہ تیاری و حفاظت کی سرگرمیاں شروع کر دینی چاہئیں۔ جونہی وضع حمل کا وقت قریب آتا ہو، خود بخود اس کی توجہ ہر چیز کی طرف سے ہٹ جاتی ہو اور کسی محفوظ گوشے کی تلاش شروع کر دیتی ہو۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ مضطرب الحال بلّی مکان کا ایک ایک کونہ دیکھتی پھرتی ہو۔ پھر وہ خود بخود ایک سب سے محفوظ اور علیحدہ گوشہ چھانٹ لیتی ہو اور وہاں بچّہ دیتی ہو۔ پھر یکایک اس کے اندر بچے کی حفاظت کی طرف سے ایک مجہول خطرہ پیدا ہو جاتا ہو، اور وہ یکے بعد دیگرے اپنی جگہ بدلتی رہتی ہو۔ غور کرو، یہ کونسی قوت ہو جو بلّی کے اندر خیال پیدا کر دیتی کہ محفوظ جگہ تلاش کرے، کیونکہ عنقریب ایسی جگہ کی اُسے ضرورت ہوگی؟ یہ کونسا الہام ہو جو اسے خبردار کر دیتا ہو کہ بلّا بچوں کا دشمن اور ان کی بُو سونگھتا پھرتا ہو، اس لیے جگہ بدلتے رہنا چاہیئے؟ بلاشبہ یہ ربوبیّتِ الٰہی کی وجدانی ہدایت ہو جس کا الہام ہر مخلوق کے اندر اپنی نمود رکھتا ہو، اور جو اُن پر زندگی اور پرورش کی تمام راہیں کھول دیتا ہو۔

ہدایتِ حواس ہدایت کا دوسرا مرتبہ حواس اور مُدرکاتِ ذہنی کی ہدایت ہو، اور وہ اس درجہ واضح و معلوم ہے کہ تشریح کی ضرورت نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ حیوانات اس جوہرِ دماغ سے محروم ہیں جسے فکر و عقل سے تعبیر کیا جاتا ہو، تاہم فطرت نے انھیں احساس و ادراک کی وہ تمام قوتیں دیدی ہیں، جن کی زندگی و معیشت کے لیے ضرورت تھی، اور ان کی مدد سے وہ اپنے رہنے سہنے، کھانے پینے، توالد و تناسل

براہینِ قرآنیہ کا مبدءِ استدلال

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے خدا کی ہستی اور اس کی توحید و صفات پر جابجا نظامِ رُبوبیت سے استدلال کیا ہے، اور یہ استدلال اس کی مہمات دلائل میں سے ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ اس کی تشریح کی جائے، مناسب ہوگا کہ قرآن کے طریقِ استدلال کی بعض مبادیات واضح کر دی جائیں۔ کیونکہ مختلف اسباب سے، جن کی تشریح کا یہ موقع نہیں، مطالبِ قرآنی کا یہ گوشہ سب سے زیادہ مہجور ہوگیا ہے، اور ضرورت ہے کہ از سرِ نو حقیقتِ گم گشتہ کا سراغ لگایا جائے۔

دعوتِ تعقّل — قرآن کے طریقِ استدلال کا اوّلین مبدأ تعقّل و تفکّر کی دعوت ہے یعنی وہ جابجا اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان کے لیے حقیقت شناسی کی یہی راہ ہے کہ خدا کی دی ہوئی عقل و بصیرت سے کام لے، اور اپنے وجود کے اندر اور اپنے وجود کے باہر جو کچھ بھی محسوس کر سکتا ہے، اس میں تدبّر و تفکّر کرے۔ چنانچہ قرآن کی کوئی سورت اور سورت کا کوئی حصّہ نہیں جو تفکّر و تعقّل کی دعوت سے خالی ہو:

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝	اور یقین رکھنے والوں کے لیے زمین میں
وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ	(معرفتِ حق کی) نشانیاں ہیں، اور خود تمہارے
(۵۱ : ۲۰ - ۲۱)	وجود میں بھی۔ پھر کیا تم دیکھتے نہیں؟

وہ کہتا ہے، انسان کو عقل و بصیرت دی گئی ہے، اس لیے وہ اس قوت کے ٹھیک ٹھیک استعمال کرنے نہ کرنے کے لیے جواب دہ ہے:

إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ	یقیناً انسان کا سننا، دیکھنا، سوچنا

پروردگار کون ہے؟ تو حضرت موسیٰ نے کہا:

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ٥ (۲۰ : ۵۰)	ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ دی، پھر اس پر (زندگی و معیشت کی) راہ کھول دی۔

اور پھر یہی وہ ہدایت ہے جسے دوسری جگہ "راہِ عمل آسان کر دینے" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے:-

مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ ٥ مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ٥ ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗ ٥ (۸۰ : ۱۸-۲۰)	اس نے انسان کو کس چیز سے پیدا کیا؟ نطفہ سے پیدا کیا، پھر اس کی تمام ظاہری و باطنی قوتوں کے لیے ایک اندازہ ٹھہرا دیا، پھر اس پر (زندگی و عمل کی) راہ آسان کر دی۔

یہی "ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗ" یعنی "راہِ عمل آسان کر دینا" وجدان و ادراک کی ہدایت ہے جو تقدیر کے بعد ہے، کیونکہ اگر فطرت کی یہ رہنمائی نہ ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ ہم اپنی ضروریاتِ زندگی حاصل کر سکتے۔

آگے چل کر تمھیں معلوم ہوگا کہ قرآن نے تکوینِ وجود کے جو چار مرتبے بیان کیے ہیں، ان میں سے تیسرا اور چوتھا مرتبہ یہی تقدیر اور ہدایت کا مرتبہ ہے۔ یعنی تخلیق، تسویہ، تقدیر، ہدایت:

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ٥ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ٥ (۸۷ : ۲-۳)	وہ پروردگارِ عالم جس نے پیدا کیا، پھر اسے ٹھیک ٹھیک درست کر دیا، اور جس نے ہر وجود کے لیے ایک اندازہ ٹھہرا دیا، پھر اس پر راہِ عمل کھول دی۔

لِلْمُؤْمِنِیْنَ — ارباب ایمان کے لیے (معرفتِ حق) کی ایک بڑی ہی نشانی ہے!
(۲۹ : ۴۴)

آلِ عمران کی مشہور آیت میں اُن اربابِ دانش کی جو آسمان و زمین کی خلقت میں تفکّر کرتے ہیں۔ صدائے حال یہ بتائی ہے:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا — اے ہمارے پروردگار! یہ سب کچھ تو نے اس لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ محض ایک بیکار و عبث سا کام ہو!
(۳۰ : ۱۹۱)

دوسری جگہ "تخلیق بالباطل" کو تلعّب سے تعبیر کیا ہے۔ "تلعّب" یعنی کوئی کام کھیل کود کی طرح بغیر کسی معقول غرض و مدّعا کے کرنا:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ○ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ — اس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، محض کھیل اور تماشہ کرتے ہوئے نہیں پیدا کیا ہے۔ ہم نے انھیں نہیں پیدا کیا، مگر حکمت و مصلحت کے ساتھ۔ مگر اکثر انسان ایسے ہیں جو اس حقیقت کا علم نہیں رکھتے
(۴۴ : ۳۸ - ۳۹)

پھر جا بجا اس "تخلیق بالحق" کی تشریح کی ہے۔ مثلاً ایک مقام پر "تخلیق بالحق" کے اس پہلو پر توجہ دلائی ہے کہ کائنات کی ہر چیز افادہ و فیضان کے لیے ہے اور فطرت چاہتی ہے کہ جو کچھ بنائے، اس طرح بنائے کہ اس میں وجود اور زندگی کے لیے نفع اور راحت ہو:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى — اس نے آسمانوں اور زمین کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس نے رات اور دن کے اختلاف

كُلُّ أُولٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا (۱۷: ۳۶) سب اپنی اپنی جگہ جواب دہی رکھتے ہیں!

وہ کہتا ہے، زمین کی ہر چیز میں، آسمان کے ہر منظر میں، زندگی کے ہر تغیر میں فکرِ انسانی کے لیے معرفتِ حقیقت کی نشانیاں ہیں، بشرطیکہ وہ غفلت و اعراض میں مبتلا نہ ہو جائے۔

وَكَأَيِّنْ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ	اور آسمان و زمین میں (معرفتِ حق کی) کتنی
وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ	ہی نشانیاں ہیں، لیکن (افسوس انسان کی
عَنْهَا مُعْرِضُونَ ۝	غفلت پر!) لوگ ان پر سے گزر جاتے ہیں
(۱۲: ۱۰۵)	اور نظر اُٹھا کر دیکھتے تک نہیں:

تخلیق بالحق

اچھا، اگر انسان عقل و بصیرت سے کام لے اور کائناتِ خلقت میں تفکر کرے، تو اس پر حقیقت شناسی کا کونسا دروازہ کھلے گا؟ وہ کہتا ہے، سب سے پہلی حقیقت جو اس کے سامنے نمودار ہوگی، وہ تخلیق بالحق کا عالمگیر اور بنیادی قانون ہے۔ یعنی وہ دیکھے گا کہ کائناتِ خلقت اور اس کی ہر چیز کی بناوٹ کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ ہر چیز ضبط و ترتیب کے ساتھ ایک خاص نظام و قانون میں منسلک ہے اور کوئی شے نہیں جو حکمت و مصلحت سے خالی ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ سب کچھ تخلیق بالباطل ہو۔ یعنی بغیر کسی معین اور ٹھہرائے ہوئے مقصد و نظم کے وجود میں آگیا ہو۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ اس نظم، اس یکسانیت، اس وقت کے ساتھ اس کی ہر بات کسی نہ کسی حکمت و مصلحت کے ساتھ بندھی ہوئی ہوتی۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ	اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت اور مصلحت
بِالْحَقِّ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَةً	کے ساتھ پیدا کیا ہے، اور بلاشبہ اس بات میں

صُوَرَکُمْ (۶۴ : ۳) حسن وخوبی کے ساتھ بنائیں

اسی طرح وہ قانونِ مجازات پر (یعنی جزا و سزا کے قانون پر) بھی اسی "تخلیق بالحق" سے استشہاد کرتا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ دنیا میں ہر چیز کوئی نہ کوئی خاصہ اور نتیجہ رکھتی ہے، اور تمام خواص اور نتائج لازمی اور اٹل ہیں۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ انسان کے اعمال میں بھی اچھے اور برے خواص اور نتائج نہ ہوں اور وہ قطعی اور اٹل نہ ہوں؟ جو قانونِ فطرت دنیا کی ہر چیز میں اچھے برے کا امتیاز رکھتا ہے، کیا انسان کے اعمال میں اس امتیاز سے غافل ہو جائے گا؟

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا	جو لوگ برائیاں کرتے ہیں، کیا وہ سمجھتے ہیں،
السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَھُمْ	ہم انھیں ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان
کَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا	لائے اور جن کے اعمال اچھے ہیں؟ یعنی دونوں
الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاھُمْ	برابر ہو جائیں، زندگی میں بھی اور موت میں بھی؟
وَمَمَاتُھُمْ سَآءَ مَا	(اگر ان لوگوں کے فہم و دانش کا فیصلہ یہی ہے،
یَحْکُمُوْنَ ۝ وَخَلَقَ اللّٰہُ	تو) کیا ہی برا ان کا فیصلہ ہے! اور حقیقت
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ	یہ ہے کہ اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت
وَلِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا	مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے، اور اس لیے پیدا
کَسَبَتْ وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ	کیا ہے کہ ہر جان اپنی کمائی کے مطابق بدلہ پالے
(۴۵ : ۲۱-۲۲)	اور ایسا نہیں ہوگا کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہو۔

معاد یعنی مرنے کے بعد زندگی پر بھی اس سے جا بجا استشہاد کیا ہے۔ کائنات میں ہر چیز کوئی نہ کوئی مقصد اور منتہا رکھتی ہے۔ پس ضروری ہے کہ انسانی وجود کے لیے

النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى	اور ظہور کا ایسا انتظام کر دیا کہ رات دن پر لپٹی
الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَ	جاتی ہے اور دن رات پر لپٹا آتا ہے اور سورج اور
الْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِي لِاَجَلٍ	چاند دونوں کو اس کی قدرت نے مسخر کر رکھا ہے
مُّسَمًّى ۖ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ	سب (اپنی اپنی جگہ) اپنے مقررہ وقت تک کے
الْغَفَّارُ ۝ (۳۹ : ۵)	لیے گردش کر رہے ہیں۔

ایک دوسرے موقع پر خصوصیت کے ساتھ اجرام سماویہ کے افادہ و فیضان پر توجہ دلائی ہے اور اسے "تخلیق بالحق" سے تعبیر کیا ہے:

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ	وہ (کارفرمائے قدرت) جس نے سورج کو درخشندہ
ضِيَاءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ	اور چاند کو روشن بنایا، اور پھر چاند کی گردش کے
مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ	لیے منزلیں ٹھہرا دیں تاکہ تم برسوں کی گنتی اور اوقات
السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ مَا خَلَقَ	کا حساب معلوم کر لو۔ بلاشبہ اللہ نے یہ سب کچھ
اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ	پیدا نہیں کیا ہے مگر حکمت و مصلحت کے ساتھ۔ وہ
الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝	ان لوگوں کے لیے جو جاننے والے ہیں (علم و معرفت)
(۱۰ : ۵)	کی نشانیاں الگ الگ کر کے واضح کر دیتا ہے۔

ایک اور موقع پر فطرت کے جمال و زیبائی کی طرف اشارہ کیا ہے، اور اسے "تخلیق بالحق" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی فطرت کائنات میں تحسین و آرائش کا قانون کام کر رہا ہے جو چاہتا ہے جو کچھ بنے، ایسا بنے کہ اس میں حسن و جمال اور خوبی و کمال ہو:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ	اس نے آسمانوں اور زمین کو حکمت و مصلحت کے
بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ	ساتھ پیدا کیا۔ اور تمھاری صورتیں بنائیں تو نہایت

جو کسی ٹھہرائے ہوئے مقصد اور مصلحت سے خالی ہو، اور کسی بالاتر قانونِ خلقت کے ماتحت ظہور میں نہ آئی ہو۔ یہاں جو چیز بھی اپنا وجود رکھتی ہے، ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ حکمتوں اور مصلحتوں کے عالمگیر سلسلہ میں بندھی ہوئی ہے۔

وہ کہتا ہے، جب انسان ان مقاصد و مصالح پر غور کرے گا، تو عرفانِ حقیقت کی راہ خود بخود اس پر کھل جائے گی اور جہل و کوری کی گمراہیوں سے نجات پا جائے گا۔

بُرہانِ رُبُوبیّت

چنانچہ اس سلسلہ میں اس نے مظاہر کائنات کے جن مقاصد و مصالح سے استدلال کیا ہے، ان میں سب سے زیادہ عام استدلال رُبُوبیّت کا استدلال ہے، اور اسی لیے ہم اسے برہانِ رُبُوبیّت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ وہ کہتا ہے، کائنات کے تمام اعمال و مظاہر کا اس طرح واقع ہونا کہ ہر چیز پرورش کرنے والی اور ہر تاثیر زندگی بخشنے والی ہے اور پھر ایک ایسے نظامِ ربوبیت کا موجود ہونا جو ہر حالت کی رعایت کرتا اور ہر طرح کی مناسبت ملحوظ رکھتا ہے، ہر انسان کو وجدانی طور پر یقین دلا دیتا ہے کہ ایک پروردگارِ عالم ہستی موجود ہے اور وہ ان تمام صفتوں سے متّصف ہے جن کے بغیر نظامِ ربوبیّت کا یہ کامل اور بے عیب کارخانہ وجود میں نہیں آ سکتا تھا۔

وہ کہتا ہے، کیا انسان کا وجدان یہ باور کر سکتا ہے کہ نظامِ ربوبیّت کا یہ پورا کارخانہ خود بخود وجود میں آ جائے، اور کوئی زندگی، کوئی ارادہ، کوئی حکمت اس کے اندر کارفرما نہ ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اس کارخانۂ ہستی کی ہر چیز میں ایک بولتی ہوئی پروردگاری اور ایک ابھرتی ہوئی کارسازی موجود ہو، مگر کوئی پروردگار، کوئی کارساز موجود نہ ہو؟

بھی کوئی نہ کوئی مقصد اور منتہیٰ ہو یہی منتہیٰ آخرت کی زندگی ہے، کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ کائناتِ ارضی کی یہ بہترین مخلوق صرف اسی لیے پیدا کی گئی ہو کہ پیدا ہو، اور چند روز جی کر فنا ہو جائے!

اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِہِمْ مَا خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَہُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّی وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآیِٔ رَبِّہِمْ لَکٰفِرُوْنَ	کیا ان لوگوں نے کبھی اپنے دل میں اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے محض بیکار و عبث نہیں بنایا ہے۔ ضروری ہے کہ حکمت و مصلحت کے ساتھ بنایا ہو اور اس کے لیے ایک مقررہ وقت ٹھہرا دیا ہو۔ اصل یہ ہے کہ انسانوں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے پروردگار کی ملاقات سے یک قلم منکر ہیں۔
(۳۰ : ۸)	

مبدءِ استدلال

غرضکہ قرآن کا مبدءِ استدلال یہ ہے کہ :-

(۱) اس کے نزول کے وقت دین داری اور خدا پرستی کے جس قدر عام تصورات موجود تھے، وہ نہ صرف عقل کی آمیزش سے خالی تھے، بلکہ ان کی تمام تر بنیاد غیر عقلی عقائد پر آکر ٹھہر گئی تھی لیکن اس نے خدا پرستی کے لیے عقلی تصور پیدا کیا۔

(۲) اس کی دعوت کی تمام تر بنیاد تعقّل و تفکّر پر ہے، اور وہ خصوصیت کے ساتھ کائناتِ خلقت کے مطالعہ و تفکّر کی دعوت دیتا ہے۔

(۳) وہ کہتا ہے، کائناتِ خلقت کے مطالعہ و تفکّر سے انسان پر "تخلیق بالحق" کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے یعنی وہ دیکھتا ہے کہ اس کارخانۂ ہستی کی کوئی چیز نہیں

دیکھنا ہے تو اس کی فطرت کی صدا کیا ہوتی ہے؟ اس کے دل کے ایک ایک ریشے میں کونسا اعتقاد سمایا ہوتا ہے؟ کیا یہی نہیں ہوتا کہ ایک پروردگار ہستی موجود ہے اور یہ سب کچھ اسی کی کرشمہ سازیاں ہیں؟

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کا اُسلوبِ بیان یہ نہیں ہے کہ نظری مقدمات اور ذہنی مسلّمات کی شکلیں ترتیب دے، پھر اس پر بحث و تقریر کرکے مخاطب کو رد و تسلیم پر مجبور کرے۔ اس کا تمام تر خطاب انسان کے فطری وجدان و ذوق سے ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے، خدا پرستی کا جذبہ انسانی فطرت کا خمیر ہے۔ اگر ایک انسان اس سے انکار کرنے لگتا ہے، تو یہ اس کی غفلت ہے، اور ضروری ہے کہ اسے غفلت سے چونکا دینے کے لیے دلیلیں پیش کی جائیں، لیکن یہ دلیل ایسی نہیں ہونی چاہیئے جو محض ذہن و دماغ میں کاوش پیدا کر دے بلکہ ایسی ہونی چاہیئے جو اس کے نہاں خانۂ دل پر دستک دے دے اور اس کا فطری وجدان بیدار کر دے۔ اگر اس کا وجدان بیدار ہو گیا، تو پھر اثباتِ مدّعا کے لیے بحث و تقریر کی ضرورت نہ ہوگی۔ خود اس کا وجدان ہی اسے مدّعا تک پہنچا دے گا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن خود انسان کی فطرت ہی سے انسان پر حجت لاتا ہے:

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ	بلکہ انسان کا وجود خود اس کے خلاف دلیل ہی اس
بَصِیْرَۃٌ ۙ وَّلَوْ اَلْقٰی	کی کج اندیشیوں کے خلاف) حجت ہے، اگرچہ وہ اپنے
مَعَاذِیْرَہٗ ؕ (۷۵: ۱۴)	وجدان کے خلاف) کتنے ہی عذر بہانے تراش لیا کرے

اور اسی لیے وہ جا بجا فطرتِ انسانی کو مخاطب کرتا اور اس کی گہرائیوں سے جواب طلب کرتا ہے:

پھر کیا یہ محض ایک اندھی بہری فطرت، ایک بے جان مادہ اور بے حس الیکٹرون[1] کے خواص ہیں جن سے پروردگاری و کارسازی کا یہ پورا کارخانہ ظہور میں آگیا ہے اور عقل اور ارادہ رکھنے والی کوئی ہستی موجود نہیں؟

پروردگاری موجود ہے مگر کوئی پروردگار موجود نہیں کارسازی موجود ہے مگر کوئی کارساز موجود نہیں! رحمت موجود ہے مگر کوئی رحیم نہیں، حکمت موجود ہے مگر کوئی حکیم موجود نہیں! سب کچھ موجود ہے، مگر کوئی موجود نہیں! عمل بغیر کسی عامل کے، نظم بغیر کسی ناظم کے، قیام بغیر کسی قیوم کے، عمارت بغیر کسی معمار کے، نقش بغیر کسی نقاش کے، سب کچھ بغیر کسی موجود کے نہیں، انسان کی فطرت کبھی یہ باور نہیں کرسکتی۔ اس کا وجدان پکارتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں اس کی فطرت اپنی بناوٹ میں ایک ایسا سانچا لے کر آئی ہے جس میں یقین و ایمان ہی ڈھل سکتا ہے۔ شک اور انکار کی اس میں سمائی نہیں!

قرآن کہتا ہے، یہ بات انسان کے وجدانی اذعان کے خلاف ہے کہ وہ نظام ربوبیت کا مطالعہ کرے، اور ایک رَبّ العٰلَمِیْن ہستی کا یقین اس کے اندر جاگ نہ اُٹھے، وہ کہتا ہے، ایک انسان غفلت کی سرشاری اور سرکشی کے ہیجان میں ہر چیز سے انکار کر دے سکتا ہے لیکن اپنی فطرت سے انکار نہیں کرسکتا۔ وہ ہر چیز کے خلاف جنگ کرسکتا ہے، لیکن اپنی فطرت کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھا سکتا وہ جب اپنے چاروں طرف زندگی اور پروردگاری کا ایک عالمگیر کارخانہ پھیلا ہوا

---

[1] ELECTRONS

شَجَرَهَا ۚ ءَاِلٰـهٌ مَّعَ
اللّٰهِ ۚ بَلْ هُـمْ قَوْمٌ
يَّعْـدِلُوْنَ ۞ اَمَّنْ
جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا
وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا
وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ
وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ
حَاجِزًا ۚ ءَاِلٰـهٌ مَّعَ
اللّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ
لَا يَعْلَمُوْنَ ۞ اَمَّنْ
يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا
دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ
وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَـآءَ
الْاَرْضِ ۚ ءَاِلٰهٌ مَّعَ
اللّٰهِ ۚ قَلِيْلًا مَّا
تَذَكَّرُوْنَ ۞ اَمَّنْ
يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ
الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ
يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا

اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے؟ (افسوس ان لوگوں کی
سمجھ پر) حقیقت حال کتنی ہی ظاہر ہو مگر یہ وہ لوگ ہیں
جن کا شیوہ ہی کج روی ہے!

اچھا بتاؤ، وہ کون ہے جس نے زمین کو زندگی (معیشت) کا
ٹھکانا بنا دیا، اس کے درمیان نہریں جاری کر دیں۔ اس کی
درستگی کیلئے پہاڑ بلند کر دیئے، دو دریاؤں میں (یعنی دریا
اور سمندر میں ایسی) دیوار حائل کر دی (کہ دونوں اپنی
اپنی جگہ محدود رہتے ہیں) کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا
بھی ہے؟ (افسوس! کتنی واضح بات ہے، مگر ان
لوگوں میں اکثر ایسے ہیں جو نہیں جانتے۔

اچھا، بتلاؤ، وہ کون ہے جو بے قراروں کی پکار
سنتا ہے جب وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر اسے پکارنے
لگتے ہیں اور ان کا درد دکھ ٹال دیتا ہے؟ اور وہ کس
نے تمھیں زمین کا جانشین بنایا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی
دوسرا بھی ہے؟ (افسوس تمھاری غفلت پر) بہت کم
ایسا ہوتا ہے کہ تم نصیحت پذیر ہو!

اچھا، بتاؤ وہ کون ہے جو صحراؤں اور
سمندروں کی تاریکیوں میں تمھاری رہنمائی کرتا
ہے، وہ کون ہے جو باران رحمت سے پہلے خوشخبری

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ
السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ
يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ
وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ
الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ
الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ط وَمَنْ
يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ط فَسَيَقُوْلُوْنَ
اللّٰهُ ج فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝
فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ج
فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ج
فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝ (١٠: ٣٢)

وہ کون ہے جو آسمان زمین پھیلے ہوئے کارخانۂ حیات (
سے اور زمین کی وسعت میں پیدا ہونے والے سامان رزق)
سے تمھیں روزی بخش رہا ہے؟ وہ کون ہے جس کے قبضے میں
تمھارا سننا اور دیکھنا ہے؟ وہ کون ہے جو بے جان سے
جاندار کو، بے جان کو نکالتا ہے؟ اور پھر وہ کون سی
ہستی ہے جو یہ تمام کارخانۂ خلقت اس نظم و نگرانی
کے ساتھ چلا رہی ہے؟ (اے پیغمبر!) یقیناً وہ (بے اختیار)
بول اٹھیں گے اللہ ہے، اس کے سوا کون ہو سکتا ہے؟
اچھا تم ان سے کہو، جب تمھیں اس بات سے انکار نہیں
تو پھر یہ کیوں ہے کہ غفلت و سرکشی سے نہیں بچتے؟
ہاں بے شک یہ اللہ ہی ہے جو تمھارا پروردگار برحق ہے،
اور جب یہ حق ہے تو حق کے ظہور کے بعد اسے نہ ماننا گمراہی نہیں تو اور کیا ہے (افسوس تمھاری
سمجھ پر) تم (حقیقت سے منہ پھرائے) کہاں جا رہے ہو؟

ایک دوسرے موقع پر فرمایا:

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ
مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ج فَاَنْۢبَتْنَا
بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ج
مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا

وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔
اور جس نے آسمان سے تمھارے لیے پانی برسایا،
پھر اس آب پاشی سے خوش نما باغ لگا دیے، حالانکہ
تمھارے بس کی یہ بات نہ تھی کہ ان باغوں کے
درخت اگاتے (کیا ان کاموں کا کرنے والا)

الْمَآءَ صَبًّا ۙ ثُمَّ شَقَقْنَا	زمین پر پانی برساتے ہیں، پھر اس کی سطح شق
الْاَرْضَ شَقًّا ۙ فَاَنْۢبَتْنَا	کر دیتے ہیں، پھر اس کی روئیدگی سے طرح طرح
فِيْهَا حَبًّا ۙ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا	کی چیزیں پیدا کرتے ہیں، اناج کے دانے، انگور
وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۙ وَّحَدَآئِقَ	کی بیلیں، کھجور کے خوشے، سبزی، ترکاری،
غُلْبًا ۙ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۙ مَّتَاعًا	زیتون کا تیل، درختوں کے جھنڈ، قسم قسم کے
لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ	میوے، طرح طرح کا چارہ (اور یہ سب کچھ کس لئے
(۸۰: ۲۴-۳۲)	ہے؟) تمھارے فائدے کیلئے اور تمھارے جانوروں کے لئے!

ان آیات میں فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ کے زور پر غور کرو۔ انسان کتنا ہی غافل ہو جائے اور کتنا ہی اعراض کرے، لیکن دلائل حقیقت کی وسعت اور ہمہ گیری کا یہ حال ہو کہ کسی حال میں بھی اس سے اوجھل نہیں ہو سکتیں۔ ایک انسان تمام دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر لے، لیکن بہر حال اپنی شب و روز کی غذا کی طرف سے تو آنکھیں بند نہیں کر سکتا؟ جو غذا اس کے سامنے دھری ہو، اسی پر نظر ڈال لے۔ یہ کیا ہو؟ گیہوں کا دانہ ہو۔ اچھا گیہوں کا ایک دانہ اپنی ہتھیلی پر رکھ لو اور اس کی پیدائش سے لے کر اس کی پختگی و تکمیل تک کے تمام احوال و ظروف پر غور کرو۔ کیا یہ حقیر سا ایک دانہ بھی وجود میں آسکتا تھا۔ اگر تمام کارخانۂ ہستی ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ اس کی بناوٹ میں سرگرم نہ رہتا؟ اور اگر دنیا میں ایک ایسا نظامِ ربوبیت موجود ہو، تو کیا یہ ہو سکتا ہو کہ ربوبیت رکھنے والی ہستی موجود نہ ہو؟

سورۂ نحل میں یہی استدلال ایک دوسرے پیرایہ میں نمودار ہوا ہی:

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ	(اور دیکھو یہ) چارپائے (جنھیں تم پالتے ہو)

بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ	دینے والی ہوائیں چلادیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی
ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ تَعٰلَى	دوسرا بھی معبود ہے؟ (ہرگز نہیں) اللہ کی ذات اس شانے
اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ	سے پاک و منزہ ہے جو یہ لوگ اس کی معبودیت میں ٹھہرا رہے ہیں۔
اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ	اچھا بتاؤ وہ کون ہے جو مخلوقات کی پیدائش
يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ	شروع کرتا ہے اور پھر اسے دہراتا ہے اور وہ کون
مِّنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۭ	ہے جو زمین و آسمان کے کارخانے رزق سے
ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ قُلْ	تمھیں روزی دے رہا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی
هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ	دوسرا معبود بھی ہے؟ (اے پیغمبر) ان سے کہو اگر تم
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ	(اپنے رویّہ میں) سچے ہو (اور انسانی عقل و بصیرت
(۲۷ : ۶۱ ، ۶۲)	کی اس عالمگیر شہادت کے خلاف تمہارے پاس کوئی دلیل ہے) تو اپنی دلیل پیش کرو۔

ان سوالات میں سے ہر سوال اپنی جگہ ایک مستقل دلیل ہے، کیونکہ ان میں سے ہر سوال کا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا ہے، اور وہ فطرتِ انسانی کا عالمگیر اور مسلّمہ اذعان ہے۔ ہمارے متکلموں کی نظر اس پہلو پر نہ تھی، اس لیے قرآن کا اسلوب استدلال ان پر واضح نہ ہو سکا اور دور دراز گوشوں میں بھٹک گئے۔

بہر حال قرآن کے وہ بے شمار مقامات جن میں کائناتِ ہستی کے سر و سامانِ پرورش اور نظامِ ربوبیت کی کارسازیوں کا ذکر کیا گیا ہے، دراصل اسی استدلال پر مبنی ہیں:

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى	انسان اپنی غذا پر نظر ڈالے (جو شب و روز
طَعَامِهٖ ۙ اَنَّا صَبَبْنَا	اس کے استعمال میں آتی رہتی ہے) ہم پہلے

يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۱۶: ۶۶، ۶۹) بڑی ہی نشانی ہے![1]

جس طرح اس نے جا بجا خلقت سے استدلال کیا ہے، یعنی دنیا میں ہر چیز مخلوق ہے، اس لیے ضروری ہے کہ خالق بھی ہو، اسی طرح وہ ربوبیت سے بھی استدلال کرتا ہے۔ یعنی دنیا میں ہر چیز مربوب ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ کوئی رب بھی ہو، اور دنیا میں ربوبیت کامل بے داغ ہے، اس لیے ضروری ہے کہ وہ رب کامل اور بے عیب ہو۔

زیادہ واضح لفظوں میں اسے یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہر چیز ایسی ہے کہ اسے پرورش کی احتیاج ہے اور اسے پرورش مل رہی ہے۔ پس ضروری ہے کہ کوئی پرورش کرنے والا بھی موجود ہو۔ یہ پرورش کرنے والا کون ہے؟ یقیناً وہ

---

[1] اس موقع پر یہ اصل پیش نظر رکھنی چاہیے کہ جس طرح کائنات کی ہر چیز نظر و اعتبار کے مختلف پہلو رکھتی ہے، اسی طرح قرآن کا استشہاد بھی بیک وقت مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتا ہے البتہ خصوصیت کے ساتھ زور کسی ایک ہی پہلو کے لیے ہوتا ہے مثلاً شہد کی پیدائش اور شہد کی مکھی کے اعمال کے مختلف پہلو ہیں۔ یہ بات کہ ایک نہایت مفید اور لذیذ غذا پیدا ہو جاتی ہے، ربوبیت ہے۔ یہ بات کہ ایک حقیر سا جانور اس دانشمندی و دقت کے ساتھ یہ کام انجام دیتا ہے، ذہن و ادراک کی بخشش کا عجیب و غریب منظر ہے، اور اس لیے حکمت و قدرت کا پہلو رکھتا ہے۔ ان آیات کا سیاق و سباق بتلاتا ہے کہ یہاں زیادہ تر توجہ ربوبیت پر دلائی گئی ہے۔ لیکن ساتھ ہی حکمت و قدرت کے پہلوؤں پر بھی روشنی پڑ رہی ہے۔ اسی طرح اکثر مقامات میں ربوبیت، رحمت، حکمت اور قدرت کے مشترک مظاہر بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ زور کسی ایک ہی پہلو پر رہے ۱۲۔

لَعِبْرَةً ط نُسْقِيْكُمْ	ان میں تمھارے لیے غور کرنے اور نتیجہ نکالنے
مِمَّا فِي بُطُوْنِهٖ مِنْ	کی کتنی عبرت ہے؟ ان کے جسم سے ہم خون و کثافت
بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ	کے درمیان دودھ پیدا کر دیتے ہیں جو پینے والوں
لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا	کے لیے بے غل و غش مشروب ہوتا ہے (اسی طرح)
لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝ وَمِنْ	کھجور اور انگور کے پھل ہیں جن سے نشہ کا عرق
ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ	اور اچھی غذا دونوں طرح کی چیزیں حاصل کرتے
تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا	ہو، بلاشبہ اس بات میں ارباب عقل کے لئے
حَسَنًا ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً	(ربوبیت الٰہی کی) بڑی ہی نشانی ہے!
لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ وَاَوْحٰى	اور (پھر دیکھو) تمھارے پروردگار نے شہد
رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ	کی مکھی کی طبیعت میں یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں
مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ	میں اور درختوں میں اور ان ٹٹیوں میں جو اس
الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ	غرض سے بلند کی جاتی ہیں، اپنے لیے گھر بنائے،
ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ	پھر ہر طرح کے پھولوں سے رس چوسے، پھر اپنے
فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ	پروردگار کے ٹھہرائے ہوئے طریقوں پر کامل
ذُلُلًا ط يَخْرُجُ مِنْ	فرماں برداری کے ساتھ گامزن ہو (چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ)
بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ	اس کے جسم سے مختلف رنگتوں کا رس نکلتا
اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ	ہے جس میں انسان کے لیے شفا ہے۔ بلاشبہ اس
لِّلنَّاسِ ط اِنَّ فِيْ	بات میں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے
ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ	ہیں، (ربوبیت الٰہی کی عجائب آفرینیوں کی)

لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (۴۰: ۶۴ و ۶۵) بنایا۔

نظامِ ربوبیت سے توحید پر استدلال

اسی طرح وہ نظامِ ربوبیت سے توحیدِ الٰہی پر استدلال کرتا ہے جو ربّ العالمین تمام کائنات کی پرورش کر رہا ہے اور جس کی ربوبیت کا اعتراف تمھارے دل کے ایک ایک ریشے میں موجود ہے، اس کے سوا کون ان کا مستحق ہو سکتا ہے کہ بندگی و نیاز کا سر اس کے آگے جھکایا جائے؟

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا	اے افرادِ نسلِ انسانی! اپنے پروردگار کی عبادت
رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ	کرو، اس پروردگار کی جس نے تمھیں پیدا کیا،
وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ	اور ان سب کو بھی پیدا کیا جو تم سے پہلے گذر چکے
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ الَّذِیْ	ہیں اور اس لیے پیدا کیا تاکہ تم برائیوں سے بچو۔
جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ	وہ پروردگارِ عالم جس نے تمھارے لیے زمین فرش
فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً	کی طرح بچھا دی، اور آسمان چھت کی طرح بنا دیا،
وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ	اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس سے طرح طرح
مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ	کے پھل پیدا کر دیے، تاکہ تمھارے لیے رزق کا
الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ	سامان ہو۔ پس (جب خالقیت اسی کی خالقیت
فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا	ہے اور ربوبیت اسی کی ربوبیت) تو ایسا نہ
وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝	کرو کہ کسی دوسری ذات کو اس کا ہم پلّہ ٹھہرا لو، اور
(۲: ۲۱)	تم اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو!

یا مثلاً سورۂ فاطر میں ہے:

نہیں ہو سکتا، جو خود پروردہ اور محتاج پروردگاری ہو۔ قرآن میں جہاں کہیں اس طرح کے مخاطبات ہیں، جیساکہ سورۂ واقعہ کی مندرجہ ذیل آیت میں ہے، وہ اسی استدلال پر مبنی ہیں:

أَفَرَءَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ۝	"اچھا، تم نے اس بات پر غور کیا کہ جو کچھ تم
ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُۥٓ أَمْ	کشت کاری کرتے ہو، اسے تم اگاتے ہو، یا
نَحْنُ ٱلزَّٰرِعُونَ ۝ لَوْ نَشَآءُ	ہم اگاتے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے چورا چورا
لَجَعَلْنَٰهُ حُطَٰمًا	کردیں، اور تم صرف یہ کہنے کے لیے رہ جاؤ کہ
فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ ۝	"افسوس، ہمیں تو اس نقصان کا تاوان ہی
إِنَّا لَمُغْرَمُونَ ۝ بَلْ	دینا پڑے گا، بلکہ ہم تو اپنی محنت کے سارے
نَحْنُ مَحْرُومُونَ ۝ أَفَرَءَيْتُمُ	فائدوں ہی سے محروم ہو گئے"۔
ٱلْمَآءَ ٱلَّذِى تَشْرَبُونَ ۝	اچھا، تم نے یہ بات بھی دیکھی کہ یہ پانی جو
ءَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ	تمہارے پینے میں آتا ہے، اسے کون برساتا ہے؟
ٱلْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ ٱلْمُنزِلُونَ ۝	تم برساتے ہو یا ہم برساتے ہیں؟ اگر ہم چاہیں
لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنَٰهُ أُجَاجًا	تو اسے (سمندر کے پانی کی طرح) کڑوا کردیں
فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ۝ أَفَرَءَيْتُمُ	پھر کیا اس نعمت کے لیے ضروری نہیں کہ تم
ٱلنَّارَ ٱلَّتِى تُورُونَ ۝ ءَأَنتُمْ	شکر گزار ہو؟ اچھا، تم نے یہ بات بھی دیکھی
أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَآ أَمْ نَحْنُ	کہ یہ آگ جو تم سلگاتے ہو، تو اس کے لیے
ٱلْمُنشِـُٔونَ ۝ نَحْنُ جَعَلْنَٰهَا	لکڑی تم نے پیدا کی ہے یا ہم پیدا کر رہے ہیں؟
تَذْكِرَةً وَمَتَٰعًا	ہم نے اسے یادگار اور مسافروں کے لیے فائدہ بخش

زندگی کی برکتوں سے زمین کے ایک ایک ذرّہ کو مالا مال کر دیتی ہے۔ پھر کیا یہ ضروری نہیں
کہ جب عالم انسانیت، ہدایت و سعادت کی شادابیوں سے محروم ہو جائے تو اس کی باران رحمت نمودار
ہو کر ایک ایک روح کو پیام زندگی پہنچا دے؟ روحانی سعادت کی یہ بارش کیا ہے؟
وہ کہتا ہے، وحیِ الٰہی ہے، تم اس منظر پر کبھی متعجب نہیں ہوتے کہ پانی برسا اور
مردہ زمین زندہ ہو گئی، پھر اس بات پر کیوں چونک اُٹھو کہ وحیِ الٰہی ظاہر ہوئی
اور مردہ روحوں میں زندگی کی جنبش پیدا ہو گئی۔

حٰمٓ ۚ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ	یہ اللہ کی طرف سے کتاب (ہدایت) نازل
مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝	کی جاتی ہے جو عزیز اور حکیم ہے۔ بلاشبہ ایمان
اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	رکھنے والوں کے لیے آسمانوں اور زمین میں
لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَ	(معرفت حق کی) بے شمار نشانیاں ہیں۔ نیز تمہاری
فِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ	پیدائش میں، اور ان چارپایوں میں جنہیں اس نے
مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ	زمین میں پھیلا رکھا ہے، ارباب یقین کے لیے
يُّوْقِنُوْنَ ۝ وَاخْتِلَافِ	بڑی ہی نشانیاں ہیں۔ اسی طرح رات اور
الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ	دن کے یکے بعد دیگرے آتے رہنے میں اور
اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ	اس سرمایۂ رزق میں جسے وہ آسمان سے برساتا
فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ	ہے، اور زمین مرنے کے بعد پھر جی اُٹھتی ہے
مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ	اور ہواؤں کے ردوبدل میں ارباب دانش
اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝	کے لیے بڑی ہی نشانیاں ہیں (اے پیغمبر!)
تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا	یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو فی الحقیقت ہم تمہیں
عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ	سنا رہے ہیں، پھر اللہ اور اس کی آیتوں کے

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّهِ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ۝ (۳:۳۵)	اے افرادِ نسلِ انسانی! اللہ نے اپنی جن نعمتوں سے تمھیں فیضیاب کیا ہے، ان پر غور کرو، کیا اللہ کے سوا کوئی دوسرا بھی خالق ہے جو تمھیں زمین اور آسمان کی بخشائشوں سے رزق دے رہا ہے؟ نہیں، کوئی معبود نہیں ہے، مگر اسی کی ایک ذات!

نظامِ ربوبیت سے وحی و رسالت کی ضرورت پر استدلال

اسی طرح وہ نظامِ ربوبیت کے اعمال سے انسانی سعادت و شقاوت کے معنوی قوانین اور وحی و رسالت کی ضرورت پر بھی استدلال کرتا ہے۔ جس ربّ العالمین نے تمھاری پرورش کے لیے ربوبیت کا ایسا نظام قائم کر رکھا ہے، کیا ممکن ہے کہ اس نے تمھاری روحانی فلاح و سعادت کے لیے کوئی قانون، کوئی قاعدہ، کوئی نظام مقرر نہ کیا ہو؟ جس طرح تمھارے جسم کی ضرورتیں ہیں، اسی طرح تمھاری روح کی بھی ضرورتیں ہیں۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ جسم کی نشو و نما کے لیے تو اس کے پاس سب کچھ ہو، لیکن روح کی نشو و نما کے لیے اس کے پاس کوئی پروردگاری نہ ہو؟

اگر وہ ربّ العالمین ہے، اور اس کی ربوبیّت کے فیضان کا یہ حال ہے کہ ہر ذرّہ کے لیے سیرابی اور ہر چیونٹی کے لیے کارسازی رکھتی ہے، تو کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ انسان کی روحانی سعادت کے لیے اس کے پاس کوئی سرچشمگی نہ ہو؟ اس کی پروردگاری اجسام کی پرورش کے لیے آسمان سے پانی برسائے، لیکن ارواح کی پرورش کے لیے ایک قطرۂ فیض بھی نہ رکھے؟ تم دیکھتے ہو کہ جب زمین شادابی سے محروم ہو کر مردہ ہو جاتی ہے تو یہ اس کا قانون ہے کہ بارانِ رحمت نمودار ہوتی اور

جَعَلَ لَکُمُ النُّجُوْمَ لِتَھْتَدُوْا بِھَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ الخ (۶: ۹۵، ۹۹)

کہ سورج اور چاند کی گردش اس درستگی کے ساتھ قائم کردی کہ حساب کا معیار بن گئی۔ یہ اس عزیز و علیم کا ٹھہرایا ہوا اندازہ ہے (اور پھر دیکھو) وہی ہے جس نے تمہارے لیے ستارے پیدا کردیے

تاکہ خشکی و تری کی تاریکیوں میں ان سے رہنمائی پاؤ۔ بلاشبہ ان لوگوں کے لیے جو جاننے والے ہیں، ہم نے دلیلیں کھول کھول کر بیان کردی ہیں!

یعنی جس پروردگارِ عالم کی ربوبیت و رحمت کا یہ تمام فیضان شب و روز دیکھ رہے ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ وہ تمہاری جسمانی پرورش و ہدایت کے لیے تو یہ سب کچھ کرے، لیکن تمہاری روحانی پرورش و ہدایت کے لیے اس کے پاس کوئی سروسامان نہ ہو؟ وہ زمین کی موت کو زندگی سے بدل دیتا ہے، پھر کیا تمہاری روح کی موت کو زندگی سے نہیں بدل دے گا؟ وہ ستاروں کی روشن علامتوں سے خشکی و تری کی ظلمتوں میں رہنمائی کرتا ہے۔ کیونکر ممکن ہے کہ تمہاری روحانی زندگی کی تاریکیوں میں رہنمائی کی کوئی روشنی نہ ہو؟ تم جو کبھی اس پر متعجب نہیں ہوتے کہ زمین پر کھیت لہلہا رہے ہیں، اور آسمان میں تارے چمک رہے ہیں، کیوں اس بات پر متعجب ہوتے ہو کہ خدا کی وحی نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے نازل ہو رہی ہے؟ اگر تمھیں تعجب ہوتا ہے تو یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ تم نے خدا کو اس کی صفتوں میں اس طرح نہیں دیکھا ہے، جس طرح دیکھنا چاہیے۔ تمہاری سمجھ میں یہ بات تو آجاتی ہے، کہ وہ ایک چیونٹی کی پرورش کے لیے یہ پورا کارخانۂ حیات سرگرم رکھے مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ نوعِ انسانی کی ہدایت کے

حَدِيثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَآيَاتِهِ يُؤْمِنُونَ (۴۵: ۱-۶)

بعد کونسی بات رہ گئی ہے جسے سن کر یہ لوگ ایمان لائیں گے؟

سورۂ انعام میں ان لوگوں کا جو وحیِ الٰہی کے نزول پر متعجب ہوتے ہیں، ان لفظوں میں ذکر کیا ہے:

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ إِذْ قَالُوا مَآ أَنزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّن شَيْءٍ (۶: ۹۱)

اور اللہ کے کاموں کی انھیں جو قدر شناسی کرنی تھی یقیناً انھوں نے نہیں کی، جب انھوں نے یہ بات کہی کہ اللہ نے اپنے کسی بندے پر کوئی چیز نازل نہیں کی۔

تو پھر تورات اور قرآن کے نزول کے ذکر کے بعد حسب ذیل بیان شروع ہو جاتا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَأَنّٰى تُؤْفَكُونَ فَالِقُ الْإِصْبَاحِ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ وَهُوَ الَّذِي

یقیناً یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ وہ دانے اور گٹھلی کو شق کرتا ہے (اور اس سے ہر چیز کا درخت پیدا کر دیتا ہے) وہ زندہ کو مردہ چیز سے نکالتا اور مردہ کو زندہ اشیا سے نکالتا ہے۔ ہاں، وہی تمہارا خدا ہے، پھر تم اس سے روگردانی کر کے کدھر کو بہکے چلے جا رہے ہو؟ ہاں، وہی پردۂ شب چاک کر کے صبح کی روشنی نمودار کرنے والا ہے، وہی ہے جس نے رات کو راحت و سکون کا ذریعہ بنا دیا، اور وہی ہے

ہم نے یہ مطلب اسی سادہ طریقہ پر بیان کر دیا جو قرآن کے بیان و خطاب کا طریقہ ہے۔ لیکن یہی مطلب علمی بحث و تقریر کے پیرایہ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ وجودِ انسانی کرۂ ارض کے سلسلۂ خلقت کی آخری اور اعلیٰ ترین کڑی ہے اور اگر پیدائشِ حیات سے لے کر انسانی وجود کی تکمیل تک کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ایک ناقابلِ شمار مدت کے مسلسل نشو و ارتقاء کی تاریخ ہوگی۔ گویا فطرت نے لاکھوں، کروڑوں برس کی کارفرمائی و صناعی سے کرۂ ارضی پر جو اعلیٰ ترین وجود تیار کیا ہے وہ انسان ہے۔ ماضی کے ایک نقطۂ بعید کا تصور کرو جب ہمارا یہ کرہ سورج کے ملتہب کرنے سے الگ ہوا تھا نہیں معلوم کتنی مدت اس کے ٹھنڈے اور معتدل ہونے میں گذر گئی اور یہ اس قابل ہوا کہ زندگی کے عناصر اس میں نشو و نما پا سکیں اس کے بعد وہ وقت آیا جب اس کی سطح پر نشو و نما کی سب سے پہلی داغ بیل پڑی اور پھر نہیں معلوم کتنی مدت کے بعد زندگی کا وہ اولین بیج وجود میں آسکا جسے پروٹوپلازم (PROTO PLASM) کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر حیاتِ عضوی کے نشو و نما کا دوسرا دور شروع ہوا اور نہیں معلوم کتنی مدت اس پر گذر گئی کہ اس دور نے بسیط سے مرکب تک اور ادنیٰ سے اعلیٰ درجے تک ترقی کی منزلیں طے کیں، یہاں تک کہ حیوانات کی ابتدائی کڑیاں ظہور میں آئیں اور پھر لاکھوں برس اس میں نکل گئے، کہ یہ سلسلۂ ارتقاء وجودِ انسانی تک مرتفع ہو۔ پھر انسان کے جسمانی ظہور کے بعد اس کے ذہنی ارتقا کا سلسلہ شروع ہوا اور ایک طویل مدت اس پر گذر گئی۔ بالآخر ہزاروں برس کے اجتماعی اور ذہنی ارتقاء کے بعد وہ انسان ظہور پذیر ہو سکا جو کرۂ ارض کے تاریخی عہد کا متمدن اور عقیل انسان ہے۔

گویا زمین کی پیدائش سے لیکر ترقی یافتہ انسان کی تکمیل تک جو کچھ گذر چکا ہے اور جو کچھ بنتا سنورتا رہا ہے وہ تمام تر انسان کی پیدائش و تکمیل ہی کی سرگذشت ہے۔

سوال یہ ہے کہ جس وجود کی پیدائش کے لیے فطرت نے اس درجہ اہتمام کیا ہے

لیے سلسلۂ وحی و تنزیل قائم ہوا

نظام ربوبیت سے وجود معاد پر استدلال

اسی طرح وہ اعمالِ ربوبیت سے معاد اور آخرت پر بھی استدلال کرتا ہے جو چیز جتنی زیادہ نگرانی اور اہتمام سے بنائی جاتی ہے، اتنی ہی زیادہ قیمتی استعمال اور اہم مقصد بھی رکھتی ہے، اور بہتر صناع وہی ہے جو اپنی صنعت گری کا بہتر استعمال اور مقصد رکھتا ہو۔ پس انسان جو کرۂ ارضی کی بہترین مخلوق اور اس کے تمام سلسلۂ خلقت کا خلاصہ ہے اور جس کی جسمانی و معنوی نشوونما کے لیے فطرتِ کائنات نے اس قدر اہتمام کیا ہے، کیونکر ممکن ہے کہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کے لیے ہی بنایا گیا ہو۔ اور کوئی بہتر استعمال اور بلند تر مقصد نہ رکھتا ہو؟ اور پھر اگر اگر خالقِ کائنات رب ہے، اور کامل درجے کی ربوبیت رکھتا ہے، تو کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے ایک بہترین مربوب یعنی پروردہ ہستی کو محض اس لیے بنایا ہو کہ مہمل اور بے نتیجہ چھوڑ دے؟

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ	کیا تم نے ایسا سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمھیں بغیر کسی
عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا	مقصد و نتیجہ کے پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف
لَا تُرْجَعُوْنَ ۝ فَتَعٰلَى اللّٰهُ	لوٹنے والے نہیں؟ اللہ جو اس کائنات کا سچا
الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا	حقیقی حکمراں ہے اس سے بہت بلند ہے
هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ	کہ ایک بیکار و عبث فعل کرے، کوئی معبود
(۲۳ : ۱۱۵، ۱۱۶)	نہیں ہے، مگر وہ جو جہانداری کے عرشِ بزرگ
	کا پروردگار ہے!

لِلْمُوْقِنِيْنَ ۙ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ، وَفِي السَّمَاۗءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ۔ اس کے بعد فرمایا :

فَوَرَبِّ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ۔ (۵۱ : ۲۳)

آسمان اور زمین کے رب کی قسم (یعنی آسمان و زمین کے پروردگار کی پروردگاری کی شہادت دے رہی ہے) کہ بلاشبہ وہ معاملہ (یعنی جزا و سزا کا معاملہ) حق ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح یہ بات کہ تم گویائی رکھتے ہو۔

اس آیت میں اثباتِ جزا کے لیے خدا نے خود اپنے وجود کی قسم کھائی ہے لیکن ربّ کے لفظ سے اپنے آپ کو تعبیر کیا ہے، عربی میں قسم کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی بات پر کسی بات سے شہادت لائی جائے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ پروردگارِ عالم کی پروردگاری شہادت دے رہی ہے کہ یہ بات حق ہے۔ یہ شہادت کیا ہے؟ وہی ربوبیت کی شہادت ہے اگر دنیا میں پرورش موجود ہے، پروردہ موجود ہے، اور اس لیے پروردگار بھی موجود ہے تو ممکن نہیں کہ جزا کا معاملہ بھی موجود نہ ہو اور وہ بغیر کسی نتیجے کے انسان کو چھوڑ دے، چونکہ لوگوں کی نظر اس حقیقت پر نہ تھی، اس لیے اس آیت میں قسم اور مقسم بہ کا ربط صحیح طور پر متعیّن نہ کر سکے۔

قرآنِ حکیم کے دلائل و براہین پر غور کرتے ہوئے یہ اصل ہمیشہ پیشِ نظر رکھنی چاہیئے کہ اس کے استدلال کا طریقہ منطقی بحث و تقریر کا نہیں ہے جس کے لیے چند در چند مقدمات کی ضرورت ہوتی ہے، اور پھر اثباتِ مدّعا کی شکلیں ترتیب دینی پڑتی ہیں۔ بلکہ وہ ہمیشہ براہِ راست تلقین کا قدرتی اور سیدھا سادا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ عموماً اس کے دلائل اس کے اسلوبِ بیان و خطاب میں مضمر ہوتے ہیں۔

کیا یہ سب کچھ صرف اس لیے تھا کہ وہ پیدا ہو، کھائے پیئے، اور مر کر فنا ہو جائے؟
فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ

قدرتی طور پر یہاں ایک دوسرا سوال بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر وجودِ حیوانی اپنے ماضی میں یکے بعد دیگرے متغیر ہوتا اور ترقی کرتا رہا ہے تو مستقبل میں بھی یہ تغیر و ارتقاء کیوں جاری نہ رہے؟ اگر اس بات پر ہمیں بالکل تعجب نہیں ہوتا کہ ماضی میں بے شمار صورتیں مٹیں اور نئی زندگیاں ظہور میں آئیں تو اس بات پر کیوں تعجب ہو کہ موجودہ زندگی کا ٹھا بھی بالکل مٹ جانا نہیں ہے، اس کے بعد بھی ایک اعلیٰ تر صورت اور زندگی ہے؟

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ	کیا انسان خیال کرتا ہے کہ وہ مہمل چھوڑ دیا جائیگا
يُّتْرَكَ سُدًى ؕ اَلَمْ	(اور اس زندگی کے بعد دوسری زندگی نہ ہوگی؟)
يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ	کیا اس پر یہ حالت نہیں گذر چکی ہے کہ پیدائش
يُّمْنٰى ۙ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً	سے پہلے نطفہ تھا، پھر نطفہ سے علقہ ہوا (یعنی
فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۙ (۷۵: ۳۶)	جونک کی سی شکل ہوگئی) پھر علقہ سے اس کا

ڈیل ڈول پیدا کیا گیا، پھر (اس ڈیل ڈول کو) ٹھیک ٹھیک درست کیا گیا۔

سورۂ ذاریات میں تمام تر دین یعنی جزا کا بیان ہے: اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۙ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۙ اور پھر اس پر اعمالِ ربوبیت سے یعنی ہواؤں کے چلنے اور پانی برسنے کے مؤثرات سے استشہاد کیا گیا ہے: وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۙ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۙ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ۙ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۙ پھر آسمان اور زمین کی بخششوں اور خود وجودِ انسانی کی اندرونی شہادتوں پر توجہ دلائی ہے: وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ

(۴)

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

"الرَّحْمٰن" اور "الرَّحِیْم" دونوں رحم سے ہیں۔ عربی میں رحمت عواطف
کی ایسی رقّت و نرمی کو کہتے ہیں جس سے کسی دوسری ہستی کے لیے احسان و شفقت
کا ارادہ جوش میں آجائے۔ پس رحمت میں محبت، شفقت، فضل، احسان، سب
کا مفہوم داخل ہے اور مجرّد محبت، لطف اور فضل سے زیادہ وسیع اور حاوی ہے۔

اگرچہ یہ دونوں اسم رحمت سے ہیں، لیکن رحمت کے دو مختلف پہلوؤں
کو نمایاں کرتے ہیں۔ عربی میں فعْلان کا باب عموماً ایسے صفات کے لیے استعمال
کیا جاتا ہے جو محض صفات عارضہ ہوتے ہیں۔ جیسے پیاسے کے لیے عطْشان،
غضبناک کے لیے غَضْبان، سراسیمہ کے لیے حَیْران، مست کے لیے سُکْران
لیکن فَعِیْل کے وزن میں صفات قائمہ کا خاصہ ہے یعنی عموماً ایسے صفات کے لیے
بولا جاتا ہے جو جذبات و عوارض ہونے کی جگہ صفاتِ قائمہ ہوتے ہیں مثلاً کَرِیْم کرم
کرنے والا عَظِیْم بڑائی رکھنے والا، عَلِیْم علم رکھنے والا، حَکِیْم حکمت رکھنے
والا۔ پس الرَّحْمٰن کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ذات جس میں رحمت ہے، اور الرَّحِیْم
کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ذات جس میں نہ صرف رحمت ہے بلکہ جس سے ہمیشہ رحمت کا

وہ یا تو کسی مطلب کے لیے اسلوبِ خطاب ایسا اختیار کرتا ہے کہ اسی استدلال کی
روشنی نمودار ہو جاتی ہے، یا پھر کسی مطلب پر زور دیتے ہوئے کوئی ایک لفظ
ایسا بول جاتا ہے کہ اس کی تعبیر ہی میں اس کی دلیل بھی موجود ہوتی ہے، اور خود
بخود مخاطب کا ذہن دلیل کی طرف پھر جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی ایک واضح مثال
یہی صفتِ ربوبیّت کا جابجا استعمال ہے۔ جب وہ خدا کی ہستی کا ذکر کرتا ہوا
اسے ربّ کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے تو یہ بات کہ وہ ربّ ہے، جس طرح اس کی ایک
صفت ظاہر کرتی ہے، اسی طرح اس کی دلیل بھی واضح کر دیتی ہے، وہ ربّ ہے، اور
یہ واقعہ ہے کہ اس کی ربوبیّت تمھیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے اور خود تمھارے
دل کے اندر گھر بنائے ہوئے ہے، پھر کیونکر تم جرأت کر سکتے ہو کہ اس کی ہستی
سے انکار کرو۔ وہ ربّ ہے؛ اور ربّ کے سوا کون ہو سکتا ہے جو تمھاری بندگی و نیاز
کا مستحق ہو؟

چنانچہ قرآن کے وہ تمام مقامات جہاں اس طرح کے مخاطبات ہیں کہ یٰاَیُّھَا
النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ، اُعْبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبَّکُمْ اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ
فَاعْبُدُوْہُ؛ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ، اِنَّ ھٰذِہٖٓ اُمَّتُکُمْ اُمَّۃً
وَّاحِدَۃً وَّاَنَا رَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْنِ، قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰہِ وَھُوَ رَبُّنَا وَرَبُّکُمْ
وغیرہا، تو انھیں مجرّد امر و خطاب ہی نہیں سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ وہ خطاب و دلیل
دونوں ہیں، کیونکہ ربّ کے لفظ نے برہانِ ربوبیّت کی طرف خود بخود رہنمائی کر دی
ہے۔ افسوس ہے ہمارے مفسّروں کی نظر اس حقیقت پر نہ تھی۔ کیونکہ منطقی استدلال کے استغراق
نے انھیں قرآن کے طریقِ استدلال سے بے پروا کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان مقامات کے ترجمہ و تفسیر
میں قرآن کے اسلوبِ بیان کی حقیقی روح واضح نہ ہو سکی اور استدلال کا پہلو طرح طرح کی توجیہوں میں گم ہو گیا

میں صرف پرورش ہی نہیں ہے، پرورش سے بھی ایک زیادہ بنانے سنوارنے اور فائدہ پہنچانے کی حقیقت کام کر رہی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی فطرت میں بناؤ ہے، اس کے بناؤ میں خوبی ہے، اس کے مزاج میں اعتدال ہے، اس کے افعال میں خواص ہیں، اس کی صورت میں حسن ہے، اس کی صداؤں میں نغمہ ہے، اس کی بو میں عطر بیزی ہے، اور اس کی کوئی بات نہیں جو اس کارخانہ کی تعمیر و درستگی کے لیے مفید نہ ہو۔ پس یہ حقیقت جو اپنے بناؤ اور فیضان میں ربوبیت سے بھی زیادہ وسیع اور عام ہے، قرآن کہتا ہے کہ رحمت ہے اور خالقِ کائنات کی رحمانیت اور رحیمیت کا ظہور ہے!

تعمیر و تحسینِ کائنات رحمتِ الٰہی کا نتیجہ ہے

زندگی اور حرکت کا یہ عالمگیر کارخانہ وجود ہی میں نہ آتا، اگر اپنے ہر فعل میں بننے بنانے، سنورنے سنوارنے اور ہر طرح بہتر و اصلح ہونے کا خاصہ نہ رکھتا۔ فطرت کائنات میں یہ خاصہ کیوں ہے؟ اس لیے کہ بناؤ ہو، بگاڑ نہ ہو، درستی ہو، برہمی نہ ہو، لیکن کیوں ایسا ہوا کہ فطرت بنائے اور سنوارے، بگاڑے اور الجھائے نہیں؟ یہ کیا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے، درست اور بہتر ہی ہوتا ہے، خراب اور بدتر نہیں ہوتا؟ انسان کے علم و دانش کی کاوشیں آج تک یہ عقدہ حل نہ کر سکیں، فلسفہ و نظر کا قدم جب کبھی اس حد تک پہنچا، دم بخود ہو کر رہ گیا۔ لیکن قرآن کہتا ہے، یہ اس لیے ہے کہ فطرتِ کائنات میں رحمت ہے اور رحمت کا مقتضیٰ یہی ہے کہ خوبی اور درستگی ہو، بگاڑ اور خرابی نہ ہو!

انسان کے علم و دانش کی کاوشیں بتلاتی ہیں کہ کائناتِ ہستی کا یہ بناؤ اور سنوار عناصرِ اوّلیہ کی ترکیب اور ترکیب کے اعتدال و تسویہ کا نتیجہ ہے۔ مادۂ عالم

ظہور ہوتا رہتا ہے۔ اور ہر آن و ہر لمحہ تمام کائناتِ خلقت اس سے فیضیاب ہو رہی ہے۔

رحمت کو دو الگ الگ اسموں سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے؟ اس لیے کہ قرآن خدا کے تصور کا جو نقشہ ذہن نشین کرنا چاہتا ہے، اس میں سب سے زیادہ نمایاں اور چھائی ہوئی صفت رحمت ہی کی صفت ہے۔ بلکہ کہنا چاہیئے کہ تمام تر رحمت ہی ہے:

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (۷: ۱۵۵) اور میری رحمت دنیا کی ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے!

پس یہ ضروری تھا کہ خصوصیت کے ساتھ اس کی صفتی اور فعلی دونوں حیثیتیں واضح کر دی جائیں یعنی اس میں رحمت ہے، کیونکہ وہ الرحمٰن ہے اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ہمیشہ اس سے رحمت کا ظہور بھی ہو رہا ہے، کیونکہ الرحمٰن کے ساتھ وہ الرحیم بھی ہے۔

رحمت لیکن اللہ کی رحمت کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے، کائناتِ ہستی میں جو کچھ بھی خوبی و کمال ہے، وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ رحمتِ الٰہی کا ظہور ہے!

جب ہم کائناتِ ہستی کے اعمال و مظاہر پر غور کرتے ہیں، تو سب سے پہلی حقیقت جو ہمارے سامنے نمایاں ہوتی ہے، وہ اس کا نظامِ ربوبیت ہے۔ کیونکہ فطرت سے ہماری پہلی شناسائی ربوبیت ہی کے ذریعہ ہوتی ہے۔ لیکن جب علم و ادراک کی راہ میں چند قدم آگے بڑھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ربوبیت سے بھی ایک زیادہ وسیع اور عام حقیقت یہاں کارفرما ہے، اور خود ربوبیت بھی اسی کے فیضان کا ایک گوشہ ہے۔

ربوبیت اور اس کا نظام کیا ہے؟ کائناتِ ہستی کی پرورش ہے، لیکن کائناتِ ہستی

لیکن اس تعلیل سے بھی تو یہ عقدہ حل نہیں ہوا؟ سوال جس منزل میں تھا، اس سے صرف ایک منزل اور آگے بڑھ گیا۔ تم کہتے ہو، یہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس لیے ہے کہ "ضرورت" کا قانون موجود ہے لیکن سوال یہ ہے کہ "ضرورت" کا قانون کیوں موجود ہے؟ کیوں یہ ضروری ہوا کہ جو کچھ ظہور میں آئے "ضرورت" کے مطابق ہو، اور "ضرورت" اسی بات کی مقتضی ہوئی کہ خوبی اور درستگی ہو، بگاڑ اور برہمی نہ ہو؟ انسانی علم کی کاوشیں اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتیں۔ ایک مشہور فلسفی کے لفظوں میں "جس جگہ سے یہ 'کیوں' شروع ہو جائے سمجھ جاؤ کہ فلسفہ کے غور و خوض کی سرحد ختم ہو گئی"۔ لیکن قرآن اسی سوال کا جواب دیتا ہے، وہ کہتا ہے، یہ "ضرورت" رحمت اور فضل کی "ضرورت" ہے۔ رحمت چاہتی ہے کہ جو کچھ ظہور میں آئے، بہتر ہو اور نافع ہو، اور اس لیے جو کچھ ظہور میں آتا ہے، بہتر ہوتا ہے، اور نافع ہوتا ہے!

پھر یہ حقیقت بھی واضح رہے کہ دنیا میں زندگی اور بقا کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے، جمال و زیبائی ان سے ایک زائد تر فیضان ہے، اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ جمال و زیبائش بھی یہاں موجود ہے۔ پس یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سب کچھ قانونِ ضرورت ہی کا نتیجہ ہے۔ ضرورت، زندگی اور بقا کا سروسامان چاہتی ہے، لیکن زندہ اور باقی رہنے کے لیے جمال و زیبائش کی کیا ضرورت ہے؟ اگر جمال و زیبائش بھی یہاں موجود ہے تو یقیناً یہ فطرت کا ایک مزید لطف و احسان ہے، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت صرف زندگی ہی نہیں بخشتی، بلکہ زندگی کو حسین و لطیف بھی بنانا چاہتی ہے۔ پس یہ محض زندگی کی ضرورت کا قانون نہیں ہو سکتا۔ یہ اس "ضرورت" سے بھی کوئی بالاتر "ضرورت" ہے جو چاہتی ہے کہ مرحمت اور فیضان ہو۔ قرآن کہتا ہے، یہ رحمت کی "ضرورت"

کی کمیت میں بھی اعتدال ہے۔ کیفیت میں بھی اعتدال ہے۔ یہی اعتدال ہے جس سے سب کچھ بنتا ہے، اور جو کچھ بنتا ہے، خوبی اور کمال کے ساتھ بنتا ہے۔ یہی اعتدال و تناسب دنیا کے تمام تعمیری اور ایجابی حقائق کی اصل ہے، وجود، زندگی، تندرستی، حسن، خوشبو، نغمہ، بناؤ اور خوبی کے بہت سے نام ہیں، مگر حقیقت ایک ہی ہے اور وہ اعتدال ہے۔

لیکن فطرتِ کائنات میں یہ اعتدال و تناسب کیوں ہے؟ کیوں ایسا ہوا کہ عناصر کے دقائق جب ملیں تو اعتدال و تناسب کے ساتھ ملیں، اور مادّہ کا خاصّہ یہی ٹھہرا کہ اعتدال و تناسب ہو، انحراف اور تجاوز نہ ہو؟ انسان کا علم دم بخود اور متحیر ہے، لیکن قرآن کہتا ہے، یہ اس لیے ہوا کہ خالقِ کائنات میں رحمت ہے اور اس لیے کہ اس کی رحمت اپنا ظہور بھی رکھتی ہے۔ اور جس میں رحمت ہو، اور اس کی رحمت ظہور بھی رکھتی ہو تو جو کچھ اس سے صادر ہوگا۔ اس میں خوبی و بہتری ہی ہو گی، حسن و جمال ہی ہوگا۔ اعتدال و تناسب ہی ہوگا، اس کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا!

فلسفہ ہمیں بتاتا ہے کہ تعمیر اور تحسین فطرتِ کائنات کا خاصّہ ہے۔ خاصّہ تعمیر چاہتا ہے کہ بناؤ ہو، خاصہ تحسین چاہتا ہے کہ جو کچھ بنے خوبی و کمال کے ساتھ بنے اور یہ دونوں خاصّے "قانونِ ضرورت" کا نتیجہ ہیں۔ کائناتِ ہستی کے ظہور و تکمیل کے لیے ضرورت تھی کہ تعمیر ہو اور ضرورت تھی کہ جو کچھ تعمیر ہو حُسن و خوبی کے ساتھ تعمیر ہو۔ "یہی ضرورت" بجائے خود ایک علّت ہو گئی، اور اس لیے فطرت سے جو کچھ بھی ظہور میں آتا ہے، ویسا ہی ہوتا ہے، جیسا ہونا ضروری تھا۔

نشانیاں ہیں۔[1]

---

[1] اس آیت میں اور اس کی تمام ہم معنی آیات میں "سخر" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے یعنی تمام چیزیں تمہارے لیے مسخر کر دی گئی ہیں۔ عربی میں تسخیر ٹھیک ٹھیک اسی معنی میں بولا جاتا ہے جس معنوں میں ہم اردو میں بولا کرتے ہیں یعنی کسی چیز کا قہراً و حکماً اس طرح مطیع ہو جانا کہ جس طرح چاہیں اس سے کام لیں۔ غور کرو۔ انسانی قوا کی عظمت و سروری کے اظہار کے لیے اس سے زیادہ موزوں تعبیر اور کیا ہو سکتی تھی؟ قرآن کے نزول سے پہلے اقوامِ عالم کی دینی ذہنیت انسان کی عقلی اُمنگوں کے قطعاً خلاف تھی۔ لیکن قرآن نے صرف یہی نہیں کیا کہ اس کی عقلی اُمنگوں کی جراٴت افزائی کر دی بلکہ اس کی ہمت عقل اور اولوالعزمیِ علم کے لیے ایک ایسی بلند نظری کا نقشہ کھینچ دیا جس سے بہتر نقشہ آج بھی نہیں کھینچا جا سکتا۔ آسمان اور زمین جو کچھ ہے سب اس لیے ہے کہ انسان کے آگے مسخر ہو کر رہے اور انسان ان میں تصرّف کرے۔ انسانی عقل و فکر کے لیے اس سے زیادہ بلند نصب العین اور کیا ہو سکتا ہے؟

پھر غور کرو "تسخیر" کا لفظ انسانی عقل کی حکمرانیوں کے لیے کس درجہ موزوں لفظ ہے؟ اس تسخیر کا قدیم منظر یہ تھا کہ انسان کا چھوٹا سا بچہ لکڑی کے دو گز تختے جوڑ کر سمندر کے سینے پر سوار ہو جاتا تھا اور نیا منظر یہ ہے کہ آگ، پانی، ہوا، بجلی تمام عناصر پر حکمرانی کر رہا ہے۔

البتہ یہ بات یاد رہے کہ قرآن نے جہاں کہیں اس تسخیر کا ذکر کیا ہے اس کا تعلق صرف کرۂ ارضی کی کائنات سے ہے یا آسمان کے ان موثرات سے ہے جنھیں ہم یہاں محسوس کر رہے ہیں۔ یہ نہیں کہا ہے کہ تمام موجوداتِ ہستی اس کے لیے مسخر کر دی گئی ہیں۔ یا تمام موجوداتِ ہستی میں وہ اشرف و اعلیٰ مخلوق ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہماری دنیا کائناتِ ہستی کے بے کنار سمندر میں ایک قطرہ سے زیادہ نہیں وَمَا یَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ: اور انسان کو جو کچھ بھی برتری حاصل ہے وہ صرف اسی دنیا کی مخلوقات میں سے ہے۔

ہے اور رحمت کا مقتضیٰ یہی ہے کہ وہ سب کچھ ظہور میں آئے جو رحمت سے ظہور میں آنا چاہیئے:

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے، وہ کس کے لیے
قُلْ لِّلّٰهِ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ	ہے؟ (اے پیغمبر!) کہہ دے، اللہ کے لیے
(۶ : ۱۲)	ہے جس نے اپنے لیے ضروری ٹھہرالیا ہے کہ رحمت ہو
وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ	اور میری رحمت دنیا کی ہر چیز کو گھیرے
(۷ : ۱۵۶)	ہوئے ہے!

افادہ وفیضانِ فطرت — اس سلسلہ میں سب سے پہلی حقیقت جو ہمارے سامنے نمایاں ہوتی ہے، وہ کائناتِ ہستی اور اس کی تمام اشیاء کا افادہ وفیضان ہے۔ یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ فطرت کے تمام کاموں میں کامل نظم ویکسانیت کے ساتھ مفید اور بکار آمد ہونے کی خاصیت پائی جاتی ہے اور اگر بہ حیثیتِ مجموعی دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا یہ تمام کارگاہِ عالم صرف اسی لیے بنا ہے کہ ہمیں فائدہ پہنچائے، اور ہماری حاجت روائیوں کا ذریعہ ہو:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ	اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے، وہ سب اللہ
وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ	نے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے (یعنی اُن کی قوتیں اور
اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ	تاثیریں اس طرح تمہارے تصرف میں دے دی گئی
یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝	ہیں کہ جس طرح چاہو، کام لے سکتے ہو) بلاشبہ
(۴۵ : ۱۳)	ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں
	اس بات میں (معرفتِ حق کی) بڑی ہی

كَفَّارٌ ٥ (۱۴ : ۳۷) غرضیکہ جو کچھ تمہیں مطلوب تھا، وہ سب کچھ اس نے عطا کر دیا۔ اگر تم اللہ کی نعمتیں شمار کرنی چاہو، تو وہ اتنی ہیں کہ ہرگز شمار نہ کر سکو گے۔ بلاشبہ انسان بڑا ہی نا انصاف، بڑا ہی ناشکرا ہے!

زمین کو دیکھو، اس کی سطح پھلوں اور پھولوں سے لدی ہوئی ہے، تہ میں آبِ شیریں کی سوتیں بہہ رہی ہیں، گہرائی سے چاندی سونا نکل رہا ہے، وہ اپنی جسامت میں اگرچہ مدوّر ہے، لیکن اس کا ہر حصہ اس طرح واقع ہوا ہے کہ معلوم ہوتا ہے ایک مسطح فرش بچھا دیا گیا ہے!

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ	وہ پروردگار جس نے تمہارے لیے زمین اس طرح بنا دی
مَهْدًا وَجَعَلَ لَكُمْ فِيهَا	کہ فرش کی طرح بچھی ہوئی ہے، اور اس میں قطعِ
سُبُلًا لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ٥ (۴۳ : ۱۰)	مسافت کی راہیں پیدا کر دیں
وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ	اور یہ اسی پروردگار کی پروردگاری ہے کہ اس نے
وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْهَارًا	زمین (تمہاری سکونت کے لیے) پھیلا دی، اور
وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ	اس میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیئے۔ اور نہریں
فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ	بہا دیں۔ نیز ہر طرح کے پھلوں کی دو دو قسمیں
يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ	پیدا کر دیں، اور پھر یہ اسی کی کارفرمائی ہے کہ رات
إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ	اور دن یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں اور رات
يَتَفَكَّرُونَ ٥ وَفِي الْأَرْضِ	کی تاریکی دن کی روشنی ڈھانپ لیتی ہے۔ بلاشبہ
قِطَعٌ مُتَجَاوِرَاتٌ وَجَنَّاتٌ	ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں، اس
مِنْ أَعْنَابٍ وَزَرْعٌ	میں معرفتِ حقیقت کی بڑی ہی نشانیاں ہیں

ہم دیکھتے ہیں کہ کائناتِ ہستی میں، جو کچھ بھی موجود ہے، اور جو کچھ بھی ظہور میں آتا ہے، اس میں سے ہر چیز کوئی نہ کوئی خاصہ رکھتی ہے، اور ہر حادثہ کی کوئی نہ کوئی تاثیر ہے اور پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ تمام خواص و موثرات کچھ اس طرح واقع ہوئے ہیں کہ ہر خاصہ ہماری کوئی نہ کوئی ضرورت پوری کرتا، اور ہر تاثیر ہمارے لیے کوئی نہ کوئی فیضان رکھتی ہے۔ سورج، چاند، ستارے، ہوا، بارش، دریا، سمندر، پہاڑ، سب کے خواص و فوائد ہیں، اور سب ہمارے لیے طرح طرح کی راحتوں اور آسائشوں کا سامان بہم پہنچا رہے ہیں۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ	یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ اس نے آسمانوں
وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ	اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا
مَاءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ	پھر اس کی تاثیر سے طرح طرح کے پھل تمھاری
رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ	غذا کے لیے پیدا کر دیئے۔ اسی طرح اس نے یہ
لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ	بات بھی ٹھہرا دی کہ سمندر میں جہاز تمھارے
لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ	زیرِ فرمان رہیں، اور حکم الٰہی سے چلتے رہتے
الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ	ہیں، اور اسی طرح دریا بھی تمھاری کاربرآریوں
وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ	کے لیے مسخر کر دیے گئے (اور پھر اتنا ہی نہیں
وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا	بلکہ غور کرو تو) سورج اور چاند بھی تمہارے
سَاَلْتُمُوْهُ ۚ وَاِنْ تَعُدُّوْا	لیے مسخر کر دیئے گئے ہیں۔ کہ ایک خاص ڈھنگ
نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۚ	پر گردش میں رہیں۔ اور رات دن کا اختلاف
اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ	بھی (تمہارے فائدہ ہی کے لیے) مسخر ہے

مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ج
وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ
فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ
(۱۶ : ۱۴)

زیور کی چیزیں نکالو جنھیں (خوش نمائی
کے لیے) پہنتے ہو' نیز تم دیکھتے ہو کہ جہاز
سمندر میں موجیں چیرتے ہوئے چلے جا رہے
ہیں' اور سیر و سیاحت کے ذریعے اللہ کا
فضل تلاش کرو تاکہ اس کی نعمت کے شکر گزار ہو

حیوانات کو دیکھو۔ زمین کے چارپائے، فضا کے پرند، پانی کی مچھلیاں سب اسی لیے ہیں کہ اپنے اپنے وجود سے ہمیں فائدہ پہنچائیں، غذا کے لیے ان کا دودھ اور گوشت، سواری کے لیے ان کی پیٹھ، حفاظت کے لیے ان کی پاسبانی، پہننے کے لیے ان کی کھال اور اون، برتنے کے لیے ان کے جسم کی ہڈیاں تک مفید ہیں!

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ
فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ
وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ وَلَكُمْ
فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ
وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۝ وَتَحْمِلُ
اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ
تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ
الْاَنْفُسِ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ
رَّحِيْمٌ ۝ وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ
وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً

اور چارپائے پیدا کر دیے جن میں تمھارے لیے
جاڑے کا سامان اور طرح طرح کے منافع
ہیں' اور ان سے تم اپنی غذا بھی حاصل کرتے
ہو۔ جب ان کے غول شام کو چر کر واپس آتے
ہیں' اور جب چراگاہوں کے لیے نکلتے ہیں تو
(دیکھو) ان کے منظر میں تمھارے لیے خوش نمائی
رکھ دی ہے۔ اور انہی میں وہ جانور بھی ہیں جو
تمھارا بوجھ اٹھا کر ان (دور و دراز) شہروں
تک پہنچا دیتے ہیں' جہاں تک تم بغیر سخت
مشقت کے نہیں پہنچا سکتے تھے۔ بلاشبہ تمھارا

وَنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ	اور پھر دیکھو زمین کی سطح اس طرح بنائی
صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ	گئی ہے کہ اس میں ایک دوسرے سے قریب
وَّاحِدٍ وَّنُفَضِّلُ بَعْضَهَا	(آبادی کے) قطعات بن گئے۔ اور انگور کے
عَلٰى بَعْضٍ فِى الْاُكُلِ	باغ، غلّہ کی کھیتیاں، کھجوروں کے جھنڈ
اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ	پیدا ہو گئے۔ ان درختوں میں بعض درخت ایاؤ
لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ٥	ٹہنیوں والے ہیں، بعض اکہرے، اور اگرچہ سب
(۱۳: ۳، ۴)	کو ایک ہی طرح کے پانی سے سینچا جاتا ہے

لیکن پھل ایک طرح کے نہیں۔ ہم نے بعض درختوں کو بعض درختوں پر پھلوں کے مزے میں برتری دے دی۔ بلاشبہ ارباب دانش کے لیے اس میں (معرفت حقیقت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِى	اور (دیکھو) ہم نے زمین میں تمھیں طاقت
الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ	میں تصرف کے ساتھ جگہ دی اور زندگی کے تمام
فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا	سامان پیدا کر دیئے۔ (مگر افسوس) بہت کم
مَّا تَشْكُرُوْنَ ٥ (۷: ۹)	ایسا ہوتا ہے کہ تم نعمت الٰہی کے شکر گذار ہو!

سمندر کی طرف نظر اُٹھاؤ، اس کی سطح پر جہاز تیر رہے ہیں، تہہ میں مچھلیاں اُچھل رہی ہیں، قعر میں مرجان اور موتی نشو و نما پا رہے ہیں:

وَهُوَ الَّذِىْ سَخَّرَ الْبَحْرَ	اور (دیکھو) یہ اسی کی کارفرمائی ہے کہ اس نے
لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا	سمندر تمھارے لیے مسخر کر دیا تاکہ اپنی غذا
طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا	کے لیے تر و تازہ گوشت حاصل کرو اور

کبھی اپنے جھونپڑے میں بیٹھا ہوا نظر اُٹھاتا ہے، تو گو اپنے احساس کے لیے بہتر تعبیر نہ پائے، لیکن یہ حقیقت ضرور محسوس کر لیتا ہے۔ وہ جب بیمار ہوتا ہے تو جنگل کی جڑی بوٹیاں کھا لیتا ہے، دھوپ تیز ہوتی ہے تو درختوں کے سائے میں بیٹھ جاتا ہے، بیکار ہوتا ہے تو پتّوں کی سرسبزی اور پھولوں کی خوشنمائی سے آنکھیں سینکنے لگتا ہے۔ پھر یہی درخت ہیں جو اپنی شادابی میں اسے پھل بخشتے ہیں، پختگی میں لکڑی کے تختے بن جاتے ہیں، کہنگی میں آگ کے شعلے بھڑکا دیتے ہیں۔ ایک ہی مخلوق بنائی ہے جو اپنے منظر سے نزہت و سرور بخشتی ہے، اپنی بُو سے ہوا کو معطّر کرتی ہے، اپنے پھل میں طرح طرح کی غذائیں رکھتی ہے، اپنی لکڑی سے سامانِ تعمیر مہیّا کرتی ہے، اور پھر خشک ہو جاتی ہے۔ تو اس کے جلانے سے آگ بھڑکتی، چولھے گرم کرتی، موسم کو معتدل بناتی اور اپنی حرارت سے بے شمار اشیاء کے پکنے، پگھلنے، اور تپنے کا ذریعہ بنتی ہے!

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ	(اور دیکھو) وہ کارفرمائے قدرت، جس نے
الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ	سرسبز درخت سے تمہارے لیے آگ پیدا کر دی
اَنْتُمْ مِّنْہُ تُوْقِدُوْنَ ۝	اب تم اسی سے (اپنے چولھوں کی) آگ سلگا
(۳۶ : ۸۰)	لیتے ہو۔

اور پھر یہ وہ فوائد ہیں، جو تمھیں اپنی جگہ محسوس ہو رہے ہیں، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ فطرت نے یہ تمام چیزیں کن کن کاموں اور کن کن مصلحتوں کے لیے پیدا کی ہیں، اور کارفرمائے عالم کارگاہِ ہستی کے بنانے اور سنوارنے میں ان سے کیا کیا کام نہیں لے رہا ہے؟

وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ	اور تمھارا پروردگار (اس کارخانۂ ہستی کی کارفرمائیوں

وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ٥ (۱۶: ۵، ۸)

پروردگار بڑا ہی شفقت رکھنے والا اور صاحب رحمت ہے اور دیکھو) گھوڑے، خچر، گدھے پیدا کیے گئے تاکہ تم ان سے سواری کا کام لو اور خوش نمائی کا بھی موجب ہوں۔ وہ اسی طرح طرح طرح کی چیزیں) پیدا کرتا ہے جن کا تمھیں علم نہیں

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ (۱۶: ۶۶)

اور چارپایوں کے وجود میں تمھارے لیے (فہم و بصیرت کی) بڑی ہی عبرت ہے انہی جانوروں کے جسم میں سے ہم خون اور کثافتوں کے درمیان پاک و صاف دودھ پیدا کر دیتے ہیں۔ جو پینے والوں کے لیے بے غل و غش مشروب ہوتا ہے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ٥ (۱۶: ۸۰)

اور (دیکھو) اللہ نے تمھارے گھروں کو تمھارے لیے سکونت کی جگہ بنایا، اور جو لوگ شہروں میں نہیں بستے، ان کے لیے ایسا سامان کر دیا کہ چارپایوں کی کھال کے خیمے بنا دیئے۔ سفر اور اقامت، دونوں کی حالتوں میں انھیں ہلکا پاتے ہو۔ اسی طرح جانوروں کی اُون، روؤں اور بالوں سے طرح طرح کی چیزیں پیدا کر دیں، جن سے ایک خاص وقت تک تمھیں فائدہ پہنچتا ہے!

ایک انسان کتنی ہی محدود اور غیر متمدن زندگی رکھتا ہو، لیکن اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ اس کا گردوپیش اسے فائدہ پہنچا رہا ہے۔ ایک لکڑہارا بھی

يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا ... ہی طرح اُمتیں ہیں۔
أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ (۶:۳۸)

کائنات کی تخریب بھی تعمیر کے لیے ہے

البتہ یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ دنیا عالمِ کون وفساد ہے۔ یہاں ہر بننے کے ساتھ بگڑنا ہے، اور ہر سمٹنے کے ساتھ بکھرنا۔ لیکن جس طرح سنگ تراش کا توڑنا پھوڑنا بھی اس لیے ہوتا ہے کہ خوبی و دل آویزی کا ایک پیکر تیار کر دے، اسی طرح کائناتِ عالم کا تمام بگاڑ بھی اس لیے ہے کہ بناؤ اور خوبی کا فیضان ظہور میں آئے۔ تم ایک عمارت بناتے ہو، لیکن اس "بنانے" کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ کیا یہی نہیں ہوتا کہ بہت سی بنی ہوئی چیزیں "بگڑ" گئیں، چٹانیں اگر نہ کاٹی جاتیں، بھٹے اگر نہ سلگائے جاتے درختوں پر آرہ اگر نہ چلتا تو ظاہر ہے، عمارت کا بناؤ بھی ظہور میں نہ آتا۔ پھر یہ راحت و سکون جو تمھیں ایک عمارت کی سکونت سے حاصل ہوتا ہے، کس صورتِ حال کا نتیجہ ہے؟ یقیناً اسی شور و شر اور ہنگامۂ تخریب کا، جو سرو سامانِ تعمیر کی جدّ و جہد نے عرصہ تک جاری رکھا تھا، اگر تخریب کا یہ شور و شر نہ ہوتا، تو عمارت کا عیش و سکون بھی وجود میں نہ آتا۔ پس یہی حال فطرت کی تعمیری سرگرمیوں کا بھی سمجھو، وہ عمارتِ ہستی کا ایک گوشہ تعمیر کرتی رہتی ہے، وہ اس کارخانے کا ایک ایک کیل پرزہ ڈھالتی رہتی ہے، وہ اس کی درستگی و خوبی کی حفاظت کے لیے ہر نقصان کا دفعیہ اور ہر فساد کا ازالہ چاہتی ہے۔ تعمیر و درستگی کی یہی سرگرمیاں ہیں جو تمھیں بعض اوقات تخریب و نقصان کی ہولناکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ حالانکہ یہاں تخریب کب ہے؟ جو کچھ ہے، تعمیر ہی تعمیر ہے۔ سمندر میں تلاطم، دریا میں طغیانی،

رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ؕ (۷۴ : ۳۱) — کے لیے) جو فوجیں رکھتا ہے ان کا حال اس کے سوا کون جانتا ہے؟

پھر یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ فطرت نے کائناتِ ہستی کے افادہ و فیضان کا نظام کچھ اس طرح بنایا ہے کہ وہ بیک وقت ہر مخلوق کو یکساں طور پر نفع پہنچاتا اور ہر مخلوق کی یکساں طور پر رعایت ملحوظ رکھتا ہے۔ اگر ایک انسان اپنے عالی شان محل میں بیٹھ کر محسوس کرتا ہے کہ تمام کارخانۂ ہستی صرف اسی کی کاربرداریوں کے لیے ہے تو ٹھیک اسی طرح ایک چیونٹی بھی اپنے بل میں کہہ سکتی ہے کہ فطرت کی ساری کارفرمائیاں صرف اسی کی کاربرآریوں کے لیے ہیں، اور کون ہے جو اسے جھٹلانے کی جرأت کر سکتا ہے؟ کیا فی الحقیقت سورج اس لیے نہیں ہے کہ اس کے لیے حرارت بہم پہنچائے؟ کیا بارش اس لیے نہیں ہے کہ اس کے لیے رطوبت مہیا کرے؟ کیا ہوا اس لیے نہیں ہے کہ اس کی ناک تک شکر کی بو پہنچا دے؟ کیا زمین اس لیے نہیں ہے کہ ہر موسم اور ہر حالت کے مطابق اس کے لیے، مقام و منزل بنے؟ دراصل فطرت کی بخشائشوں کا قانون کچھ ایسا عام اور ہمہ گیر واقع ہوا ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں، ایک ہی طریقے سے، ایک ہی نظام کے ماتحت، ہر مخلوق کی نگہداشت کرتا اور ہر مخلوق کو یکساں طور پر فائدہ اٹھانے کا موقع دیتا ہے۔ حتیٰ کہ ہر وجود اپنی جگہ محسوس کر سکتا ہے کہ یہ پورا کارخانۂ عالم صرف اسی کی کام جوئیوں اور آسائشوں کے لیے سرگرم کار ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ — اور زمین کے تمام جانور (اور چرندار) بازوؤں سے اڑنے والے تمام پرند دراصل تمھاری

جمالِ فطرت

لیکن فطرت کے افادۂ فیضان کی سب سے بڑی بخشائش اس کا عالمگیر حسن وجمال ہے۔ فطرت صرف بناتی اور سنوارتی ہی نہیں، بلکہ اس طرح بناتی اور سنوارتی ہے کہ اس کے ہر بناؤ میں حسن و زیبائی کا جلوہ، اور اس کے ظہور میں نظر افروزی کی نمود پیدا ہوگئی ہے۔ کائناتِ ہستی کو اس کی مجموعی حیثیت میں دیکھو، یا اس کے ایک ایک گوشۂ خلقت پر نظر ڈالو، اس کا کوئی رُخ نہیں جس پر حُسن و رعنائی نے ایک نقاب زیبائش نہ ڈال دی ہو۔ ستاروں کا نظام اور ان کی سیر و گردش، سورج کی روشنی اور اس کی بوقلمونی، چاند کی گردش اور اس کا اُتار چڑھاؤ فضاء آسمانی کی وسعت اور اس کی نیرنگیاں، بارش کا سماں اور اس کے تغیرات، سمندر کا منظر اور دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کی بلندیاں اور وادیوں کا نشیب، حیوانات کے اجسام اور ان کا تنوّع، نباتات کی صورت آرائیاں اور باغ و چمن کی رعنائیاں، پھولوں کی عطر بیزی اور پرندوں کی نغمہ سنجی، صبح کا چہرۂ خنداں اور شام کا جلوۂ محجوب، غرضیکہ تمام تماشا گاہِ ہستی حسن کی نمائش اور نظر افروزی کی جلوہ گاہ ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس پردۂ ہستی کے پیچھے حُسن افروزی و جلوہ آرائی کی کوئی قوت کام کر رہی ہے جو چاہتی ہے کہ جو کچھ بھی ظہور میں آئے، حسن و زیبائش کے ساتھ ظہور میں آئے اور کارخانۂ ہستی کا ہر گوشہ نگاہ کے لیے نشاط، سامعہ کے لیے سُرور اور روح کے لیے بہشت راحت و سکون بن جائے!

دراصل کائناتِ ہستی کا مایۂ خمیر ہی حسن و زیبائی ہے۔ فطرت نے جس طرح اس بناؤ کے لیے مادی عناصر پیدا کیے اسی طرح اس کی خوبروئی اور رعنائی کے لیے معنوی عناصر کا بھی رنگ و روغن آراستہ کر دیا۔ روشنی، رنگ، خوشبو اور نغمہ حسن و رعنائی

پہاڑوں میں آتش افشانی، جاڑوں میں برف باری، گرمیوں میں سموم، بارش میں ہنگامۂ ابروباد، تمھارے لیے خوش آیند مناظر نہیں ہوتے لیکن تم نہیں جانتے کہ ان میں سے ہر حادثہ کائناتِ ہستی کی تعمیرو درستگی کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جس قدر دنیا کی کوئی مفید سے مفید چیز ہو سکتی ہے۔ اگر سمندر میں طوفان نہ اٹھتے، تو میدانوں کو زندگی و شادابی کے لیے ایک قطرۂ بارش میسر نہ آتا۔ اگر بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک نہ ہوتی تو بارانِ رحمت کا فیضان کبھی نہ ہوتا۔ اگر آتش فشاں پہاڑوں کی چوٹیاں نہ پھٹتیں، تو زمین کے اندر کا کھولتا ہوا مادہ اس کرہ کی تمام سطح پارہ پارہ کر دیتا۔ تم بول اٹھوگے، یہ مادّہ پیدا ہی کیوں کیا گیا لیکن تمھیں جاننا چاہیے کہ اگر یہ مادہ نہ ہوتا تو زمین کی قوتِ نشوونما کا ایک ضروری عنصر مفقود ہو جاتا۔ یہی حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے جا بجا اشارات کیے ہیں مثلاً سورۂ روم میں ہے:

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ یُرِیْکُمُ الْبَرْقَ	اور دیکھو اس کی قدرت و حکمت کی نشانیوں
خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنَزِّلُ	میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ بجلی کی چمک اور کڑک
مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ	نمودار کرتا ہے، اور اس سے تم پر خوف اور امید
بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ	دونوں کی حالتیں طاری ہو جاتی ہیں۔ اور آسمان
مَوْتِہَا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ	سے پانی برساتا ہے، اور پانی کی تاثیر سے زمین مرنے
لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ	کے بعد دوبارہ جی اٹھتی ہے بلاشبہ اس صورتِ حال
(۳۰ : ۲۴)	میں ان لوگوں کے لیے جو عقل و بینش رکھتے ہیں،
	حکمتِ الٰہی کی بڑی ہی نشانیاں ہیں!

چڑھاؤ کا کوئی پردہ چھیڑو گے، یا پیانو کی بھاری کنجیوں میں سے کوئی ایک کنجی ہی بجانے لگو گے، تو یہ نغمہ نہ ہوگا۔ بھاں بھاں کی ایک کرخت آواز ہوگی۔ یہی حال موسیقیِ فطرت کے زیروبم کا بھی ہے۔ تمھیں کوّے کی کائیں کائیں اور چیل کی چیخ میں کوئی دلکشی محسوس نہیں ہوتی، لیکن موسیقیِ فطرت کی تالیف کے لیے جس طرح قمری و بلبل کا ہلکا سُر ضروری تھا، اسی طرح زاغ و زغن کا بھاری اور کرخت سُر بھی ناگزیر تھا۔ بلبل و قمری کو اس سرگم کا اُتار سمجھو، اور زاغ و زغن کو چڑھاؤ

بر اہلِ ذوق دہر فیض دو عمی بندد — نوائے بلبل اگر نیست صوتِ زاغ شنو!

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ	ساتوں آسمان اور زمین، اور جو کوئی بھی ان
السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ	میں ہے، سب اپنی بناوٹ کی خوبی اور صنعت
فِيهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ	کے کمال میں، اللہ کی بڑائی اور پاکی کا زبانِ حال
اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ	سے اعتراف کر رہے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ کائنات
وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ	خلقت میں، کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو زبانِ حال
تَسْبِيْحَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ	سے، اس کی تسبیح و تحمید نہ کر رہی ہو، مگر افسوس
حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۵ (۱۷: ۴۴)	کہ تم اپنے جہل و غفلت سے، اس ترانہ تسبیح کو سمجھتے نہیں

فطرت کی حُسن افروزیاں اور رحمتِ الٰہی کی بخشش

آؤ چند لمحوں کے لیے پھر ان سوالات پر غور کرلیں جو پہلے گذر چکے ہیں۔ فطرتِ کائنات کی یہ تمام حُسن افروزیاں اور جلوہ آرائیاں کیوں ہیں؟ یہ کیوں ہے کہ فطرت حسین ہے، اور جو کچھ اس سے ظہور میں آتا ہے، وہ حُسن و جمال ہی ہوتا ہے؟ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ کارخانۂ ہستی ہوتا، لیکن رنگ کی نظر افروزیاں، بُو کی عطر بیزیاں، نغمہ کی جاں نوازیاں نہ ہوتیں؟ کیا ایسا نہیں ہوسکتا تھا کہ سب

کے وہ اجزاء ہیں، جن سے مشاطۂ فطرت چہرۂ وجود کی آرائش کر رہی ہے:

مشاطہ را بگو کہ براسباب حسن یار ۔۔۔ چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسد

صُنْعَ اللّٰہِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ (۲۷ : ۹۰)	یہ اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز خوبی اور درستگی کے ساتھ بنائی:
ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۙ الَّذِیْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ (۳۲ : ۶، ۷)	یہ اللہ ہے۔ محسوسات اور غیر محسوسات کا جاننے والا، طاقت والا، رحمت والا، جس نے جو چیز بنائی، حسن و خوبی کے ساتھ بنائی!

بلبل کی نغمہ سنجی اور زاغ و زغن کا شور و غوغا

بلاشبہ کاروبارِ فطرت کے بعض مظاہر ایسے بھی ہیں جن میں تمھیں حسن و خوبی کی کوئی گیرائی محسوس نہیں ہوتی۔ تم کہتے ہو قمری و بلبل کی نغمہ سنجیوں کے ساتھ زاغ و زغن کا شور و غوغا کیوں ہے؟ لیکن تم بھول جاتے ہو کہ ارغنونِ ہستی کا نغمہ کسی ایک آہنگ ہی سے نہیں بنا ہے، اور نہ بن سکتا تھا۔ جس طرح تمھارے آلاتِ موسیقی کے پردوں میں زیر و بم کے تمام آہنگ موجود ہیں، اسی طرح سازِ فطرت کے تاروں میں بھی اتار چڑھاؤ کے تمام آہنگ موجود ہیں۔ اس میں ہلکے سے ہلکے سُر بھی ہیں جن سے باریک اور سُریلی صدائیں نکلتی ہیں، موٹے سے موٹے سُر بھی ہیں جو بلند سے بلند اور بھاری سے بھاری صدائیں پیدا کرتے ہیں۔ ان تمام سُروں کے ملنے سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، وہی موسیقی کی حلاوت ہے۔ کیونکہ دنیا کی تمام چیزوں کی طرح موسیقی کی حقیقت بھی مختلف اجزاء کے امتزاج و تالیف سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی ایک ہی سُر سے نغمے کی حلاوت پیدا ہو جائے۔ اگر تم بین یا ستار اُٹھا کر صرف اس

قدرت کا خود رَو سامانِ راحت و سرور اور انسان کی ناشکری

ہم زندگی کی بناوٹی اور خود ساختہ آسائشوں میں اس درجہ منہمک ہوگئے ہیں کہ ہمیں قدرتی راحتوں پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا، اور بسا اوقات تو ہم ان کی قدر و قیمت کے اعتراف سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر چند لمحوں کے لیے اپنے آپ کو اس غفلت سے بیدار کرلیں تو معلوم ہو جائے کہ کائناتِ ہستی کا حسن و جمال فطرت کی ایک عظیم اور بے پایاں بخشش ہے، اور اگر یہ نہ ہوتی، یا ہم میں اس کا احساس نہ ہوتا، تو زندگی، زندگی نہ ہوتی، نہیں معلوم کیا چیز ہو جاتی، ممکن ہے موت کی بدحالیوں کا ایک تسلسل ہوتا۔

ایک لمحہ کے لیے تصور کرو کہ دنیا موجود ہے، مگر حسن و زیبائی کے تمام جلووں اور احساسات سے خالی ہے۔ آسمان ہے مگر فضا کی یہ نگاہ پرور نیلگونی نہیں ہے۔ ستارے ہیں مگر ان کی درخشندگی اور جہاں تابی کی یہ جلوہ آرائی نہیں ہے۔ درخت ہیں مگر بغیر سبزی کے، پھول ہیں مگر بغیر رنگ و بُو کے، اشیاء کا اعتدال، اجسام کا تناسب، صداؤں کا ترنم، روشنی و رنگت کی بوقلمونی، ان میں سے کوئی چیز بھی وجود نہیں رکھتی۔ یا یوں کہا جائے، کہ ہم میں ان کا احساس نہیں ہے۔ غور کرو، ایک ایسی دنیا کے ساتھ زندگی کا تصور کیسا بھیانک اور ہولناک منظر پیش کرتا ہے؟ ایسی زندگی جس میں نہ تو حسن کا احساس ہو نہ حسن کی جلوہ آرائی، نہ نگاہ کے لیے سرور ہے، نہ سامعہ کے لیے حلاوت نہ جذبات کی رقت ہو، نہ محسوسات کی لطافت، یقیناً عذاب و جانکاہی کی ایسی حالت ہوتی جس کا تصور بھی ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہے!

لیکن جب قدرت نے ہمیں زندگی دی، اس نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ زندگی کی سب سے بڑی نعمت یعنی حسن و زیبائی کی بخشش سے بھی مالا مال کردے،

کچھ ہوتا، لیکن سبزۂ و گل کی رعنائیاں اور قمری و بلبل کی نغمہ سنجیاں نہ ہوتیں؟ یقیناً دُنیا اپنے بننے کے لیے اس کی محتاج نہ تھی کہ تتلی کے پروں میں عجیب و غریب نقش و نگار ہوں، اور رنگ برنگ کے دلفریب پرند درختوں کی شاخوں پر چہچہا رہے ہوں؟ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ درخت ہوتے مگر قامت کی بلندی، پھیلاؤ کی موزونیت، شاخوں کی ترتیب، پتوں کی سبزی، پھولوں کی رنگا رنگی نہ ہوتی۔ پھر یہ کیوں ہو کہ تمام حیوانات اپنی اپنی حالت اور گردوپیش کے مطابق، ڈیل ڈول کی موزونیت اور اعضا کا تناسب ضرور ہی رکھیں اور کوئی وجود بھی نہ ہو، جو اپنی شکل و منظر میں ایک خاص طرح کا معتدل پیمانہ نہ رکھتا ہو؟

انسانی علم و نظر کی کاوشیں آج تک یہ عقدہ حل نہ کر سکیں، کہ یہاں تعمیر کے ساتھ تحسین کیوں ہو؟ مگر قرآن کہتا ہو کہ یہ سب کچھ اس لیے ہو کہ خالق کائنات الرَّحمٰن اور الرَّحیم ہے، یعنی اس میں رحمت ہو، اور اس کی رحمت اپنا ظہور و فعل بھی رکھتی ہو۔ رحمت کا مقتضا یہی تھا کہ بخشش ہو، فیضان ہو، جود و احسان ہو، پس اس نے ایک طرف تو ہمیں زندگی اور زندگی کے تمام احساس و عواطف بخش دیئے جو خوش نمائی اور بدنمائی میں امتیاز کرتے اور خوبی و جمال سے کیف و سرور حاصل کرتے ہیں، دوسری طرف کارگاہِ ہستی کو اپنی حُسن آرائیوں اور جاں فزائیوں سے اس طرح آراستہ کر دیا کہ اس کا ہر گوشہ نگاہ کے لیے جنّت، سامعہ کے لیے حلاوت اور روح کے لیے سرمایۂ کیف و سرور بن گیا!

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ	پس کیا ہی بابرکت ذات ہی اللہ کی بنانے والوں
الْخٰلِقِيْنَ ٥ (۲۳: ۱۴)	میں سب سے زیادہ حسن و خوبی کے ساتھ بنانے والا

رہتے ہیں، اس لیے تمھیں ان کی قدر و قیمت محسوس نہیں ہوتی۔ صبح اپنی ساری
جلوہ آرائیوں کے ساتھ روز آتی ہے، اس لیے تم بستر سے سر اُٹھانے کی ضرورت محسوس
نہیں کرتے۔ چاندنی اپنی ساری حسن افروزیوں کے ساتھ ہمیشہ نکھرتی رہتی ہے۔
اس لیے تم کھڑکیاں بند کر کے سو جاتے ہو۔ لیکن جب کبھی شب و روز کے جلوہ ہائے
فطرت تمھاری نظروں سے روپوش ہو جاتے ہیں، یا تم میں ان کے نظارہ و سماع
کی استعداد باقی نہیں رہتی، تو غور کرو، اس وقت تمھارے احساسات کا کیا
حال ہوتا ہے؟ کیا تم محسوس نہیں کرتے کہ ان میں سے ہر چیز زندگی کی ایک بے بہا
برکت اور معیشت کی ایک عظیم الشان نعمت تھی؟ سرد ملکوں کے باشندوں سے
پوچھو، جہاں سال کا بڑا حصہ ابر آلود گذرتا ہے، کیا سورج کی کرنوں سے بڑھ کر بھی
زندگی کی کوئی مسرت ہو سکتی ہے؟ ایک بیمار سے پوچھو جو نقل و حرکت سے محروم بستر
مرض پر پڑا ہے۔ وہ بتائے گا کہ آسمان کی صاف اور نیلگوں فضا کا ایک نظارہ،
راحت و سکون کی کتنی بڑی دولت ہے؟ ایک اندھا جو کہ پیدائشی اندھا نہ تھا تمھیں
بتا سکتا ہے کہ سورج کی روشنی اور باغ و چمن کی بہار دیکھے بغیر زندگی بسر کرنا کیسی
ناقابلِ برداشت مصیبت ہے؟ تم بسا اوقات زندگی کی مصنوعی آسائشوں کے
لیے ترستے ہو، اور خیال کرتے ہو کہ زندگی کی سب سے بڑی نعمت چاندی سونے کا ڈھیر اور
جاہ و حشم کی نمائش ہے لیکن تم بھول جاتے ہو کہ زندگی کی حقیقی مسرتوں کا جو خودرو سامان فطرت
نے ہر مخلوق کے لیے پیدا کر رکھا ہے، اس سے بڑھ کر دنیا کی دولت و حشمت کیا انساط
نشاط مہیا کر سکتی ہے؟ اور اگر انسان کو وہ سب کچھ میسر ہو تو پھر اس کے بعد کیا باقی رہ
جاتا ہے؟ جس دنیا میں سورج ہر روز چمکتا ہو، جس دنیا میں صبح ہر روز مسکراتی اور شام
ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو، جس کی راتیں آسمان کی قندیلوں سے مزین

اُس نے ایک ہاتھ سے ہمیں حسن کا احساس دیا۔ دوسرے ہاتھ سے تمام دنیا کو جلوۂ حسن بنا دیا۔ یہی حقیقت ہے جو ہمیں رحمت کی موجودگی کا یقین دلاتی ہے اگر پردۂ ہستی کے پیچھے صرف خالقیت ہی ہوتی، رحمت نہ ہوتی، یعنی پیدا کرنے یا پیدا ہو جانے کی قوت ہوتی، مگر افادۂ فیضان کا ارادہ نہ ہوتا، تو یقیناً کائناتِ ہستی میں فطرت کے فضل و احسان کا یہ عالمگیر مظاہرہ بھی نہ ہوتا۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ	کیا تم نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ جو
لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا	کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے
فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ	وہ سب تمھارے لیے خدا نے مسخر کر دیا ہے
نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً	اور اپنی تمام نعمتیں، ظاہری طور پر بھی اور باطنی
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ	طور پر بھی، پوری کر دی ہیں؟ انسانوں میں
فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا	کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں
هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ	جھگڑتے ہیں، بغیر اس کے کہ ان کے پاس
مُّنِيْرٍ (۳۱: ۲۰)	کوئی علم ہو، یا ہدایت ہو، یا کوئی کتاب روشن۔

انسانی طبیعت کی یہ عالمگیر کمزوری ہے کہ جب تک وہ ایک نعمت سے محروم نہیں ہو جاتا، اس کی قدر و قیمت کا ٹھیک اندازہ نہیں کر سکتا۔ تم گنگا کے کنارے بستے ہو، اس لیے تمھارے نزدیک کی سب سے زیادہ بے قدر چیز پانی ہے، لیکن اگر یہی پانی چوبیس گھنٹے تک میسر نہ آئے تو تمھیں معلوم ہو جائے اس کی قدر و قیمت کا کیا حال ہے؟ یہی حال فطرت کے فیضانِ جمال کا بھی ہے۔ اس کے عام اور بے پردہ جلوے شب و روز تمھاری نگاہوں کے سامنے سے گزرتے

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ	اور (دیکھو) یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ تم اپنی
اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّجَعَلَ	ماؤں کے شکم سے پیدا ہوتے ہو اور کسی طرح کی
لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ	سمجھ بوجھ تم میں نہیں ہوتی، لیکن اس نے تمہارے
وَالْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ	لیے دیکھنے سننے کے حواس بنا دیئے اور سوچنے
(۱۶ : ۷۸)	سمجھنے کے لیے عقل دے دی تاکہ اس کی نعمت کے شکرگزار ہو!

کائناتِ ہستی کے اسرار و غوامض بے شمار ہیں۔ لیکن روحِ حیوانی کا جوہر ادراک زندگی کا سب سے زیادہ لاینحل عقدہ ہے۔ حیوانات میں کیڑے مکوڑے تک ہر طرح کا احساس و ادراک رکھتے ہیں، اور انسانی دماغ کے نہاں خانہ میں عقل و تفکّر کا چراغ روشن ہے۔ یہ قوتِ احساس، یہ قوتِ ادراک، یہ قوتِ عقل کیونکر پیدا ہوتی ہے؟ مادی عناصر کی ترکیب و امتزاج سے ایک ماورائے مادّہ جوہر کس طرح ظہور میں آگیا ہے؟ چیونٹی کو دیکھو، اس کے دماغ کا حجم سوئی کی نوک سے شاید ہی کچھ زیادہ ہوگا، لیکن مادّے کے اس حقیر ترین عصبی ذرّہ میں بھی احساس و ادراک، محنت و استقلال ترتیب و تناسب، نظم و ضبط، اور صنعت و اختراع کی ساری قوتیں مخفی ہوتی ہیں۔ اور وہ اپنے اعمالِ حیات کی کرشمہ سازیوں سے ہم پر رعب اور حیرت کا عالم طاری کر دیتی ہے۔ شہد کی مکھی کی کارفرمائیاں ہر روز تمہاری نظروں سے گذرتی رہتی ہیں۔ یہ کون ہے، جس نے ایک چھوٹی سی مکھی میں تعمیر و تحسین کی ایسی منتظم قوت پیدا کر دی ہے؟ قرآن کہتا ہے، یہ اس لیے ہے کہ رحمت کا مقتضا جمال تھا، اور ضروری تھا کہ جس طرح اس نے جمال سے دنیا آراستہ کر دی ہے، اسی طرح جمالِ معنوی کی بخشائشوں سے بھی اسے مالا مال کر دیتی!

اور جس کی چاندنی حسن افروزیوں سے جہان تاب رہتی ہو، جس کی بہار سبزہ و گل سے لدی ہوئی اور جس کی فصلیں لہلہاتے ہوئے کھیتوں سے گرانبار ہوں، جس دنیا میں روشنی اپنی چمک، رنگ، اپنی بوقلمونی، خوشبو، اپنی عطر بیزی اور موسیقی اپنا نغمہ و آہنگ رکھتی ہو، کیا اس دنیا کا کوئی باشندہ آسائش حیات سے محروم اور نعمتِ معیشت سے مفلس ہو سکتا ہے؟ کیا کسی آنکھ کے لیے جو دیکھ سکتی ہو، اور کسی دماغ کے لیے جو محسوس کر سکتا ہو، ایک ایسی دنیا میں نامرادی و بدبختی کا گلہ جائز ہے؟ قرآن نے جا بجا انسان کو اس کے اسی کفرانِ نعمت پر توجہ دلائی ہے۔

وَآتَاكُم مِّن كُلِّ مَا	اور اس نے تمھیں وہ تمام چیزیں دیدیں جو تمھیں
سَأَلْتُمُوهُ وَإِن تَعُدُّوا	مطلوب تھیں۔ اور اگر اللہ کی نعمتیں شمار کرنی
نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا	چاہو تو وہ اتنی ہیں کہ کبھی شمار نہیں کر سکو گے
إِنَّ الْإِنسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ	بلاشبہ انسان بڑا ہی ناانصاف، بڑا ہی ناشکر
(۱۴ : ۳۴)	ہے!

جمالِ معنوی پھر فطرت کی بخشائشِ جمال کے اس گوشے پر بھی نظر ڈالو کہ اس نے جس طرح جسم و صورت کو حسن و زیبائی بخشی، اسی طرح اس کی معنویت کو بھی جمالِ معنوی سے آراستہ کر دیا۔ جسم و صورت کا جمال یہ ہے کہ ہر وجود کے ڈیل ڈول اور اعضاء و جوارح میں تناسب ہو۔ معنویت کا جمال یہ ہے کہ ہر چیز کی کیفیت اور باطنی قویٰ میں اعتدال ہو۔ اسی کیفیت کے اعتدال سے خواص اور فوائد پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہی اعتدال ہے جس نے حیوانات میں ادراک و حواس کی قوتیں بیدار کر دیں اور پھر انسان کے درجہ میں پہنچ کر جوہر عقل و فکر کا چراغ روشن کر دیا:

جاتا ہے، خالص سونا باقی رہ جاتا ہے - یہی مثال فطرت کے انتخاب کی ہے، کھوٹ میں نفع نہ تھا، نابود کر دیا گیا، سونے میں نفع تھا، باقی رہ گیا:

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً	خدا نے آسمان سے پانی برسایا تو ندی نالوں میں
فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا	جس قدر سمائی تھی، اس کے مطابق بہ نکلے، اور جس
فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا	قدر کوڑا کرکٹ جھاگ بن کر اوپر آ گیا تھا، اُسے
رَّابِيًا ۭ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ	سیلاب اُٹھا کر بہالے گیا - اسی طرح جب زیور یا اور
عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاۗءَ	کسی طرح کا سامان بنانے کے لیے (مختلف قسم کی
حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ	دھاتیں) آگ میں تپاتے ہیں، تو اس میں بھی جھاگ
مِّثْلُهٗ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ	اُٹھتا ہے اور میل کٹ کر نکل جاتی ہے - اسی طرح اللہ
اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ڛ	حق اور باطل کی مثال بیان کر دیتا ہے - جھاگ
فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ	رائیگاں جائے گا کیونکہ اس میں نفع نہ تھا، جس
جُفَاۗءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ (۱۷ : ۱۳)	چیز میں انسان کے لیے نفع ہو گا، وہ زمین میں
النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۭ	باقی رہ جائے گی

تدریج و امہال

پھر اگر دقّتِ نظر سے کام لو، تو افادۂ فیضانِ فطرت کی حقیقت کچھ انہی مظاہر پر موقوف نہیں ہے، بلکہ کارخانۂ ہستی کے تمام اعمال و قوانین کا یہی حال ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ فطرت کے تمام قوانین اپنی نوعیت میں کچھ اس طرح واقع ہوئے ہیں کہ اگر لفظوں میں اسے تعبیر کرنا چاہو تو صرف فطرت کے فضل و رحمت ہی سے تعبیر

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ	یہ محسوسات اور غیر محسوسات کا جاننے والا عزیز و
الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۙ الَّذِي أَحْسَنَ	رحیم ہو جس نے جو چیز بھی بنائی حسن و خوبی کے
كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ	ساتھ بنائی۔ چنانچہ یہ اسی کی قدرت و حکمت ہو کہ
الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ ۚ ثُمَّ جَعَلَ	انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی، پھر اس کے
نَسْلَهُ مِنْ سُلٰلَةٍ مِنْ مَاءٍ	توالد و تناسل کا سلسلہ (خون کے) خلاصہ سے
مَهِينٍ ۚ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيهِ	جو پانی کا ایک حقیر سا قطرہ ہوتا ہو، قائم کر دیا پھر
مِنْ رُوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ	اس کی تمام قوتوں کی درستگی کی اور اپنی روح
وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۚ قَلِيلًا	میں سے ایک قوت) پھونک دی اور (اس طرح)
مَا تَشْكُرُونَ ۞ (۳۲: ۹،۶)	اس کے لیے سننے، دیکھنے اور فکر کرنے کی قوتیں پیدا

کر دیں لیکن افسوس انسان کی غفلت پر! بہت کم ایسا ہوتا ہو کہ وہ (اللہ کی رحمت کا) شکر گذار ہو!

بقاء انفع لیکن کائنات ہستی کا یہ بناؤ، یہ حسن، یہ ارتقاء قائم نہیں رہ سکتا تھا، اگر اس میں خوبی کے بقا اور خرابی کے ازالے کے لیے ایک اٹل قوت سرگرم کار نہ رہتی۔ یہ قوت کیا ہو؟ فطرت کا انتخاب ہو۔ فطرت ہمیشہ چھانٹتی رہتی ہو، وہ ہر گوشہ میں صرف خوبی اور بہتری ہی باقی رکھتی ہو۔ فساد اور نقص محو کر دیتی ہو۔ ہم فطرت کے اس انتخاب سے بے خبر نہیں ہیں۔ ہم اسے "بقاء اصلح" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ "اصلح" یعنی FITTEST لیکن قرآن "بقاءِ اصلح" کی جگہ "بقاءِ انفع" کا ذکر کرتا ہو۔ وہ کہتا ہو، اس کارگاہِ فیضان و جمال میں صرف وہی چیز باقی رکھی جاتی ہے جس میں نفع ہو۔ کیونکہ یہاں رحمت کارفرما ہو، اور رحمت چاہتی ہو کہ افادہ و فیضان ہو۔ وہ نقصان و ہستی گوارا نہیں کر سکتی۔ تم سونا کٹھالی میں ڈال کر آگ پر رکھتے ہو۔ کھوٹ جل

رکھتی ہی، اور آنے والے نتائج سے خبردار کرتی رہتی ہی۔ زندگی اور موت کے قوانین پر غور کرو۔ کس طرح زندگی بتدریج نشو و نما پاتی، اور کس طرح درجہ بدرجہ مختلف منزلوں سے گذرتی ہی۔ اور پھر کس طرح موت کمزوری و فساد کا ایک طول طویل سلسلہ ہے جو اپنے ابتدائی نقطوں سے شروع ہوتا، اور یکے بعد دیگرے مختلف منزلیں طے کرتا ہوا آخری نقطۂ بلوغ تک پہنچا کرتا ہی؟ تم بدپرہیزی کرتے ہو تو یہ نہیں ہوتا کہ فوراً ہی ہلاک ہو جاؤ، بلکہ بتدریج موت کی طرف بڑھنے لگتے ہو، اور بالآخر ایک خاص مدت کے اندر، جو ہر صورتِ حال کے لیے یکساں نہیں ہوتی، درجہ بدرجہ اُترتے ہوئے موت کے آغوش میں جا گرتے ہو۔ نباتات کو دیکھو درخت اگر آبیاری سے محروم ہو جاتے ہیں، یا نقصان و فساد کا کوئی دوسرا سبب عارض ہو جاتا ہی، تو یہ نہیں ہوتا کہ ایک ہی دفعہ مرجھا کر رہ جائیں۔ یا کھڑے کھڑے اچانک گر جائیں بلکہ بہ تدریج شادابی کی جگہ پژمردگی کی حالت طاری ہونا شروع ہو جاتی ہی، اور پھر ایک خاص مدت کے اندر جو مقرر کر دی گئی ہی، یا تو بالکل مرجھا کر رہ جاتے ہیں، یا جڑ کھوکھلی ہو کر گر پڑتے ہیں۔

اصطلاح قرآنی میں "اجل"

یہی حال کائنات کے تمام تغیرات و انفعالات کا ہی کوئی تغیر ایسا نہیں جو اپنا تدریجی دور نہ رکھتا ہو۔ ہر چیز بتدریج بنتی ہی، اور اسی طرح بتدریج بگڑتی ہی۔ بناؤ ہو یا بگاڑ، ممکن نہیں کہ ایک خاص مدت گذرے بغیر کوئی حالت بھی اپنی کامل صورت میں ظاہر ہو سکے۔ یہ مدت جو ہر حالت کے ظہور کے لیے اس کی "اجل" یعنی مقررہ وقت ہی۔ مختلف گوشوں اور مختلف حالتوں میں مختلف مقدار رکھتی ہی، اور بعض حالتوں میں اس کی مقدار اتنی طویل ہوتی ہی کہ ہم اپنے

کر سکتے ہو۔ تمھیں اور کوئی تعبیر نہیں ملے گی۔ مثلاً اس کے قوانین کا عمل کبھی فوری اور اچانک نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ کرتی ہو، آہستہ آہستہ بتدریج کرتی ہے۔ اور اس تدریجی طرزِ عمل نے دنیا کے لیے مہلت اور ڈھیل کا فائدہ پیدا کر دیا ہے۔ یعنی اس کا ہر قانون فرصتوں پر فرصتیں دیتا ہو، اور اس کا ہر فعل عفو و درگذر کا دروازہ آخر تک کھلا رکھتا ہو۔ بلاشبہ اس کے قوانین اپنے نفاذ میں اٹل ہیں، ان میں ردّ و بدل کا امکان نہیں:

مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ — ہمارے یہاں جو بات ایک مرتبہ ٹھہرا دی گئی، اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی!
(۵۰ : ۲۸)

اور اس لیے تم خیال کرنے لگتے ہو کہ ان کی قطعیت بے رحمی سے خالی نہیں، لیکن تم نہیں سوچتے کہ جو قوانین اپنے نفاذ میں اس درجہ قطعی اور بے پروا ہیں، وہی اپنی نوعیت میں کس درجہ عفو و درگذر اور مہلت بخشی و اصلاح کوشی کی روح بھی رکھتے ہیں؟ اسی لیے آیتِ مندرجہ صدر میں "مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ" کے بعد ہی فرمایا:

وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ — لیکن یہ بھی نہیں ہو کہ ہم بندوں کے لیے زیادتی کرنے والے ہوں!
(۵۰ : ۲۸)

فطرت اگر چاہتی ہے تو ہر حالت بیک دفعہ ظہور میں آجاتی۔ یعنی اس کے قوانین کا نفاذ فوری اور ناگہانی ہوتا، لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ ایسا نہیں ہوتا۔ ہر حالت ہر تاثیر، ہر انفعال کے ظہور و بلوغ کے لیے ایک خاص مدت مقرر کر دی گئی ہو اور ضروری ہو کہ بتدریج مختلف منزلیں پیش آئیں۔ پھر ہر منزل اپنے آثار و انداز

درگذر کرنے اور ایک خاص مدت تک فرصتِ حیات بخشنے سے تعبیر کرتا ہے، اور کہتا ہے یہ اس لیے ہے کہ کائناتِ ہستی میں فضل و رحمت کی مشیت کام کر رہی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ ہر غلطی کو درستگی کے لیے، ہر نقصان کو تلافی کے لیے، ہر لغزش کو سنبھل جانے کے لیے، زیادہ سے زیادہ مہلتِ اصلاح ملتی رہے، اور اس کا دروازہ کسی پر بند نہ ہو۔

تاخیرِ اجل

وہ کہتا ہے، اگر تدریج و امہال کی یہ فرصتیں اور بخششیں نہ ہوتیں تو دنیا میں ایک وجود بھی فرصتِ حیات سے فائدہ نہ اٹھا سکتا۔ ہر غلطی، ہر کمزوری، ہر نقصان، ہر فساد، اچانک، یک دفعہ بربادی و ہلاکت کا باعث ہو جاتا۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ	اور انسان جو کچھ اپنے اعمال سے کمائی کرتا ہے اگر
بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى	اللہ اس پر فوراً مواخذہ کرتا تو یقین کرو زمین کی سطح
ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ	پر ایک جاندار بھی باقی نہ رہتا لیکن یہ اس کی رحمت ہے
يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ	کہ اس نے ایک مقررہ وقت تک فرصتِ حیات
مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ	دے رکھی ہے۔ البتہ جب وہ مقررہ وقت آجائے گا تو
اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ	پھر یاد رہے کہ اللہ اپنے بندوں کے اعمال سے
بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ؏	بے خبر نہیں ہے اس کی آنکھیں ہر وقت اور ہر حال میں
(۳۵ : ۴۵)	سب کچھ دیکھ رہی ہیں!

تدریج و امہال اچھائی اور برائی دونوں کے لیے ہے

قدرتی طور پر یہ ڈھیل اچھائی اور برائی دونوں کے لیے ہے۔ اچھائی کے لیے اس لیے تاکہ زیادہ نشو و نما پائے۔ برائی کے لیے اس لیے تاکہ متنبہ اور خبردار ہو کر اصلاح و تلافی کا سامان کرلے

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ	ان لوگوں کو بھی، اور ان لوگوں کو بھی یعنی

نظامِ اوقات سے اس کا حساب بھی نہیں لگا سکتے۔ قرآن نے اسے یوں تعبیر کیا ہے کہ جس مدت کو تم اپنے حساب میں ایک دن سمجھتے ہو، اگر اسے ایک ہزار برس یا پچاس ہزار برس تصور کر لو تو ایسے دنوں سے جو مہینے اور برس بنیں گے، ان کی مقدار کتنی ہو گی؟

وَإِنَّ يَوْمًا عِندَ رَبِّكَ — اور بلا شبہ تمہارے پروردگار کے حساب میں
كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ — ایک دن ایسا ہے، جیسے تمہارے حساب میں
(٢٢ : ٤٧) — ایک ہزار برس!

تکویر — فطرت کا یہی تدریجی طرزِ عمل ہے جسے قرآن نے "تکویر" سے بھی تعبیر کیا ہے۔ یعنی لپیٹنے سے۔ وہ کہتا ہے، بجائے اس کے کہ اچانک دن کی روشنی نکل آتی اور ناگہاں رات کی اندھیری اُبل پڑتی، فطرت نے رات اور دن کے ظہور کو اس طرح تدریجی بنا دیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے، رات آہستہ آہستہ دن پر لپٹتی جاتی ہے، اور دن درجہ بدرجہ رات پر لپٹتا آتا ہے:

خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ — اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حکمت و مصلحت
بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ اللَّيْلَ عَلَى — کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس نے رات اور دن کے یکے بعد
النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ — دیگرے آتے رہنے کا ایسا انتظام کر دیا کہ رات دن پر
عَلَى اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ — لپٹتی جاتی ہے، اور دن رات پر لپٹتا آتا ہے۔ اور سورج
وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ — اور چاند، دونوں کو اس کی قدرت نے ایک خاص انتظام
مُّسَمًّى — کے ماتحت مسخّر کر رکھا ہے۔ سب اپنی اپنی جگہ
(٣٩ : ٥) — اپنے مقررہ وقت تک کے لیے حرکت میں ہیں!

قرآن اس تدریجی رفتارِ عمل کو فائدہ اُٹھانے کا موقع دینے، ڈھیل دینے، عفو و

تسکینِ حیات

زندگی کی محنتیں اور کاوشیں

یا مثلاً ہم دیکھتے ہیں، انسان کی معیشت، قیام و بقا کی جد و جہد اور کشاکش کا نام ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر اس کا ہر گوشہ طرح طرح کی محنتوں اور کاوشوں سے گھرا ہوا ہے، اور بحیثیت مجموعی زندگی اضطراری ذمہ داریوں کا بوجھ اور مسلسل مشقتوں کی آزمائش ہے

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ (۹۰ : ۴)

بلاشبہ ہم نے انسان کو اس طرح بنایا ہے کہ اس کی زندگی مشقتوں سے گھری ہوئی ہے

مشغولیت اور انہماک

لیکن با این ہمہ فطرت نے کارخانۂ معیشت کا ڈھنگ کچھ اس طرح کا بنا دیا ہے اور طبیعتوں میں کچھ اس طرح کی خواہشیں، ولولے اور انفعالات ودیعت کر دیئے ہیں کہ زندگی کے ہر گوشے میں ایک عجیب طرح کی دل بستگی، مشغولیت، ہماہمی اور سرگرمی پیدا ہو گئی ہے، اور یہی زندگی کا انہماک ہے جس کی وجہ سے ہر فرد حیات نہ صرف زندگی کی مشقتیں برداشت کر رہا ہے بلکہ انہی مشقتوں میں زندگی کی بڑی سے بڑی لذت و راحت محسوس کرتا ہے۔ یہ مشقتیں جس قدر زیادہ ہوتی ہیں، اتنی ہی زیادہ زندگی کی دلچسپی اور محبوبیت بھی بڑھ جاتی ہے۔ اگر ایک انسان کی زندگی ان مشقتوں سے خالی ہو جائے، تو وہ محسوس کرے گا کہ زندگی کی ساری لذتوں سے محروم ہو گیا، اور اب زندہ رہنا اس کے لیے ناقابل برداشت بوجھ ہے۔

حالات متفاوت ہیں، لیکن زندگی کی دل بستگی اور سرگرمی سب کے لیے ہے

پھر دیکھو، کارساز فطرت کی یہ کیسی کرشمہ سازی ہے کہ حالات متفاوت ہیں، طبائع متنوع ہیں،

مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ○ (۱۷ : ۲۱)

اچھوں کو بھی اور بُروں کو بھی) سب کو تمہارے پروردگار کی بخشش میں سے حصہ مل رہا ہے اور تمہارے پروردگار کی بخشش کسی پر بند نہیں!

اگر قوانینِ فطرت کی ان مہلت بخشیوں سے فائدہ اُٹھا کر نقصان و فساد کی اصلاح کرلی جائے۔ مثلاً تم نے بدپرہیزی کی تھی، اُسے ترک کردو، تو پھر اسی فطرت کا یہ بھی قانون ہے کہ اصلاح و تلافی کی ہر کوشش قبول کرلیتی ہے اور نقصان و فساد کے جو نتائج نشوونما پانے لگے تھے ان کا مزید نشوونما فوراً رک جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ اگر اصلاح بروقت اور ٹھیک ٹھیک کی گئی ہے، تو پچھلے مضر اثرات بھی محو ہو جائیں گے اور اس طرح محو ہو جائیں گے، گویا کوئی خرابی پیش ہی نہیں آئی تھی۔ لیکن اگر فطرت کی تمام مہلت بخشیاں رائگاں گئیں اس کا بار بار اور درجہ بدرجہ انذار بھی کوئی نتیجہ پیدا نہ کرسکا تو پھر بلاشبہ وہ آخری حد نمودار ہو جاتی ہے جہاں پہنچ کر فطرت کا آخری فیصلہ صادر ہو جاتا ہے۔ اور پھر جب اس کا فیصلہ صادر ہو جائے تو نہ تو اس میں چشم زدن کی تاخیر ہو سکتی ہے، نہ کسی حال میں بھی تزلزل اور تبدیلی:

فَإِذَا جَآءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ○ (۱۶ : ۶۱)

پھر جب ان کا مقررہ وقت آگیا تو اس سے نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں، اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں (یعنی نہ تو اس کے نفاذ میں تاخیر ہو سکتی ہے، نہ تقدیم، ٹھیک ٹھیک اپنے وقت میں اُسے ہو جانا ہے)

دل کا ایک ایک ریشہ زندگی کے سب سے بڑے احساسِ مسرت سے معمور ہو جاتا ہے!
پھر کاروبارِ فطرت کے یہ تصرفات دیکھو کہ کس طرح نوعِ انسانی کے منتشر افراد اجتماعی زندگی کے بندھنوں سے باہم دِگر مربوط کر دیئے گئے ہیں۔ اور کس طرح صلۂ رحمی کے رشتہ نے ہر فرد کو سینکڑوں ہزاروں افراد کے ساتھ جوڑ رکھا ہے؟
فرض کرو، زندگی و معیشت ان تمام موثرات سے خالی ہوتی۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ خالی نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے کہ فطرتِ کائنات میں رحمت کار فرما ہے، اور رحمت کا مقتضا یہی تھا کہ معیشت کی مشقتوں کو خوش گوار بنا دے، اور زندگی کے لیے تسکین و راحت کا سامان پیدا کر دے۔ یہ رحمت کی کرشمہ سازیاں ہیں جنھوں نے رنج میں راحت، الم میں لذت اور سختیوں میں دل پذیری کی کیفیت پیدا کر دی ہے!

اشیاء و مناظر کا اختلاف و تنوّع اور تسکینِ حیات

چنانچہ قرآن نے تسکینِ حیات کے مختلف پہلوؤں پر جا بجا توجہ دلائی ہے۔ ازاں جملہ کائناتِ خلقت کے مناظر و اشیاء کا اختلاف و تنوّع ہے۔ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ یکسانی سے اُکتا تی ہے اور تبدیلی و تنوّع میں خوشگواری و کیفیت محسوس کرتی ہے۔ پس اگر کائناتِ ہستی میں محض یکسانی و یک رنگی ہی ہوتی، تو یہ دلچسپی اور خوشگواری پیدا نہ ہو سکتی جو اس کے ہر گوشہ میں ہمیں نظر آ رہی ہے۔ اوقات کا اختلاف، موسموں کا اختلاف، خشکی و تری کا اختلاف، مناظرِ طبیعت اور اشیاء خلقت کا اختلاف، جہاں بے شمار مصلحتیں اور فوائد رکھتا ہے، وہاں ایک بڑی مصلحت دنیا کی زیب و زینت اور معیشت کی تسکین و راحت بھی ہے:

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن　　اے ذوق اس جہاں میں ہے زیب اختلاف سے

اشغال مختلف ہیں، اغراض متضاد ہیں، لیکن معیشت کی دل بستگی اور سرگرمی سب کے لیے یکساں ہے، اور سب ایک ہی طرح اس کی مشغولیتوں کے لیے جوش و طلب رکھتے ہیں۔ مرد و عورت، طفل و جوان، امیر و فقیر، عالم و جاہل، قوی و ضعیف، تندرست و بیمار، مجرّد و متاہل، حاملہ و مرضعہ، سب اپنی اپنی حالتوں میں منہمک ہیں، اور کوئی نہیں جس کے لیے زندگی کی کاوشوں میں محویت نہ ہو۔ امیر اپنے محل کے عیش و نشاط میں اور فقیر اپنی بے سر و سامانیوں کی فاقہ مستی میں زندگی بسر کرتا ہے، لیکن دونوں کے لیے زندگی کی مشغولیتوں میں دل بستگی ہوتی ہے۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کون زیادہ مشغول ہے۔ ایک تاجر جس انہماک کے ساتھ اپنی لاکھوں روپیہ کی آمدنی کا حساب کرتا ہے، اسی طرح ایک مزدور بھی دن بھر کی محنت کے چند پیسے گن لیا کرتا ہے، اور دونوں کے لیے زندگی یکساں طور پر محبوب ہوتی ہے۔ ایک حکیم کو دیکھو جو اپنے علم و دانش کی کاوشوں میں غرق ہے اور ایک دہقان کو دیکھو جو دوپہر کی دھوپ میں برہنہ سر ہل جوت رہا ہے، اور پھر بتاؤ کس کے لیے زندگی کی مشغولیتوں میں زیادہ دل بستگی ہے؟

پھر دیکھو، بچے کی پیدائش ماں کے لیے کیسی جانکاہی مصیبت ہوتی ہے؟ اس کی پرورش و نگرانی کس طرح خود فروشانہ مشقتوں کا ایک طول طویل سلسلہ ہے؟ تاہم یہ سارا معاملہ کچھ ایسی خواہشوں اور جذبوں کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے کہ ہر عورت میں ماں بننے کی قدرتی طلب ہے، اور ہر ماں پرورش اولاد کے لیے مجنونانہ خود فراموشی رکھتی ہے۔ وہ زندگی کا سب سے بڑا دُکھ سہے گی اور پھر اسی دُکھ میں زندگی کی سب سے بڑی مسرت محسوس کرے گی! وہ جب اپنی معیشت کی ساری راحتیں قربان کر دیتی ہے اور اپنی رگوں کے خون کا ایک ایک قطرہ دودھ بنا کر پلا دیتی ہے، تو اس کے

دن کی مختلف حالتیں اور رات کی مختلف منزلیں

پھر رات اور دن کا اختلاف صرف رات اور دن ہی کا اختلاف نہیں ہے بلکہ ہر دن مختلف حالتوں سے گذرتا، اور ہر رات مختلف منزلیں طے کرتی ہے اور ہر حالت ایک خاص طرح کی تاثیر رکھتی ہے اور ہر منزل کے لیے ایک خاص طرح کا منظر ہوتا ہے۔ صبح طلوع ہوتی ہے، اور اس کی ایک خاص تاثیر ہوتی ہے، دن ڈھلتا ہے اور اس کا ایک خاص منظر ہوتا ہے۔ اوقات کا یہ روزانہ اختلاف ہمارے احساسات کا ذائقہ بدلتا رہتا ہے، اور یکسانیت کی افسردگی کی جگہ تبدل و تجدد کی لذت اور سرگرمی پیدا ہوتی رہتی ہے!

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَ	پس پاکی ہے اللہ کے لیے، اور آسمانوں اور
حِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي	زمین میں اس کیلیے ستائش ہے۔ جبکہ تم پر
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ	شام آتی ہے، جب تم پر صبح ہوتی ہے، جب
تُظْهِرُوْنَ ۝ (۳۰ : ۱۶)	دن کا آخری وقت ہوتا ہے اور جب تم پر دوپہر آتی ہے!

حیوانات کا اختلاف

اسی طرح انسان خود اپنے وجود کو دیکھے اور تمام حیوانات کو دیکھے فطرت نے کس طرح طرح طرح کے اختلافات سے اس میں تنوع اور دلپذیری پیدا کر دی ہے؟

وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْاَنْعَامِ	اور انسان، جانور، چارپائے، طرح طرح
مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ! (۳۵ : ۲۸)	کی رنگتوں کے!

نباتات

عالم نباتات کو دیکھو۔ درختوں کے مختلف ڈیل ڈول ہیں، مختلف رنگتیں ہیں، مختلف خوشبوئیں ہیں، مختلف خواص ہیں، اور پھر دانہ اور پھل کھاؤ تو مختلف قسم کے ذائقے ہیں:

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا	کیا ان لوگوں نے کبھی زمین پر نظر نہیں ڈالی

اختلافِ لیل و نہار

چنانچہ اسی سلسلہ میں وہ رات اور دن کے اختلاف کا ذکر کرتا ہے، اور کہتا ہے، اگر غور کرو تو اس اختلاف میں حکمتِ الٰہی کی کتنی ہی نشانیاں پوشیدہ ہیں۔ یہ بات کہ شب و روز کی آمد و شد کی دو مختلف حالتیں ٹھہرا دی گئی ہیں اور وقت کی نوعیت ہر معین مقدار کے بعد بدلتی رہتی ہے، زندگی کے لیے بڑی ہی تسکین و دلبستگی کا ذریعہ ہے، اگر ایسا نہ ہوتا، اور وقت ہمیشہ ایک ہی حالت پر برقرار رہتا، تو دنیا میں زندہ رہنا دشوار ہو جاتا۔ اگر تم قطبین کے اطراف میں جاؤ جہاں روز و شب کا اختلاف اپنی نمود نہیں رکھتا، تو تمھیں معلوم ہو جائے کہ یہ اختلاف گذرانِ حیات کے لیے کیسی عظیم الشان نعمت ہے:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور
وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ	رات دن کے ایک کے بعد ایک آتے رہنے میں
لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ	اربابِ دانش کے لیے حکمتِ الٰہی کی بڑی ہی
(۳ : ۱۸۷)	نشانیاں ہیں!

رات اور دن کے اختلاف نے معیشت کو دو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، دن کی روشنی جد و جہد کی سرگرمی پیدا کرتی ہے، اور رات کی تاریکی راحت و سکون کا بستر بچھا دیتی ہے۔ ہر دن کی محنت کے بعد رات کا سکون ہوتا ہے اور ہر رات کے سکون کے بعد نئے دن کی نئی سرگرمی!

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ	اور (دیکھو) یہ اس کی رحمت کی کارسازی ہے کہ
لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ	تمھارے لیے رات اور دن (الگ الگ) ٹھہرا دیئے گئے
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۲۸ : ۷۳)	تاکہ رات کے وقت راحت پاؤ، اور دن میں اس کا فضل تلاش کرو (یعنی کاروبارِ معیشت میں سرگرم ہو)

کے لیے مادہ ہے، مرد کے لیے عورت ہے، زندگی کے لیے موت ہے![1]

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ	اور ہر چیز میں ہم نے جوڑے پیدا کر دیئے
لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (۵۱ : ۴۹)	(یعنی دو دو اور متقابل اشیاء پیدا کیں)
سُبْحٰنَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ	پاکی اور برتری ہو اس ذات کے لیے جس نے
كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ	زمین کی پیداوار میں اور انسان میں اور
أَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ	ان تمام مخلوقات میں جن کا انسان کو علم
(۳۶ : ۳۶)	نہیں، دو دو اور متقابل چیزیں پیدا کیں

مرد اور عورت یہی قانونِ فطرت ہے جس نے انسان کو دو مختلف جنسوں یعنی مرد اور عورت میں تقسیم کر دیا، اور پھر ان میں فعل و انفعال اور جذب و انجذاب کے کچھ ایسے وجدانی احساسات ودیعت کر دیئے کہ ہر جنس دوسری جنس سے ملنے کی قدرتی طلب رکھتی ہے اور دونوں کے ملنے سے ازدواجی زندگی کی ایک کامل معیشت پیدا ہو جاتی ہے۔

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ جَعَلَ	وہ آسمانوں اور زمین کا بنانے والا۔ اس نے

---

[1] قرآنِ حکیم نے آخرت کے وجود کا جن جن دلائل سے اذعان پیدا کیا ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ وہ کہتا ہے دنیا میں ہر چیز اپنا کوئی نہ کوئی متقابل وجود یا ثنیٰ ضرور رکھتی ہے۔ پس ضروری ہے کہ دنیوی زندگی کے لیے بھی کوئی متقابل اور ثنیٰ زندگی ہو۔ دنیوی زندگی کی متقابل زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ چنانچہ بعض سورتوں میں انہی متقابل مظاہرات سے استشہاد کیا ہے۔ مثلاً سورۂ والشمس میں فرمایا:
وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا وَالْقَمَرِ إِذَا تَلٰهَا وَالنَّهَارِ إِذَا جَلّٰهَا وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشٰهَا وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنٰهَا وَالْأَرْضِ وَمَا طَحٰهَا الخ (۹۱ : ۱-۶)

فَبِتْنَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ (۲۶: ۷) اور غور نہیں کیا کہ ہم نے نباتات کی ہر دو دو بہتر قسموں میں سے کتنے (بے شمار) درخت پیدا کر دئیے ہیں۔

وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ (۱۶: ۱۳)

اور (دیکھو) اللہ نے جو پیدا وار مختلف رنگتوں کی تمہارے لیے زمین میں پھیلا دی ہے اس میں بھی عبرت پذیر طبیعتوں کے لیے (حکمت الٰہی کی) بڑی ہی نشانی ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ (۶: ۱۴۱)

اور وہ (حکیم و قدیر) جس نے (طرح طرح کے) باغ پیدا کر دیئے، ٹٹیوں پر چڑھائے ہوئے اور بغیر چڑھائے ہوئے اور کھجور کے درخت اور (طرح طرح کی) کھیتیاں، جن کے دانے اور پھل کھانے میں مختلف ذائقہ رکھتے ہیں!

جمادات حیوانات اور نباتات ہی پر موقوف نہیں جمادات میں بھی یہی قانونِ فطرت کام کر رہا ہے۔

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ (۳۵: ۲۷)

اور پہاڑوں کو دیکھو گوناگوں رنگتوں کے ہیں۔ کچھ سفید، کچھ سرخ، کچھ کالے کلوٹے!

ہر چیز کے دو دو ہونے کا قانون اسی قانونِ اختلاف کا ایک گوشہ وہ بھی ہے جسے قرآن نے "تزویج" سے تعبیر کیا ہے، اور ہم اُسے قانونِ تثنیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی ہر چیز کے دو دو ہونے یا متقابل و متماثل ہونے کا قانون۔ کائناتِ خلقت کا کوئی گوشہ بھی دیکھو، تمھیں کوئی چیز یہاں اکہری اور طاق نظر نہیں آئے گی۔ ہر چیز میں جفت اور دو دو ہونے کی حقیقت کام کر رہی ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ ہر چیز اپنا کوئی نہ کوئی مثنیٰ بھی ضرور رکھتی ہے۔ رات کے لیے دن ہے، صبح کے لیے شام ہے، نر

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَاۗءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا (۲۵: ۵۴)

اور وہی حکیم و قدیر ہے جس نے پانی سے (یعنی نطفے سے انسان کو پیدا کیا پھر (اسی رشتہ پیدائش کے ذریعے) اسے نسب اور صہر کا رشتہ رکھنے والا بنا دیا!

صلۂ رحمی اور خاندانی حلقے کی تشکیل اور پھر دیکھو، اس نسب اور صہر کے رشتے سے کس طرح خاندان اور قبیلہ کا نظام قائم ہو گیا ہے، اور کس عجیب و غریب طریقے سے صلۂ رحمی یعنی قرابت داری کی گیرائیاں ایک وجود کو دوسرے وجود سے جوڑتیں اور معاشرتی زندگی کی باہمی اُلفتوں اور معاونتوں کے لیے محرک ہوتی ہیں۔ درحقیقت انسان کی اجتماعی زندگی کا سارا کارخانہ اسی صلۂ رحمی کے سر رشتہ نے قائم کر رکھا ہے:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا (۴: ۱)

اے افرادِ نسلِ انسانی! اپنے پروردگار کی نافرمانی سے بچو اور اس کے ٹھہرائے ہوئے رشتوں سے بے پروا نہ ہو جاؤ) وہ پروردگار جس نے تمھیں ایک فردِ واحد سے پیدا کیا (یعنی باپ سے) پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بھی پیدا کر دیا[1] (یعنی جس طرح مرد کی نسل سے لڑکا پیدا ہوا لڑکی بھی پیدا ہوئی) پھر ان کی نسل[2] سے ایک بڑی تعداد مرد اور عورت کی پیدا ہو کر پھیل گئی (اس طرح فردِ واحد کے رشتہ نے ایک بڑے خاندان اور قبیلہ کی صورت پیدا کر لی) پس اللہ کی نافرمانی سے بچو جس کے

---

[1] یعنی حوّا۔ مصحح

[2] یعنی آدم و حوّا کی نسل سے۔ مصحح

لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا (۴۲ - ۱۱)

تمھارے لیے تمھاری ہی جنس میں سے جوڑے بنا دیئے (یعنی مرد کیلئے عورت اور عورت کے لیے مرد) اسی طرح چارپایوں میں بھی جوڑے پیدا کر دیئے

قرآن کہتا ہے، یہ اس لیے ہے تاکہ محبّت اور سکون ہو، اور دو ہستیوں کی باہمی رفاقت اور اشتراک سے زندگی کی محنتیں اور مشقّتیں سہل اور گوارا ہو جائیں:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۳۰ : ۲۱)

اور (دیکھو) اس کی رحمت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمھارے لیے تم ہی میں سے جوڑے پیدا کر دیئے (یعنی مرد کے لیے عورت اور عورت کے لیے مرد) تاکہ اس کی وجہ سے تمھیں سکون حاصل ہو

اور پھر اس کی یہ کارفرمائی دیکھو کہ) تمھارے درمیان (یعنی مرد اور عورت کے درمیان) محبّت اور رحمت کا جذبہ پیدا کر دیا۔ بلاشبہ ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں اس میں (حکمتِ الٰہی کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

نسب اور صہر پھر اسی ازدواجی زندگی سے توالد و تناسل کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہو گیا ہے کہ ہر وجود پیدا ہوتا ہے، اور ہر وجود پیدا کرتا ہے۔ ایک طرف وہ نسب کا رشتہ رکھتا ہے جو اسے پچھلوں سے جوڑتا ہے۔ دوسری طرف صہر یعنی دامادی کا رشتہ رکھتا ہے جو اسے آگے آنے والوں سے مربوط کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر وجود کی فردیّت ایک وسیع دائرہ کی کثرت میں پھیل گئی ہے، اور رشتوں اور قرابتوں کا ایسا وسیع حلقہ پیدا ہو گیا ہے جس کی ہر کڑی دوسری کڑی کے ساتھ مربوط ہے:

تَعْقِلُوْنَ ۝ (۴۰ : ۶۷) تک پہنچو۔ پھر تم میں سے کوئی تو ان منزلوں سے پہلے ہی مرجاتا ہے، کوئی چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ اپنے مقررہ وقت تک زندگی بسر کرے۔

زینت و تفاخر، مال و متاع، آل اور اولاد

اسی طرح، طرح طرح کی خواہشیں اور جذبے، زینت و تفاخر کے ولولے، مال و متاع کی محبت، آل و اولاد کی دل بستگیاں، زندگی کی دلچسپی اور انہماک کے لیے پیدا کر دی گئی ہیں:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ (۳ : ۱۴)

انسان کے لیے مرد و عورت کے تعلق میں، اولاد میں، چاندی سونے کے اندوختوں میں، چنے ہوئے گھوڑوں میں، مویشیوں میں اور کھیتی باڑی میں دلبستگی پیدا کر دی گئی ہے اور یہ جو کچھ بھی ہے، دنیوی زندگی کی پونجی ہے۔ بہتر ٹھکانا تو اللہ ہی کے پاس ہے!

اختلافِ معیشت اور تزاحمِ حیات

اسی طرح معیشت کا اختلاف اور اس کی وجہ سے مختلف درجوں اور حالتوں کا پیدا ہو جانا بھی انہماکِ حیات کا ایک بہت بڑا محرک ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے زندگی میں مزاحمت اور مسابقت کی حالت پیدا ہو گئی ہے اور اس میں لگے رہنے سے زندگی کی مشقتوں کا جھیلنا آسان ہو گیا ہے؛ بلکہ یہی مشقتیں سرتاسر راحت و سرور کا سامان بن گئی ہیں:

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ

اور یہ اسی (حکیم و قدیر) کی کارفرمائی ہے کہ اس نے تمھیں زمین میں (پچھلوں کا) جانشین بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض پر درجوں میں

نام پر باہم دگر (مہر و شفقت کا) سوال کرتے ہو اور صلۂ رحمی کے توڑنے سے بھی بچو (جن کے نام پر باہم دگر ایک دوسرے سے چشمداشتِ اعانت رکھتے ہو) بلاشبہ اللہ تمھارا نگران حال ہے:

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ	اور (دیکھو) یہ اللہ ہی جس نے تمھاری ہی جنس سے
اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ	تمھارے لیے جوڑا بنا دیا (یعنی مرد کے لیے عورت
بَنِيْنَ وَحَفَدَةً	اور عورت کے لیے مرد) پھر تمھارے باہمی
(۱۶ : ۷۲)	ازدواج سے بیٹوں اور پوتوں کا سلسلہ قائم کر دیا۔

ایامِ حیات کا تغیر و تنوع اسی طرح ایامِ حیات کے تغیر و تنوع میں بھی تسکینِ حیات کی ایک بہت بڑی مصلحت پوشیدہ ہے۔ ہر زندگی طفولیت، شباب، جوانی، کہولت اور بڑھاپے کی مختلف منزلوں سے گذرتی ہے، اور ہر منزل اپنے نئے نئے احساسات اور نئی نئی مشغولیتیں اور نئی نئی کاوشیں رکھتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہماری زندگی عالمِ ہستی کی ایک دلچسپ مسافرت بن گئی۔ ایک منزل کی کیفیتوں سے ابھی جی سیر نہیں ہو چکتا کہ دوسری منزل نمودار ہو جاتی ہے، اور اسی طرح عرصۂ حیات کی طوالت محسوس ہی نہیں ہوتی:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ	وہ (پروردگار) جس نے تمھارا وجود مٹی سے
تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ	پیدا کیا، پھر "نطفہ" سے پھر "علقہ" سے (یعنی
مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ	جونک کی شکل کی ایک چیز سے) پھر ایسا
طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ	ہوتا ہے کہ تم طفولیت کی حالت میں ماں کے
لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا وَمِنْكُمْ	شکم سے نکلتے ہو، پھر بڑے ہوتے ہو اور
مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْا	سنِ تمیز تک پہنچتے ہو، اس کے بعد تمھارا
اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ	جینا اس لیے ہوتا ہے تاکہ بڑھاپے کی منزل

وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ	سے ہمیشہ فیضیاب کرنے والی! بلاشبہ آسمانوں
وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ	اور زمین کے پیدا کرنے میں، اور رات دن کے
بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ	ایک کے بعد ایک آتے رہنے میں، اور کشتی میں
اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا	جو انسان کی کاربرآری کے لیے سمندر میں چلتی ہے
بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ	اور بارش میں جسے اللہ آسمان سے برساتا ہے اور
فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ	اس (کی آب پاشی) سے زمین مرنے کے بعد
الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ	پھر جی اٹھتی ہے، اور اس بات میں کہ ہر قسم
السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ	کے جانور زمین میں پھیلا دیئے ہیں نیز ہواؤں
لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝	کے مختلف جانب پھیرنے میں اور بادلوں میں جو
(۲: ۱۶۴-۱۶۳)	آسمان اور زمین کے درمیان (اپنی مقررہ جگہ

کے اندر) بندھے رُکے ہیں، عقل رکھنے والوں کے لیے (اللہ کی ہستی اور اس کے قوانین فضل و رحمت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں!

اسی طرح ان مقامات کا مطالعہ کرو جہاں خصوصیت کے ساتھ جمالِ فطرت سے استدلال کیا ہے:

أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ	کیا کبھی ان لوگوں نے آسمان کی طرف نظر
فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا	اٹھا کر دیکھا نہیں کہ کس طرح ہم نے اسے
وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ ۝ وَ	بنایا ہے، اور کس طرح اس کے منظر میں
الْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا	خوشنمائی پیدا کر دی ہے۔ اور پھر یہ کہ کہیں
فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا	بھی اس میں شگاف نہیں؛ اور اسی طرح

فِیْ مَآ اٰتٰىکُمْ ؕ اِنَّ رَبَّکَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۶ : ۱۶۵)

فوقیت دے دی تاکہ جو کچھ تمھیں دیا گیا ہے اس میں تمہارے عمل کی آزمائش کرے، بلاشبہ تمھارا پروردگار (پاداشِ عمل) کی سزا دینے میں تیز ہے (یعنی اس کا قانونِ مکافاتِ نتائجِ عمل میں سست رفتار نہیں) لیکن ساتھ ہی بخش دینے والا، رحمت رکھنے والا بھی ہے

بُرہانِ فضل و رحمت

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جس طرح قرآن نے ربوبیت کے اعمال و مظاہر سے استدلال کیا ہے، اسی طرح وہ رحمت کے آثار و حقائق سے بھی جا بجا استدلال کرتا ہے اور برہانِ ربوبیت کی طرح برہانِ فضل و رحمت بھی اس کی دعوت و ارشاد کا ایک عام اسلوبِ خطاب ہے۔ وہ کہتا ہے، کائناتِ خلقت کی ہر شے میں ایک مقررہ نظام کے ساتھ رحمت و فضل کے مظاہر کا موجود ہونا، قدرتی طور پر انسان کو یقین دلا دیتا ہے کہ ایک رحمت رکھنے والی ہستی کی کارفرمائیاں یہاں کام کر رہی ہیں۔ کیونکہ ممکن نہیں، فضل و رحمت کی یہ پوری کائنات موجود ہو، اور فضل و رحمت کا کوئی زندہ ارادہ موجود نہ ہو۔ چنانچہ وہ تمام مقامات جن میں کائناتِ خلقت کے افادہ و فیضان، زینت و جمال، موزونیت و اعتدال، تسویہ و قوام اور تکمیل و اتقان کا ذکر کیا گیا ہے دراصل اسی استدلال پر مبنی ہیں!

وَاِلٰهُکُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ؕ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اور (دیکھو) تمھارا معبود وہی ایک معبود ہے۔ کوئی معبود نہیں مگر اسی کی ایک ذات رحمت والی اور اپنی رحمت کی بخشائشوں

تسویہ اس معنی میں قرآن "تسویہ" کا لفظ بھی استعمال کرتا ہے۔ "تسویہ" کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کو اس طرح ٹھیک ٹھیک درست کر دینا کہ اس کی ہر بات خوبی و مناسبت کے ساتھ ہو

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰیۙ وَالَّذِیْ	وہ پروردگار جس نے ہر چیز پیدا کی، پھر ٹھیک
قَدَّرَ فَهَدٰی (۸۷ : ۲)	ٹھیک خوبی و مناسبت کے ساتھ درست کر دی، اور وہ
	جس نے ہر وجود کے لیے ایک اندازہ ٹھہرا دیا، پھر اس پر (زندگی و معیشت) کی راہ کھول دی!
الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ	وہ پروردگار جس نے تمہیں پیدا کیا، پھر ٹھیک ٹھیک
فَعَدَلَكَ فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ	درست کر دیا، پھر تمہارے ظاہری و باطنی قویٰ میں
مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ (۸۲ : ۷)	اعتدال و تناسب ملحوظ رکھا، پھر جیسی صورت
	بنانی چاہی، اسی کے مطابق ترکیب دے دی

اتقان یہی حقیقت ہے جسے قرآن نے "اتقان" سے بھی تعبیر کیا ہے یعنی کائنات ہستی کی ہر چیز کا درستگی و استواری کے ساتھ ہونا کہ کہیں بھی اس میں خلل، نقصان، بے ڈھنگا پن، اور پیچ نیچ، ناہمواری، نظر نہیں آسکتی:

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْۤ اَتْقَنَ	یہ اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز درستگی و استواری
كُلَّ شَیْءٍ (۲۷ : ۹)	کے ساتھ بنائی!
مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ	تم الرحمٰن کی بناوٹ میں، رحمٰن کی بناوٹ میں،
مِنْ تَفٰوُتٍؕ فَارْجِعِ	کیونکہ اس کی رحمت ہی کا ظہور ہے، کبھی کوئی اونچ نیچ
الْبَصَرَۙ هَلْ تَرٰی مِنْ	نہیں پاؤ گے۔ اچھا نظر اٹھاؤ اور اس نمائش گاہ
فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ	صنعت کا مطالعہ کرو، ایک بار نہیں، بار بار دیکھو
كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ	کیا تمہیں کوئی دراڑ دکھائی دیتی ہے؟ تم اسی طرح

مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ۝ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ ۝ (۵۰ : ۶-۸)

زمین کو دیکھو، کس طرح ہم نے اسے فرش کی طرح پھیلا دیا اور پہاڑوں کے لنگر ڈال دیئے اور پھر کس طرح قسم قسم کی خوبصورت نباتات اُگا دیں؟ ہر اس بندے کے لیے جو حق کی طرف رجوع کرنے والا ہے، اس میں غور کرنے کی بات اور نصیحت کی روشنی ہے!

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِينَ (۱۵ : ۱۶)

اور (دیکھو) ہم نے آسمان میں (ستاروں کی گردش کے لیے) برج بنائے اور دیکھنے والوں کے لیے ان میں خوش نمائی پیدا کر دی

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ ط (۶۷ : ۵)

اور (دیکھو) ہم نے دنیا کے آسمان (یعنی کرۂ ارضی کی فضا) کو ستاروں کی قندیلوں سے خوش منظر بنا دیا!

وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ۝ (۱۶ : ۶)

اور (دیکھو) تمھارے لیے چارپایوں کے منظر میں جب شام کے وقت چراگاہ سے واپس لاتے ہو اور جب صبح لے جاتے ہو، ایک طرح کا حسن اور نظر افروزی ہے!

موزونیت و تناسب جس چیز کو ہم "جمال" کہتے ہیں، اس کی حقیقت کیا ہے؟ موزونیت اور تناسب۔ یہی موزونیت اور تناسب ہے جو بناؤ اور خوبی کے تمام مظاہر کی اصل ہے:

وَاَنْۢبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ (۱۵ : ۱۹)

اور (دیکھو) ہم نے زمین میں ہر ایک چیز موزونیت اور تناسب رکھنے والی اُگائی!

خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ (۱۷: ۹۹) تو اس حالت میں یقیناً تم خرچ ہو جانے کے ڈر سے ہاتھ روک کے رکھتے، (لیکن یہ اللہ ہے جس کے خزائن رحمت نہ تو کبھی ختم ہو سکتے ہیں، نہ اس کی بخشائش رحمت کی کوئی انتہا ہے)

رحمت سے وحی و تنزیل کی ضرورت پر استدلال

اس طرح وہ رحمت سے وحی و تنزیل کی ضرورت پر بھی استدلال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے، جو رحمت کارخانۂ ہستی کے ہر گوشہ میں افادہ و فیضان کا سرچشمہ ہے، کیونکر ممکن تھا کہ انسان کی معنوی ہدایت کے لیے اس کے پاس کوئی فیضان نہ ہوتا اور وہ انسان کو نقصان و ہلاکت کے لیے چھوڑ دیتی؟ اگر تم دس گوشوں میں فیضانِ رحمت محسوس کر رہے ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ گیارہویں گوشے میں اس سے انکار کر دو۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے جا بجا نزولِ وحی، ترسیلِ کتب اور بعثتِ انبیاء کو رحمت سے تعبیر کیا ہے:

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ	اور (اے پیغمبر!) اگر ہم چاہیں تو جو کچھ تم پر
بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ	وحی کے ذریعے بھیجا گیا ہے اسے اٹھا لے جائیں
ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا	(یعنی سلسلۂ تنزیلِ وحی باقی نہ رہے) اور پھر تمھیں
وَكِيْلًا ۝ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ	کوئی بھی ایسا سازگار نہ ملے جو ہم پر زور ڈال
رَّبِّكَ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ	سکے، لیکن جو سلسلہ وحی جاری ہے تو یہ اس کے
عَلَيْكَ كَبِيْرًا ۝ (۱۷: ۸۶-۸۷)	سوا کچھ نہیں ہے کہ تمھارے پروردگار کی رحمت ہے،
	اور یقین کرو، تم پر اس کا بڑا ہی فضل ہے۔
تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝	(یہ قرآن) عزیز و رحیم کی طرف سے نازل کیا
لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ	گیا ہے، تاکہ ان لوگوں کو جن کے آبا و اجداد
اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ	(کسی پیغمبر کی زبانی) متنبہ نہیں کیے گئے ہیں
(۳۶: ۵، ۶)	اور اس لیے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، تم متنبہ کرو۔

الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ (۶۷ : ۳)
پھیر کر دیکھتے رہو، تمہاری نگاہ تھکی، اور عاجز و درماندہ ہو کر واپس آجائیگی، لیکن کوئی نقص نکال سکیگی؟

"فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ" فرمایا۔ یعنی یہ خوبی و اتقان اس لیے ہے کہ رحمت رکھنے والے کی کاریگری ہے۔ اور رحمت کا مقتضا یہی تھا کہ حسن و خوبی ہو، اتقان و کمال ہو، نقص و ناہمواری نہ ہو۔

رحمت سے معاد پر استدلال

خدا کی ہستی اور اس کی توحید و صفات کی طرح، آخرت کی زندگی پر بھی وہ رحمت سے استدلال کرتا ہے۔ اگر رحمت کا مقتضا یہ ہوا کہ دنیا میں اس خوبی و کمال کے ساتھ زندگی کا ظہور ہو، تو کیونکر یہ بات باور کی جاسکتی ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی کے بعد اس کا فیضان ختم ہو جائے اور خزانۂ رحمت میں انسان کی زندگی اور بناؤ کے لیے کچھ باقی نہ رہے؟

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۚ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ۔ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّیْۤ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ

کیا ان لوگوں نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ جس نے آسمان و زمین پیدا کیے ہیں، یقیناً اس بات سے عاجز نہیں ہو سکتا کہ ان جیسے (آدمی دوبارہ) پیدا کر دے اور یہ کہ ان کے لیے اس نے ایک مقررہ وقت ٹھہرا دیا ہے جس میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں؟ افسوس ان کی شقاوت پر) اس پر بھی ان ظالموں نے اپنے لیے کوئی راہ پسند نہ کی مگر حقیقت سے انکار کرنے کی! (اے پیغمبر! ان سے) کہہ دو، "اگر میرے پروردگار کی رحمت کے خزانے تمہارے قبضے میں ہوتے

چنانچہ اسی بنا پر اس نے داعیٔ اسلام کو بھی فیضانِ رحمت سے تعبیر کیا ہے:

وَمَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِينَ (۲۱ : ۱۰۷)

(اے پیغمبر!) ہم نے تمھیں نہیں بھیجا ہے، مگر اس لیے کہ تمام جہان کے لیے ہماری رحمت کا ظہور ہے:

انسانی اعمال کے معنوی قوانین پر "رحمت" سے استدلال اور "بقاء انفع"

اسی طرح وہ "رحمت" کے مادی مظاہر سے انسانی اعمال کے معنوی قوانین پر بھی استدلال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے جس "رحمت" کا مقتضا، یہ ہوا کہ دنیا میں "بقاء انفع" کا قانون نافذ ہے، یعنی وہی چیز باقی رہتی ہے جو نافع ہوتی ہے، کیونکر ممکن تھا کہ وہ انسانی اعمال کی طرف سے غافل ہو جاتی اور نافع اور غیر نافع اعمال میں امتیاز نہ کرتی؟ پس مادیات کی طرح معنویات میں بھی یہ قانون نافذ ہے، اور ٹھیک ٹھیک اسی طرح اپنے احکام و نتائج رکھتا ہے، جس طرح مادیات میں تم دیکھ رہے ہو۔

حق اور باطل

اس سلسلہ میں وہ دو لفظ استعمال کرتا ہے "حق" اور "باطل"۔ سورۂ رعد میں جہاں قانون "بقاء انفع" کا ذکر کیا ہے، وہاں یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اس بیان سے مقصود "حق" اور "باطل" کی حقیقت واضح کرنی ہے:

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ (۱۳ : ۱۸)

اس طرح اللہ "حق" اور "باطل" کی ایک مثال بیان کرتا ہے۔

ساتھ ہی مزید تصریح کر دی:

فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ

پس (دیکھو) میل کچیل سے جو جھاگ اٹھتا ہے وہ رائیگاں جاتا ہے، کیونکہ اس میں انسان کے لیے

تورات و انجیل اور قرآن کی نسبت جا بجا تصریح کی کہ ان کا نزول "رحمت" ہے:

وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً (۱۱ : ۱۷)

اور اس سے پہلے (یعنی قرآن سے پہلے) موسیٰ کی کتاب (امت کے لیے) پیشوا اور رحمت!

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝ (۱۰ : ۵۷)

اے افرادِ نسلِ انسانی! یقیناً یہ تمھارے پروردگار کی طرف سے موعظت ہے جو تمھارے لیے آگئی ہے اور ان تمام بیماریوں کے لیے جو انسان کے دل کی بیماریاں ہیں، نسخۂ شفا ہے اور رہنمائی اور رحمت ہے ایمان رکھنے والوں کے لیے (اے پیغمبر! ان لوگوں سے) کہدو کہ یہ جو کچھ ہے، اللہ کے فضل اور رحمت سے ہے۔ پس چاہیئے کہ (اپنی فیضیابی پر) خوش ہوں۔ یہ (اپنی برکتوں میں) ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جنھیں تم (زندگی کی کامرانیوں کے لیے) فراہم کرتے ہو!

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۴۵ : ۲۰)

یہ (قرآن) لوگوں کے لیے واضح دلیلوں کی روشنی ہے، اور ہدایت و رحمت ہے یقین رکھنے والوں کے لیے!

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (۲۹ : ۵۰)

کیا ان لوگوں کے لیے یہ نشانی کافی نہیں کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی ہے جو انھیں برابر سنائی جارہی ہے؟ جو لوگ یقین رکھنے والے ہیں، بلاشبہ ان کے لیے اس نشانی میں سر تا سر رحمت اور فہم و بصیرت ہے!

یعنی فطرت کا فیصلہ حق جو باطل کے لیے نہیں ہو سکتا:

فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰہِ قُضِیَ	پھر جب وہ وقت آگیا کہ حکمِ الٰہی صادر ہو، تو
بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ	(خدا کا) فیصلہ حق نافذ ہو گیا اور اس وقت
الْمُبْطِلُوْنَ (۴۰: ۷۸)	اُن لوگوں کے لیے جو برسرِ باطل تھے، تباہی ہوئی۔

اس نے اس حقیقت کی تعبیر کے لیے "حق" اور "باطل" کا لفظ اختیار کر کے مجرد تعبیر ہی سے حقیقت کی نوعیت واضح کر دی کیونکہ حق اسی چیز کو کہتے ہیں جو ثابت و قائم ہو، اور باطل کے معنی ہی یہ ہیں کہ مٹ جانا، قائم و باقی نہ رہنا۔ پس جب وہ کسی بات کے لیے کہتا ہے کہ "یہ حق" ہے، تو یہ صرف ایک دعوی ہی نہیں ہوتا، بلکہ دعوے کے ساتھ اس کے جانچنے کا ایک معیار بھی پیش کر دیتا ہے۔ یہ بات حق ہے، یعنی نہ ٹلنے والی، نہ مٹنے والی بات ہے یہ باطل ہے یعنی نہ ٹک سکنے والی، مٹ جانے والی بات ہے۔ پس جو بات اٹل ہو گی، اس کا اٹل ہونا کسی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ جو بات مٹ جانے والی ہے اس کا مٹنا ہر آنکھ دیکھ لیگی!

اللہ کی صفت بھی الحق ہے

چنانچہ وہ اللہ کی نسبت بھی "الحق" کی صفت استعمال کرتا ہے کیونکہ اس کی ہستی سے بڑھ کر اور کونسی حقیقت ہے جو ثابت اور اٹل ہو سکتی ہے؟

فَذٰلِكُمُ اللّٰہُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ج (۱۰: ۳۲)	پس یہ ہے تمہارا پروردگار "الحق" ہے
فَتَعٰلَى اللّٰہُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ج (۲۰: ۱۱۴)	پس کیا ہی بلند درجہ ہے اللہ کا "الملک"
	(فرمانروا) الحق (یعنی ثابت) کا۔

وحی و تنزیل بھی الحق ہے

وحی و تنزیل کو بھی وہ "الحق" کہتا ہے کیونکہ وہ دنیا کی ایک قائم و ثابت حقیقت ہے۔ جن قوتوں نے اسے مٹانا چاہا تھا، وہ خود مٹ گئیں حتّٰی کہ آج ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں، لیکن وحی و تنزیل کی حقیقت ہمیشہ قائم رہی، اور آج تک قائم ہے!

فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ کَذٰلِکَ یَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ لِلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّھِمُ الْحُسْنٰی وَالَّذِیْنَ لَمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَہٗ لَوْ اَنَّ لَھُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّ مِثْلَہٗ مَعَہٗ لَافْتَدَوْا بِہٖ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۵

(۱۳ : ۱۸)

نفع نہ تھا، لیکن جس چیز میں انسان کے لیے نفع ہو، وہ زمین میں باقی رہ جاتی ہو۔ اسی طرح اللہ (اپنے قوانینِ عمل کی) مثالیں دیتا ہو (سو) جن لوگوں نے اپنے پروردگار کا حکم قبول کیا ان کے لیے خوبی و بہتری ہو، اور جن لوگوں نے قبول نہ کیا، ان کے لیے (اپنے اعمالِ بد کا) سختی کے ساتھ حساب دینا ہو، اور اگر ان لوگوں کے قبضے میں وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہو، اور اتنا ہی اس پر اور بڑھا دیں، اور بدلہ میں دے کر نتائجِ عمل سے بچنا چاہیں، جب بھی نہ بچ سکیں گے)

عربی میں "حق" کا خاصہ ثبوت اور قیام ہو، یعنی جو بات ثابت ہو، اٹل ہو، اَن مٹ ہو، اسے حق کہیں گے۔ باطل ٹھیک ٹھیک اسی کا نقیض ہو۔ ایسی چیز جس میں ثبات و قیام نہ ہو، ٹل جانے والی، مٹ جانے والی، باقی نہ رہنے والی۔ چنانچہ خود قرآن میں جا بجا ہو۔ لِیُحِقَّ الْحَقَّ وَیُبْطِلَ الْبَاطِلَ (۸ : ۸)

قانونِ "قضا بالحق" وہ کہتا ہو جس طرح تم مادّیات میں دیکھتے ہو کہ فطرت چھانٹتی رہتی ہے، جو چیز نافع ہوتی ہو، باقی رکھتی ہو، جو نافع نہیں ہوتی، اسے محو کر دیتی ہو، ٹھیک ٹھیک ایسا ہی عمل معنویات میں بھی جاری ہو۔ جو عمل حق ہو گا، قائم اور ثابت رہے گا جو باطل ہو گا، مٹ جائے گا، اور جب کبھی حق اور باطل متقابل ہوں گے تو بقا حق کے لیے ہو گی نہ کہ باطل کے لیے۔ وہ اسے "قضا بالحق" سے تعبیر کرتا ہو

نزاعِ حق و باطل یہ جو قرآن جا بجا حق اور باطل کے نزاع کا ذکر کرتا ہے، اور پھر بطور اصل اور قاعدے کے اس پر زور دیتا ہے کہ کامیابی حق کے لیے ہے، اور ہزیمت و خسران باطل کے لیے تو یہ مقامات بھی اسی قانون "قضاء بالحق" کی تصریحات ہیں اور اسی حقیقت کی روشنی میں ان کا مطالعہ کرنا چاہیئے

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى	اور ہمارا قانون یہ ہے کہ حق باطل سے ٹکراتا ہے
الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا	اور اسے پاش پاش کر دیتا ہے اور اچانک ایسا
هُوَ زَاهِقٌ (۲۱ : ۱۸)	ہوتا ہے کہ وہ نابود ہو گیا !
وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ	اور کہہ دو حق نمودار ہو گیا اور باطل نابود ہوا اور
الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ	یقیناً باطل نابود ہی ہونے والا تھا۔
كَانَ زَهُوقًا (۱۷ : ۸۱)	

اللہ کی شہادت اور پھر حق و صداقت کے لیے یہی اللہ کی وہ شہادت ہے جو اپنے مقررہ وقت پر ظاہر ہوتی ہے اور بتا دیتی ہے کہ حق کس کے ساتھ تھا، اور باطل کا کون پرستار تھا، یعنی "قضاء بالحق" کا قانون حق کو ثابت و قائم رکھ کر اور اس کے حریف کو محو و متلاشی کر کے حقیقتِ حال کا اعلان کر دیتا ہے۔

قُلْ كَفَى بِاللَّهِ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ	ان لوگوں سے کہہ دو، اب کسی اور رد و کد کی
شَهِيدًا ج يَعْلَمُ مَا فِي	ضرورت نہیں۔ میرے اور تمھارے درمیان اللہ
السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالَّذِينَ	کی گواہی بس کرتی ہے، آسمان و زمین میں جو کچھ ہے، سب
اٰمَنُوا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوا	اس کے علم میں ہے۔ پس جو لوگ حق کی جگہ باطل پر
بِاللَّهِ أُولٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ	ایمان لائے ہیں، اور اللہ کی صداقت کے منکر ہیں تو
(۲۹ : ۵۲)	یقیناً وہی ہیں جو تباہ ہونے والے ہیں !

قُلْ يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ (۱۰ : ۱۰۸ - ۱۰۹)	اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ اے افرادِ نسلِ انسانی! بلاشبہ تمھارے پروردگار کی طرف سے وہ چیز تمھارے لیے آگئی جو "حق" ہے۔ پس اب جس کسی نے سیدھی راہ اختیار کی، تو یہ راست روی اسی کی بھلائی کے لیے ہے۔ اور جس نے گمراہی اختیار کی تو اس کی گمراہی کا نقصان بھی اسی کے لیے ہے۔ اور میرا کام تو صرف راہِ حق دکھا دینا ہے) میں تم پر نگہبان مقرر نہیں کیا گیا ہوں (کہ تم کو پکڑ کے زبردستی راہ پر لگا دوں) اور (اے پیغمبر!) جو کچھ تم پر وحی کی گئی ہے، اس کے مطابق چلو اور صبر کرو

یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے، اور وہ فیصلہ کرنے والوں میں بہتر فیصلہ کرنے والا ہے!

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ (۱۷ : ۱۰۵)	(اور اے پیغمبر!) ہماری طرف سے اس کا (یعنی قرآن کا) نازل ہونا حق ہے اور وہ حق ہی کے ساتھ نازل بھی ہوا ہے

قرآن کی اصطلاح میں "الحق" اسی طرح جب وہ علامت تعریف کے ساتھ کسی بات کو "الحق" کہتا ہے تو اس سے بھی مقصود یہی حقیقت ہوتی ہے، اور اسی لیے وہ اکثر حالتوں میں صرف "الحق" کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھتا۔ کیونکہ اگر فطرتِ کائنات کا یہ قانون ہے کہ وہ حق و باطل کے نزاع میں "حق ہی کو باقی رکھتی ہے" تو کسی بات کے امرِ حق ہونے کے لیے صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ "حق" ہے یعنی باقی و قائم رہنے والی حقیقت ہے، اس کا بقا و قیام خود ہی اپنی حقیقت کا اعلان کر دے گا۔

تدریج و امہال کا قانون کام کر رہا ہے۔ اور عالم مادّیات ہو یا معنویات کائناتِ ہستی کے ہر گوشہ میں قانونِ فطرت ایک ہی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ دنیا میں کوئی انسانی جماعت اپنی بدعملیوں کے ساتھ مہلتِ حیات پا سکتی :

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ	اور جس طرح انسان فائدے کیلیے جلدباز ہوتا ہے
الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ	اگر اسی طرح اللہ انسان کو سزا دینے میں جلدباز ہوتا
لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ ط (۱۰: ۱۱)	تو دانسان کی لغزشوں اور خطاؤں کا یہ حال ہے

کہ کبھی کا فیصلہ ہو چکتا، اور ان کا مقررہ وقت فوراً نمودار ہو جاتا۔

"تاجیل" وہ کہتا ہے، جس طرح مادّیات میں ہر حالت بتدریج نشوونما پاتی ہے، اور ہر نتیجہ کے ظہور کے لیے ایک خاص مقدار، ایک خاص مدّت اور ایک خاص وقت مقرّر کر دیا گیا ہے، ٹھیک اسی طرح اعمال کے نتائج کے لیے بھی خاص مقدار و اوقات کے احکام مقرّر ہیں۔ اور ضروری ہے کہ ہر نتیجہ ایک خاص مدت کے بعد اور ایک خاص مقدار کی نشوونما کے بعد ظہور میں آئے۔

مثلاً فطرت کا یہ قانون ہے کہ اگر پانی آگ پر رکھا جائیگا، تو وہ گرم ہو کر کھولنے لگیگا لیکن پانی کے گرم ہونے اور بالآخر کھولنے کے لیے حرارت کی ایک خاص مقدار ضروری ہے اور اس کے ظہور و تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ ایک مقررہ وقت تک انتظار کیا جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم پانی چولھے پر رکھو اور فوراً کھولنے لگے۔ وہ یقیناً کھولنے لگے گا لیکن اس وقت جب حرارت کی مقررہ مقدار بہ تدریج تکمیل تک پہنچ جائے گی۔ ٹھیک اسی طرح یہاں انسانی اعمال کے نتائج بھی اپنے مقررہ اوقات ہی میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، اور ضروری ہے کہ جب تک اعمال کے اثرات ایک خاص مقررہ مقدار تک نہ پہنچ

ایک دوسرے موقع پر فیصلۂ امر کے لیے، اسے سب سے بڑی شہادت قرار دیا ہی:

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً ۖ — کون سی بات سب سے بڑی گواہی ہی؟ اے پیغمبر

قُلِ اللّٰهُ شَهِیْدٌ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ — کہہ دو اللہ کی گواہی وہی میرے اور تمہارے درمیان

(۶: ۱۹) (فیصلۂ امر کے لیے) گواہی دینے والا ہی!

قضاء بالحق، مادیات اور معنویات کا عالمگیر قانون ہے! وہ کہتا ہی، اس قانون سے تم کیونکر انکار کر سکتے ہو جبکہ زمین و آسمان کا تمام کارخانہ اسی کی کارفرمائیوں پر قائم ہی؟ اگر فطرتِ کائنات نقصان اور برائی چھانٹتی نہ رہتی، اور بقا و قیام صرف اچھائی اور خوبی ہی کے لیے نہ ہوتا، تو ظاہر ہی تمام کارخانۂ ہستی درہم برہم ہو جاتا۔ جب تم جسمانیات میں اس قانونِ فطرت کا مشاہدہ کر رہے ہو تو معنویات میں تمھیں کیوں انکار ہو؟

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ — اور اگر حق ان کی خواہشوں کی پیروی کرے تو

لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَ — یقین کرو، یہ آسمان، زمین اور جو کوئی اس میں ہی

الْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهِنَّ ؕ (۲۳: ۷۱) — سب درہم برہم ہو کر رہ جائے!

انتظار اور تربّص قرآن میں جہاں کہیں انتظار اور تربّص پر زور دیا ہی اور کہا ہی جلدی نہ کرو، انتظار کرو، عنقریب حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے گا۔ مثلاً قُلْ فَانْتَظِرُوْا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ۝ (۱۰: ۱۰۲) تو اس سے بھی مقصود یہی حقیقت ہی۔

قضاء بالحق اور تدریج و امہال لیکن کیا "قضاء بالحق" کا نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ ہر باطل عمل فوراً نابود ہو جائے اور ہر عملِ حق فوراً فتحمند ہو جائے؟ قرآن کہتا ہی کہ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اور رحمت کا مقتضا بھی ہی کہ ایسا نہ ہو۔ جس رحمت کا مقتضا یہ ہوا کہ مادیات میں "تدریج و امہال" کا قانون نافذ ہی، اسی رحمت کا مقتضا یہ ہوا کہ معنویات میں بھی

قوانینِ فطرت کا معیارِ اوقات | قرآن کہتا ہے، تم اپنی اوقات شماری کے پیمانے سے قوانینِ فطرت کی رفتارِ عمل کا اندازہ نہ لگاؤ۔ فطرت کا دائرۂ عمل تو اتنا وسیع ہے کہ تمہارے معیارِ حساب کی بڑی سے بڑی مدّت اس کے لیے ایک دن کی مدت سے زیادہ نہیں:

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ	یہ لوگ عذاب کے لیے جلدبازی کر رہے ہیں (یعنی
وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ	انکار و شرارت کی راہ سے کہتے ہیں اگر سچ مچ کو
وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ	عذاب آنے والا ہے تو وہ کہاں ہے؟) سو یقین کرو
كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ	خدا اپنے وعدہ میں کبھی خلاف کرنے والا نہیں،
وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ	لیکن بات یہ ہے کہ تمہارے پروردگار کا ایک دن
لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا	ایسا ہی ہے جیسا تمہارے حساب کا ہزار برس۔
وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ (۲۲: ۴۷-۴۸)	چنانچہ کتنی ہی بستیاں ہیں جنھیں (عرصۂ دراز

تک) ڈھیل دی گئی حالانکہ وہ ظالم تھیں، پھر (جب ظہورِ نتائج کا وقت آگیا تو) ہمارا مواخذہ نمودار ہوگیا۔ اور (ظاہر ہے کہ) لوٹ کر ہماری طرف آنا ہے!

استعجال بالعذاب | اِن آیات میں فکرِ انسانی کی جس گمراہی کو "استعجال بالعذاب" سے تعبیر کیا گیا ہے، وہ صرف اُن ہی منکرینِ حق کی گمراہی نہ تھی۔ جو ظہورِ اسلام کے وقت اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے تھے۔ بلکہ ہر زمانے میں انسان کی ایک عالمگیر کج اندیشی رہی ہے۔ وہ بسا اوقات فطرت کی اس مہلت بخشی سے فائدہ اُٹھانے کی جگہ شر و فساد میں اور زیادہ نڈر اور جری ہو جاتا ہے۔ اور کہتا ہے، اگر فی الحقیقت حق و باطل کے لیے ان کے نتائج و عواقب ہیں، تو وہ نتائج کہاں ہیں؟ اور کیوں فوراً ظاہر نہیں ہو جاتے؟ قرآن جابجا منکرینِ حق کا خیال نقل کرتا ہے، اور کہتا ہے، اگر کائناتِ ہستی میں اس حقیقتِ

جائیں، نتائج کے ظہور کا انتظار کیا جائے۔

اس صورتِ حال سے تدریج و امہال کی حالت ہو گئی اور عملِ حق اور عملِ باطل دونوں کے نتائج کے ظہور کے لیے "تاجیل" یعنی ایک معیّن وقت کا ٹھہراؤ ضروری ہو گیا۔ دونوں کے نتائج فوراً ظاہر نہیں ہو جائیں گے۔ اپنی مقرّرہ "اجل" یعنی مقررہ وقت ہی پر ظاہر ہوں گے۔ البتہ حق کے لیے تاجیل اس لیے ہوتی ہے تاکہ اس کی فتحمند قوت نشو و نما پائے۔ اور باطل کے لیے اس لیے ہوتی ہے تاکہ اس کی فناپذیر کمزوری تکمیل تک پہنچ جائے۔ اس تاجیل کے لیے کوئی ایک ہی مقررہ مدت نہیں ہے۔ ہر حالت کا ایک خاصّہ ہے اور ہر گرد و پیش اپنا ایک مقتضا رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک خاص حالت کے لیے مقررہ مدت کی مقدار بہت تھوڑی ہو، اور ہو سکتا ہے کہ بہت زیادہ ہو۔

فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ آذَنتُكُمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۖ وَإِنْ أَدْرِي أَقَرِيبٌ أَم بَعِيدٌ مَّا تُوعَدُونَ ۝ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُونَ ۝ وَإِنْ أَدْرِي لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ۝ (۲۱ : ۱۰۹)	پھر اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو ان سے کہہ دو میں نے تم سب کو یکساں طور پر (حقیقتِ حال) کی خبر دے دی، اور میں نہیں جانتا اعمالِ بد کے جس نتیجہ کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، اس کا وقت قریب ہی یا ابھی دیر ہے، جو کچھ علانیہ زبان سے کہا جاتا ہے اور جو کچھ تم پوشیدہ رکھتے ہو، خدا کو سب کچھ معلوم ہے، اور مجھے کیا معلوم، ہو سکتا ہے یہ تاخیر اس لیے ہو کہ تمھاری آزمائش

کی جائے، یا اس لیے کہ ایک خاص وقت تک تمھیں فائدہ اٹھانے کا (مزید) موقع دیا جائے

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۲۹ : ۵۳)

اور یہ لوگ عذاب کے لیے جلدی کرتے ہیں (یعنی انکار و شرارت کی راہ سے کہتے ہیں) اگر واقعی عذاب آنے والا ہے تو کیوں نہیں آچکتا؟) اور واقعہ یہ ہو کہ اگر ایک خاص وقت نہ ٹھہرا دیا گیا ہوتا تو کب کا عذاب آچکا ہوتا اور (یقین رکھو جب وہ آئے گا تو اس طرح آئے گا کہ) یکایک ان پر آگریگا۔ اور انھیں اس کا وہم و گمان بھی نہ ہو گا!

وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ؀ (۱۱ : ۱۰۴)

اور (یاد رکھو) اگر ہم اس معاملے میں تاخیر کرتے ہیں تو صرف اس لیے کہ ایک حساب کی ہوئی مدت کے لیے اسے تاخیر میں ڈال دیں۔

اَلْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ وہ کہتا ہے، یہاں زندگی و عمل کی مہلتیں سب کے لیے ہیں، کیونکہ رحمت کا مقتضا یہی تھا۔ پس اس بات سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے اور یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ نتائج اعمال کے قوانین موجود نہیں۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ نتیجہ کی کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے، اور آخر کون برومند ہوتا ہے:

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ؀ (۶ : ۱۳۵)

(اے پیغمبر! تم ان لوگوں سے) کہہ دو کہ دیکھو (اب میرے اور تمھارے معاملہ کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہی) تم جو کچھ کر رہے ہو اپنی جگہ کیے جاؤ اور میں بھی اپنی جگہ کام میں لگا ہوں۔ عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ کون ہے جس کے لیے آخر کار (کامیاب) ٹھکانا ہے۔ بلاشبہ (یہ اس کا قانون ہے کہ) ظلم کرنے والے کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔

اعلیٰ کا ظہور نہ ہوتا جسے "رحمت" کہتے ہیں، تو یقیناً یہ نتائج یکایک اور بہ یک دفعہ ظاہر ہوجاتے، اور انسان اپنی بدعملیوں کے ساتھ کبھی زندگی کا سانس نہ لے سکتا۔ لیکن یہاں سارے قانونوں اور حکموں سے بھی بالاتر "رحمت" کا قانون ہے، اور اس کا مقتضیٰ یہی ہے کہ حق کی طرح باطل کو بھی زندگی و معیشت کی مہلتیں دے، اور توبہ و رجوع اور عفو و درگذر کا دروازہ ہر حال میں باز رکھے۔ فطرتِ کائنات میں اگر یہ رحمت نہ ہوتی، تو یقیناً وہ جزاء عمل میں جلد باز ہوتی، لیکن اس میں رحمت ہے، اس لیے نہ تو اس کی مہلت بخشیوں کی کوئی حد ہے نہ اس کے عفو و درگذر کے لیے کوئی کنارہ!

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَـٰذَا	اور (اے پیغمبر!) یہ (حقیقت فراموش) کہتے ہیں
الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ	اگر تم (نتائجِ ظلم وطغیان سے ڈرانے میں) سچے
قُلْ عَسَىٰ أَن يَكُونَ رَدِفَ	ہو تو وہ بات کب ہونے والی ہے؟ (اور کیوں نہیں
لَكُم بَعْضُ الَّذِي تَسْتَعْجِلُونَ	ہوچکتی؟) ان سے کہدو (گھبراؤ نہیں) جس بات کے
وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو فَضْلٍ	لیے تم جلدی مچا رہے ہو، عجب نہیں اس کا ایک حصہ
عَلَى النَّاسِ وَلَـٰكِنَّ	بالکل قریب آگیا ہو، اور (اے پیغمبر!) تمھارا
أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ	پروردگار انسان کے لیے بڑا ہی فضل رکھنے والا ہے کہ
(۲۷ : ۷۱، ۷۳)	ہر حال میں اصلاح و تلافی کی مہلت دیتا ہے! لیکن

(افسوس انسان کی غفلت پر!) بیشتر ایسے ہیں کہ اس کے فضل رحمت سے فائدہ اٹھانے کی جگہ اس کی ناشکری کرتے ہیں!

فَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۱۶: ۵۵) وغیرہ تعبیرات سے بھی اسی حقیقت پر زور دیتا ہے۔

قضاء بالحق" اور اقوام وجماعات

اسی طرح وہ قانونِ قضاء بالحق کو جماعتوں اور قوموں کے عروج وزوال پر بھی منطبق کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے جس طرح فطرت کا قانونِ انتخاب افراد و اجسام میں جاری ہے اسی طرح اقوام وجماعات میں بھی جاری ہے۔ جس طرح فطرت نافع اشیاء کو باقی رکھتی، غیر نافع کو چھانٹ دیتی ہے، ٹھیک اسی طرح جماعتوں میں بھی صرف اسی جماعت کے لیے بقا ہوتی ہے جس میں دنیا کے لیے نفع ہو۔ جو جماعت غیر نافع ہو جاتی ہے، چھانٹ دی جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے، یہ اس کی رحمت ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا میں انسانی ظلم وطغیان کے لیے کوئی روک تھام نظر نہ آتی!

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ	اور (دیکھو) اگر اللہ نے جماعتوں اور قوموں میں
بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ	باہم دگر تزاحم پیدا نہ کر دیا ہوتا، اور (وہ) بعض آدمیوں
الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰہَ ذُوْ فَضْلٍ	کے ذریعے بعض آدمیوں کو راہ سے ہٹاتا نہ رہتا تو یقیناً
عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ٥ (۲: ۲۵۲)	زمین میں خرابی پھیل جاتی، لیکن اللہ کائنات کے لیے
	فضل ورحمت رکھنے والا ہے۔

ایک دوسرے موقع پر یہی حقیقت ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ	اگر ایسا نہ ہوتا کہ اللہ بعض جماعتوں کے ذریعے
بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ	بعض جماعتوں کو ہٹاتا رہتا، تو یقین کرو دنیا
صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ	میں انسان کے ظلم وفساد کے لیے کوئی روک باقی نہ
وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ	رہتی۔ اور) یہ تمام خانقاہیں، گرجے، عبادتگاہیں

قرآن کی وہ تمام آیات جن میں ظلم و کفر کے لیے فلاح و کامیابی کی نفی کی گئی ہے۔

اس موقع پر یہ قاعدہ بھی معلوم کر لینا چاہیئے کہ قرآن نے جہاں کہیں ظلم و فساد اور فسق و کفر وغیرہ اعمالِ بد کے لیے کامیابی و فلاح کی نفی کی ہے، اور نیک عمل کے لیے فتحمندی و کامرانی کا اثبات کیا ہے، ان تمام مقامات میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶ : ۲۱) اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ (۱۰ : ۱۷) اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ (۲۳ : ۱۱۸) لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ (۱۰ : ۸۱) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (۹ : ۳۸) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۳ : ۸۶) وغیرہا۔ اللہ ظلم کرنے والوں کو فلاح نہیں دیتا۔ یعنی اس کا قانون ہے کہ ظلم کے لیے کامیابی و فلاح نہیں ہوتی۔ اللہ ظلم کرنے والوں کو فلاح نہیں دیتا یعنی اس کا قانون یہی ہے کہ ظلم کرنے والوں پر کامیابی و سعادت کی راہ نہیں کھلتی۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ ارشاد و ہدایت کا دروازہ ان پر بند کر دیتا ہے، اور وہ گمراہی و کوری کی زندگی پر مجبور کر دیے جاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ قرآن کے مفسروں نے ان مقامات کا ترجمہ غور و فکر کے ساتھ نہیں کیا، اس لیے مطالب اپنی اصلی شکل میں واضح نہ ہو سکے۔

تمتّع

اور پھر اصطلاحِ قرآنی میں یہی وہ "تمتع" ہے یعنی زندگی سے فائدہ اُٹھانے کی مہلت جس کا وہ بار بار ذکر کرتا ہے اور جو یکساں طور پر سب کو دی گئی ہے:

بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَ	بلکہ یہ بات ہے کہ ہم نے ان لوگوں کو اور ان کے آباؤ اجداد
اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ	کو مہلتِ حیات سے بہرہ مند ہونے کے موقعے دیئے
عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ (۲۱ : ۴۵)	یہاں تک کہ خوشحالی کی ان پر بڑی بڑی عمریں گذر گئیں

اسی طرح وہ جا بجا مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (۱۰ : ۹۸) مَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ (۳۶ : ۴۴)

ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ ۝ (۹: ۱۲۶)

(یعنی ان کے اعمالِ بد کے نتائج پیش نہ آتے ہوں،) پھر بھی نہ تو توبہ کرتے ہیں، نہ حالات سے نصیحت پکڑتے ہیں:

لیکن اگر تنبہ و اعتبار کی یہ تمام مہلتیں رائیگاں گئیں، اور ان سے فائدہ نہ اٹھایا گیا، تو پھر فیصلۂ امر کا آخری وقت نمودار ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ وقت آ جائے تو پھر یہ فطرت کا آخری، اٹل اور بے پناہ فیصلہ ہے۔ نہ تو اس میں ایک لمحہ کے لیے تاخیر ہو سکتی ہے۔ نہ یہ اپنے مقررہ وقت سے ایک لمحہ پہلے آ سکتا ہے:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ۝ (۷: ۳۴)

اور (دیکھو) ہر اُمّت کے لیے ایک مقررہ وقت ہے، سو جب ان کا مقررہ وقت آ چکتا ہے تو اس سے نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں، نہ ایک گھڑی آگے بڑھ سکتے ہیں۔

وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَعْلُومٌ ۝ مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ۝ (۱۵: ۴-۵)

اور ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا، مگر یہ کہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے قانون کے مطابق) ایک مقررہ میعاد اس کے لیے موجود تھی۔ کوئی اُمّت نہ تو اپنے مقررہ وقت سے آگے بڑھ سکتی ہے، نہ پیچھے رہ سکتی ہے۔

اس طرح "بقاء انفع" اور "قضاء بالحق" کا قانون پچھلی قوم کو چھانٹ دیتا ہے، اور اس کی جگہ ایک دوسری قوم لا کھڑی کرتا ہے، اور یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ "رحمت" کا مقتضا یہی ہے:

ذَٰلِكَ أَنْ لَمْ يَكُنْ رَبُّكَ

یہ (تبلیغ و ہدایت کا تمام سلسلہ) اس لیے ہے کہ تمہارے

اللہ کثیرًا وَلَیَنصُرَنَّ اللہ مَن یَنصُرُہٗ اِنَّ اللہ لَقَوِیٌّ عَزِیزٌ (۲۲:۴۰)

مسجدیں، جن میں اس کثرت سے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، منہدم ہو کر رہ جائیں!

"قضاء بالحق" کے اجتماعی نفاذ میں بھی تدریج و امہال اور تاجیل ہے۔

لیکن وہ کہتا ہے جس طرح فطرتِ کائنات کے تمام کاموں میں تدریج و امہال کا قانون کام کر رہا ہے، اسی طرح قوموں اور جماعتوں کے معاملہ میں بھی وہ جو کچھ کرتی ہے، بہ تدریج کرتی ہے اور اصلاحِ حال اور رجوع و انابت کا دروازہ آخر وقت تک کھلا رکھتی ہے۔ کیونکہ "رحمت" کا مقتضا یہی ہے:

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اُمَمًا مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّیِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ (۷: ۱۶۸)

اور ہم نے ایسا کیا کہ ان کے لیے الگ الگ گروہ میں پھیل گئے۔ ان میں سے بعض تو نیک عمل تھے بعض دوسری طرح کے، پھر ہم نے انھیں اچھائیوں اور برائیوں دونوں طرح کی حالتوں سے آزمایا کہ نافرمانی سے باز آجائیں۔

جس طرح اجسام کے ہر تغیر کے لیے فطرت نے اسباب و علل کی ایک خاص مقدار اور مدت مقرر کر دی ہے، اسی طرح اقوام کے زوال و ہلاکت کے لیے بھی موجباتِ ہلاکت کی ایک خاص مقدار اور مدت مقرر ہے۔ اور یہ ان کی "اجل" ہے۔ جب تک یہ اجل نہیں آ چکتی، قانونِ الٰہی یکے بعد دیگرے تنبہ و اعتبار کی مہلتیں دیتا رہتا ہے:

اَوَلَا یَرَوْنَ اَنَّهُمْ یُفْتَنُوْنَ فِیْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَیْنِ

کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ان پر کوئی برس ایسا نہیں گذرتا کہ ہم انھیں ایک مرتبہ یا دو مرتبہ آزمائشوں میں

لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا	والا صاحبِ رحمت ہے۔ اگر وہ ان لوگوں سے ان کے
لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ بَلْ	اعمال کے مطابق مواخذہ کرتا، تو فوراً عذاب نازل
لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا	ہو جاتا۔ لیکن ان کے لیے ایک میعاد مقرر کر دی گئی
مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ہ	ہے۔ اور وہ جب وہ نمودار ہو گی تو اس سے بچنے
(۱۸: ۵۸)	کے لیے کوئی پناہ کی جگہ انھیں نہیں ملے گی!
هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ	وہی ہے جس نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر تمھاری
طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًا ط	زندگی کے لیے ایک وقت ٹھہرا دیا اور اسی طرح اس کے
وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ہ	پاس ایک اور بھی ٹھہرائی ہوئی میعاد ہے (یعنی قیامت
(۶: ۲)	کا دن)۔

معنوی قوانین کی مہلت بخشی اور توبہ و انابت

وہ کہتا ہے جس طرح عالمِ اجسام میں تم دیکھتے ہو کہ فطرت نے ہر کمزوری و فساد کے لیے ایک لازمی نتیجہ ٹھہرا دیا ہے، لیکن پھر بھی اصلاحِ حال کا دروازہ بند نہیں کرتی اور مہلتوں پر مہلتیں دیتی رہتی ہے نیز اگر بروقت اصلاح ظہور میں آجائے تو اسے قبول کر لیتی ہے۔ ٹھیک ٹھیک اسی طرح یہاں بھی توبہ و انابت کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ کوئی بدعملی، کوئی گناہ، کوئی جرم، کوئی فساد ہو، اور نوعیت میں کتنا ہی سخت اور مقدار میں کتنا ہی عظیم ہو، لیکن جونہی توبہ و انابت کا احساس انسان کے اندر جنبش میں آتا ہے، رحمتِ الٰہی قبولیت کا دروازہ معاً کھول دیتی ہے، اور اشکِ ندامت کا ایک قطرہ بدعملیوں، گناہوں کے بے شمار داغ دھبّے اس طرح دھو دیتا ہے، گویا اس کے دامنِ عمل پر کوئی دھبّہ لگا ہی نہ تھا! اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ

مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ۝ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَ يَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۝

(۶: ۱۳۱ - ۱۳۳)

پروردگار کا یہ شیوہ نہیں کہ بستیوں کو ظلم و ستم سے ہلاک کر ڈالے، اور ان کے بسنے والے حقیقت حال سے بے خبر ہوں۔ (اس کا یہ قانون تو ہے) کہ جیسا کچھ جس کا عمل ہے، اسی کے مطابق اس کا ایک درجہ ہے (اور اسی درجہ کے مطابق اچھے بُرے نتائج ظاہر ہوتے ہیں) اور یاد رکھو، جیسے کچھ لوگوں کے اعمال ہیں تمھارا پروردگار ان سے بے خبر نہیں ہے، تمھارا پروردگار رحمت والا بے نیاز ہے۔ اگر وہ چاہے تو تمھیں راہ سے ہٹا دے، اور تمھارے بعد جسے چاہے، تمھارا جانشین بنا دے، اسی طرح، جس طرح ایک دوسری قوم کی نسل سے تمھیں اوروں کا جانشین بنا دیا ہے۔

انفرادی زندگی اور مجازاتِ دُنیوی

اسی طرح وہ کہتا ہے، یہ بات انفرادی زندگی کے اعمال کی جزاء دنیوی زندگی سے تعلق نہیں رکھتی۔ آخرت پر اُٹھا کر رکھی گئی ہے، اور دنیا میں نیک و بد سب کے لیے یکساں طور پر مُہلتِ حیات اور فیضانِ معیشت ہے، اسی حقیقت کا نتیجہ ہے کہ یہاں "رحمت" کی کارفرمائی ہے۔ "رحمت" کا مقتضا یہی تھا کہ اس کے فیضان و بخشش میں کسی طرح کا امتیاز نہ ہو۔ اور مہلتِ حیات سب کو پوری طرح ملے۔ اس نے انسان کی انفرادی زندگی کے دو حصّے کر دیئے۔ ایک حصّہ دُنیوی زندگی کا ہے، اور سرتاسر مہلت ہے۔ دوسرا حصّہ مرنے کے بعد کا ہے اور جزا کا معاملہ اسی سے تعلق رکھتا ہے

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ اور (اے پیغمبر! یقین کرو) تمھارا پروردگار بڑا

انسان کی روحانی زندگی کو کائناتِ فطرت کے عالمگیر کارخانہ سے کوئی الگ اور غیر متعلق چیز قرار نہیں دیتا۔ بلکہ اسی کا ایک مربوط گوشہ قرار دیتا ہے، اور اس لیے کہتا ہے جس کارسازِ فطرت نے تمام کارخانۂ ہستی کی بنیاد "رحمت" پر رکھی ہے، ضروری تھا کہ اس گوشے میں بھی اس کے تمام احکام سر تا سر "رحمت" کی تصویر ہوں

خدا اور اس کے بندوں کا رشتہ محبّت کا رشتہ ہے

چنانچہ قرآن نے جا بجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ خدا اور اس کے بندوں کا رشتہ محبّت کا رشتہ ہے اور سچی عبودیت اسی کی عبودیّت ہے جس کے لیے معبود صرف معبود ہی نہ ہو بلکہ محبوب بھی ہو۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ	اور (دیکھو) انسانوں میں سے کچھ انسان ایسے ہیں
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا	جو دوسری ہستیوں کو اللہ کا ہم پلّہ بنا لیتے ہیں۔
يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ	وہ انھیں اس طرح چاہنے لگتے ہیں جس طرح
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ	اللہ کا چاہنا ہوتا ہے۔ حالانکہ جو لوگ ایمان رکھنے
حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ (۲ : ۱۶۵)	والے ہیں، انکی زیادہ سے زیادہ محبت صرف اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے
قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ	(اے پیغمبر! ان لوگوں سے) کہدو، اگر واقعی تم
فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ	اللہ سے محبت رکھنے والے ہو، تو چاہیئے کہ میری
وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ	پیروی کرو (میں تمھیں محبتِ الٰہی کی حقیقی راہ دکھا
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝	رہا ہوں) اگر تم نے ایسا کیا تو صرف یہی نہیں ہوگا

کہ تم اللہ سے محبّت کرنے والے ہو جاؤ گے بلکہ خود) اللہ تم سے محبت کرنے لگیگا اور تمھارے گناہ بخش دے گا۔ اور اللہ بخشنے والا رحمت والا ہے!

وہ جا بجا اس حقیقت پر زور دیتا ہے کہ ایمان باللہ کا نتیجہ اللہ کی محبّت اور محبوبیت ہے۔

إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝

ہاں، مگر جس کسی نے توبہ کی، ایمان لایا، اور آئندہ کے لیے نیک عملی اختیار کی۔ تو یہ لوگ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ اچھائیوں سے بدل دیتا ہے، اور اللہ بڑا بخشنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے!

رحمتِ الٰہی اور مغفرت و بخشش کی وسعت و فراوانی

اس بارے میں قرآن نے رحمتِ الٰہی کی وسعت اور اس کی مغفرت و بخشش کی فراوانی کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ کتنے ہی گناہ ہوں، کتنے ہی سخت گناہ ہوں، کتنی ہی مدت کے گناہ ہوں، لیکن ہر اس انسان کے لیے جو اس کے دروازۂ رحمت پر دستک دے رحمت و قبولیت کے سوا کوئی صدا نہیں ہو سکتی!

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝

اے میرے بندو! جنھوں نے بدعملیاں کرکے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، (تمھاری بدعملیاں کتنی ہی سخت اور کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں) مگر اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ یقیناً اللہ تمھارے تمام گناہ بخش دے گا۔ یقیناً وہ بڑا بخشنے والا، بڑی ہی رحمت رکھنے والا ہے!

اسلامی عقائد کا دینی تصور اور رحمت

اور پھر یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، قرآن نے انسان کے لیے دینی عقائد و اعمال کا جو تصور قائم کیا ہے، اس کی بنیاد بھی تمام تر رحمت و محبت ہی پر رکھی ہے، کیونکہ وہ

اما علمت ان عبدی فلانا	ایسا کیونکر ہو سکتا ہے اور تو تو رب العالمین ہے۔ خدا
مرض فلم تعدہ؟ اما علمت	فرمائیگا کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں تیرے قریب
انک لو عدتہ لوجدتنی عندہ	بیمار ہو گیا تھا، اور تو نے اس کی خبر نہیں لی تھی۔ اگر
یا ابن آدم، استطعمتک فلم	تو اس کی بیمار پرسی کے لیے جاتا تو مجھے اس کے پاس
تطعمنی، قال یا رب کیف	پاتا۔ اسی طرح خدا فرمائیگا کہ اے ابن آدم! میں نے تجھ
اطعمک وانت رب العلمین؟	سے کھانا مانگا تھا، مگر تو نے نہیں کھلایا۔ بندہ عرض
قال اما علمت انہ استطعمک	کریگا بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ تجھے کسی بات
عبدی فلان فلم تطعمہ اما	کی احتیاج ہو۔ خدا فرمائے گا کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے
علمت انک لو اطعمتہ لوجدت	فلاں بھوکے بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے
ذلک عندی یا ابن آدم،	انکار کر دیا تھا۔ اگر تو اسے کھلاتا تو تو اسے میرے پاس
استسقیتک فلم تسقنی قال	پاتا۔ ایسے ہی خدا فرمانے گا اے ابن آدم! میں نے
کیف اسقیک وانت رب العلمین	تجھ سے پانی مانگا مگر تو نے مجھے پانی نہ پلایا۔ بندہ
قال استسقاک عبدی فلان فلم	عرض کرے گا۔ بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ تجھے پیاس
تسقہ اما انک لو سقیتہ لوجدت	لگے تو تو خود پروردگار ہے؟ خدا فرمائے گا میرے فلاں
ذلک عندی (مسلم عن	پیاسے بندے نے تجھ سے پانی مانگا لیکن تو نے اسے
ابی ھریرۃ)	پانی نہ پلایا۔ اگر تو اسے پانی پلا دیتا تو اسے میرے پاس پاتا۔

اعمال وعبادات اور اخلاق وخصائل

اسی طرح قرآن نے اعمال وعبادات کی جو شکل و نوعیت قرار دی ہے اخلاق وخصائل میں سے جن جن باتوں پر زور دیا ہے، اوامر و نواہی میں جو جو اصول و مبادی ملحوظ رکھے ہیں، ان سب میں بھی یہی حقیقت کام کر رہی ہے اور یہ

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ	اے پیروان دعوت ایمانی! اگر تم میں سے کوئی شخص
یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ	دین کی راہ سے پھر جائے گا تو (وہ یہ نہ سمجھے کہ
فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ	دعوت حق کو اس سے کوئی نقصان پہنچیگا) عنقریب
یُّحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗۤ	اللہ ایک گروہ ایسے لوگوں کا پیدا کر دے گا جنھیں
(۵: ۵۹)	اللہ کی محبت حاصل ہوگی اور وہ اللہ کو محبوب رکھنے والے ہونگے

جو خدا سے محبت کرنا چاہتا ہے، اسے چاہیئے کہ اس کے بندوں سے محبت کرے

لیکن بندے کے لیے خدا کی محبت کی عملی راہ کیا ہے؟ وہ کہتا ہے خدا کی محبت کی راہ اس کے بندوں کی محبت میں سے ہوکر گذری ہے، جو انسان چاہتا ہے خدا سے محبت کرے، اسے چاہیئے کہ خدا کے بندوں سے محبت کرنا سیکھے:

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ (۲: ۱۷۷)	اور جو اپنا مال اللہ کی محبت میں نکالتے اور خرچ کرتے ہیں
وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ	اور اللہ کی محبت میں وہ مسکینوں، یتیموں،
مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا۔ اِنَّمَا	قیدیوں کو کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں) ہمارا
نُطْعِمُکُمْ لِوَجْہِ اللّٰہِ لَا نُرِیْدُ	یہ کھلانا، اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ محض اللہ
مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا	کے لیے ہے، ہم تم سے نہ تو کوئی بدلہ چاہتے
(۷۶: ۸-۹)	ہیں، نہ کسی طرح کی شکر گذاری!

ایک اور حدیث میں یہی حقیقت نہایت ... موثر پیرایہ میں واضح کی گئی ہے۔

یا ابن آدم! مرضت فلم	(قیامت کے دن ایسا ہوگا کہ خدا ایک انسان سے
تعدنی۔ قال کیف اعودک	کہے گا) اے ابن آدم! میں بیمار ہوگیا تھا، مگر تونے
وانت رب العلمین؟ قال	میری بیمار پرسی نہ کی۔ بندہ متعجب ہوکر کہے گا بھلا

ہے۔ الرحمٰن تبارک وتعالیٰ۔ ارحموا من فی الارض، یرحمکم من فی السماء[1]

اتنا ہی نہیں، بلکہ اسلام نے انسانی رحمت وشفقت کی جو ذہنیت پیدا کرنا چاہی ہو وہ اس قدر وسیع ہو کہ بے زبان جانور بھی اس سے باہر نہیں ہیں۔ ایک سے زیادہ حدیثیں اس مضمون کی موجود ہیں کہ اللہ کی رحمت رحم کرنے والوں کے لیے ہے۔ اگرچہ رحم ایک چڑیا ہی کے لیے کیوں نہ ہو۔ من رحم، ولو ذبیحۃ عصفور، رحمہ اللہ یوم القیٰمۃ[2]!

مقام انسانیت اور صفات الٰہی سے تخلق وتشبہ

اصل یہ ہو کہ قرآن نے خدا پرستی کی بنیاد ہی اس جذبے پر رکھی ہے کہ انسان خدا کی صفتوں کا پرتو اپنے اندر پیدا کرے۔ وہ انسان کے وجود کو ایک ایسی سرحد قرار دیتا ہی جہاں حیوانیت کا درجہ ختم ہوتا اور ایک مافوق حیوانیت درجہ شروع ہو جاتا ہی۔ وہ کہتا ہی انسان کا جوہر انسانیت جو اُسے حیوانات کی سطح سے بلند وممتاز کرتا ہی، اس کے سوا کچھ نہیں کہ صفاتِ الٰہی کا پرتو ہے اور اس لیے انسانیت کی تکمیل یہ ہو کہ اس میں زیادہ سے زیادہ، صفاتِ الٰہی سے تخلّق وتشبّہ پیدا ہو جائے۔ یہی وجہ ہو کہ اس نے جہاں کہیں بھی انسان کی خاص صفات کا ذکر کیا ہی، انھیں براہِ راست خدا کی طرف نسبت دی ہی۔ حتیٰ کہ جوہر انسانیت کو خدا

---

[1] امام احمد نے مسند میں، ترمذی اور ابو داؤد نے صحیح میں اور حاکم نے مستدرک میں، ابن عمر سے روایت کی ہے۔ ورویناہ مسلسلا من طریق الشیخ محمود الشکری الالوسی العراقی وایضاً عن والدی المرحوم عن الشیخ صدر الدین الدھلوی من طریق الشیخ احمد ولی اللہ رحمھم اللہ

[2] رواہ البخاری فی الادب المفرد والطبرانی عن ابی امامۃ وصححہ السیوطی فی الجامع الصغیر ۱۲

چیز اس درجہ واضح و معلوم ہے کہ بحث و بیان کی ضرورت نہیں۔

قرآن سرتا سر رحمتِ الٰہی کا پیام ہے!

اور پھر یہی وجہ ہے کہ قرآن نے خدا کی کسی صفت کو بھی اس کثرت کے ساتھ نہیں دہرایا ہے اور نہ کوئی مطلب اس کے صفحات میں اس درجہ نمایاں ہے جس قدر رحمت ہے۔ اگر قرآن کے وہ تمام مقامات جمع کیے جائیں جہاں "رحمت" کا ذکر کیا گیا تو تین سو سے زیادہ مقامات ہوں گے۔ اگر وہ تمام مقامات بھی شامل کر لیے جائیں جہاں اگرچہ لفظ رحمت استعمال نہیں ہوا ہے، لیکن ان کا تعلق رحمت ہی سے ہے مثلاً ربوبیت، مغفرت، رأفت، کرم، حلم، عفو وغیرہا، تو پھر یہ تعداد اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ کہا جا سکتا ہے، قرآن اول سے لے کر آخر تک اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ رحمتِ الٰہی کا پیام ہے!

بعض احادیثِ باب

ہم اس موقع پر وہ تمام تصریحات قصداً چھوڑ رہے ہیں جن کا ذخیرہ احادیث میں موجود ہے، کیونکہ یہ مقام زیادہ تفصیل و بحث کا متحمل نہیں۔ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے قول و عمل سے اسلام کی جو حقیقت ہمیں بتائی ہے، وہ تمام تر یہی ہے کہ خدا کی موحدانہ پرستش اور اس کے بندوں پر شفقت و رحمت۔ ایک مشہور حدیث جو ہر مسلمان واعظ کی زبان پر ہے، ہمیں بتلاتی ہے کہ انما یرحم اللہ من عبادہ الرحماء[1] خدا کی رحمت ان ہی بندوں کے لیے ہے، جو اس کے بندوں کے لیے رحمت رکھتے ہیں، حضرت مسیح (علیہ السلام) کا مشہور کلمۂ وعظ "زمین پر رحم کرو تاکہ وہ، جو آسمان پر ہے، تم پر رحم کرے" بجنسہٖ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان پر بھی طاری ہوا

[1] طبرانی و ابن جریر بسند صحیح ۱۲

الْمُحْسِنِيْنَ ﴿ج﴾ (۳: ۱۳۴) ایسے ہی جو احسان کرنے والے ہیں!

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (۱۳: ۲۲)

اور جن لوگوں نے اللہ کی محبت میں (تلخی و ناگواری) برداشت کرلی، نماز قائم کی، خدا کی دی ہوئی روزی پوشیدہ و علانیہ اس کے بندوں کے لیے خرچ کی اور برائی کا جواب برائی سے نہیں نیکی سے دیا (تو یقین کرو) یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت کا بہتر ٹھکانہ ہے۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۴۲: ۴۳)

اور (دیکھو) جو کوئی بُرائی پر صبر کرے اور بخش دے تو یقیناً یہ بڑی ہی اولوالعزمی کی بات ہے!

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴿۰﴾ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ﴿ج﴾ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۰﴾ (۴۱: ۳۴، ۳۵)

اور (دیکھو) نیکی اور بدی برابر نہیں ہوسکتی۔ (اگر کوئی بُرائی کرے تو) برائی کا جواب ایسے طریقے سے دو جو اچھا طریقہ ہو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تم دیکھو گے کہ جس شخص سے تمھاری عداوت تھی، یکایک تمھارا دلی دوست ہوگیا ہے۔ البتہ یہ ایسا مقام ہے جو اسی کو مل سکتا ہے جو (بدلہ لینے کی) برداشت رکھتا ہو اور جسے (نیکی و سعادت کا حصہ وافر ملا ہو۔

بلاشبہ اس نے بدلہ لینے سے بالکل روک نہیں دیا، اور وہ کیونکر روک سکتا تھا جب کہ طبیعتِ حیوانی کا یہ فطری خاصہ ہے اور حفاظتِ نفس اس پر موقوف ہے، لیکن جہاں کہیں بھی اس نے اس کی اجازت دی ہے، ساتھ ہی عفو و بخشش اور بدی کے بدلے

کی روح پھونک دینے سے تعبیر کیا :- ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ (۳۲ : ۸) یعنی خدا نے آدم میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک دیا اور اسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے اندر عقل و دانش کا چراغ روشن ہو گیا۔

درازل پرتو حسنت ز تجلی دم زد   عشق پیدا شد و آتش بہ ہمہ عالم زد

پس اگر وہ خدا کی رحمت کا تصور ہم میں پیدا کرنا چاہتا ہے تو یہ اس لیے ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ ہم بھی سراپا رحمت و محبت ہو جائیں۔ اگر وہ اپنی ربوبیت کا مرقع بار بار ہماری نگاہوں کے سامنے لاتا ہے تو یہ اسلیے کہ وہ چاہتا ہے ہم بھی اپنے چہرۂ اخلاق میں ربوبیت کے سارے خال و خط پیدا کر لیں۔ اگر وہ اس کی رافت و شفقت کا ذکر کرتا ہے، اس کے لطف و کرم کا جلوہ دکھاتا ہے، اس کے جود و احسان کا نقشہ کھینچتا ہے تو اسی لیے کہ وہ چاہتا ہے، ہم میں بھی ان الٰہی صفتوں کا جلوہ نمودار ہو جائے۔ وہ بار بار ہمیں سناتا ہے کہ خدا کی بخشش و درگزر کی کوئی انتہا نہیں! اور اس طرح ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہم میں بھی اس کے بندوں کے لیے بخشش و درگذر کا غیر محدود جوش پیدا ہو جانا چاہیئے۔ اگر ہم اس کے بندوں کی خطائیں بخش نہیں سکتے تو ہمیں کیا حق ہے کہ اپنی خطاؤں کے لیے اس کی بخشائشوں کا انتظار کریں۔

احکام و شرائع   جہاں تک احکام و شرائع کا تعلق ہے، بلاشبہ اس نے یہ نہیں کہا کہ دشمنوں کو پیار کرو، کیونکہ ایسا کہنا حقیقت نہ ہوتی۔ مجاز ہوتا۔ لیکن اس نے کہا کہ دشمنوں کو بھی بخش دو، اور جو دشمن کو بخش دینا سیکھ لیگا، اس کا دل خود بخود انسانی بغض و نفرت کی آلودگیوں سے پاک ہو جائے گا۔

الْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ   غصہ ضبط کرنے والے، اور انسانوں کے قصور

عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ   بخش دینے والے، اور اللہ کی محبت انہی کے

ہیں۔ "تم نے سنا ہوگا کہ اگلوں سے کہا گیا، دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ، لیکن میں کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا" یا "اپنے ہمسایوں ہی کو نہیں بلکہ دشمنوں کو بھی پیار کرو" یا مثلاً "اگر کوئی تمھارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو چاہیے کہ دوسرا گال بھی کر دو" سوال یہ ہے کہ ان خطابات کی نوعیت کیا تھی؟ یہ اخلاقی فضائل وایثار کا ایک موثر پیرایۂ بیان تھا، یا تشریع یعنی قوانین وضع کرنا تھا؟

دعوتِ مسیح اور دنیا کی حقیقت فراموشی

افسوس ہے کہ انجیل کے معتقدوں اور نکتہ چینوں دونوں نے یہاں ٹھوکر کھائی۔ دونوں اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ یہ تشریع تھی۔ اور اس لیے دونوں کو تسلیم کر لینا پڑا کہ یہ ناقابلِ عمل احکام ہیں۔ معتقدوں نے خیال کیا کہ اگرچہ ان احکام پر عمل نہیں کیا جا سکتا، تاہم مسیحیت کے احکام یہی ہیں، اور عملی نقطۂ خیال سے اس قدر کافی ہے کہ اوائل عہد میں چند ولیوں اور شہیدوں نے ان پر عمل کر لیا تھا۔ نکتہ چینوں نے کہا، کہ یہ سر تا سر ایک نظری اور ناقابلِ عمل تعلیم ہے، اور کہنے میں کتنی ہی خوش نما ہو، لیکن عملی نقطۂ خیال سے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ یہ فطرتِ انسانی کے صریح خلاف ہے!

فی الحقیقت نوعِ انسانی کی یہ بڑی ہی درد انگیز ناانصافی ہے جو تاریخ انسانیت کے اس عظیم الشان معلّم کے ساتھ جائز رکھی گئی۔ جس طرح بے درد نکتہ چینوں نے اسے سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ اسی طرح نادان معتقدوں نے بھی فہم و بصیرت سے انکار کر دیا۔

حضرت مسیحؑ کی تعلیم کو فطرت انسانی کے خلاف سمجھنا تفریق بین الرسل ہے

لیکن کیا کوئی انسان جو قرآن کی سچّائی کا معترف ہو، ایسا خیال کر سکتا ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی تعلیم فطرتِ انسانی کے خلاف تھی اور اس لیے ناقابلِ عمل تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ قرآن

نیکی کرنے کی موثر ترغیب بھی دے دی ہو اور ایسی موثر ترغیب دی ہو کہ ممکن نہیں ایک خدا پرست انسان اس سے متاثر نہ ہو۔

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا	(اور دیکھو) اگر تم بدلہ لو تو چاہیئے، جتنی اور جیسی
بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ ۖ	کچھ برائی تمہارے ساتھ کی گئی ہے ٹھیک ٹھیک
وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ	اسی کے مطابق بدلہ بھی لیا جائے، ایسا نہ ہو کہ زیادتی
لِّلصَّابِرِينَ ۝ (١٦:١٢٦)	کر بیٹھو، لیکن اگر تم برداشت کر جاؤ اور بدلہ نہ لو، تو

(یاد رکھو) برداشت کرنے والوں کے لیے برداشت کر جانے ہی میں بہتری ہے!

وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ	اور برائی کے لیے ویسا ہی اور اتنا ہی بدلہ ہے جیسی
مِّثْلُهَا ۖ فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ	اور جتنی برائی کی گئی ہو، لیکن جس کسی نے درگذر کیا
فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ۚ	اور معاملہ کو بگاڑنے کی جگہ سنوار لیا تو اس کا اجر
(٤٢:٤٠)	اللہ پر ہے!

انجیل اور قرآن

ہم نے قرآن کی آیاتِ عفو و بخشش نقل کرتے ہوئے ابھی کہا ہے کہ اس نے یہ نہیں کہا کہ "دشمنوں کو پیار کرو" کیونکہ ایسا کہنا حقیقت نہ ہوتی مجاز ہوتا" ضروری ہے کہ اس کی مختصر تشریح کر دی جائے۔

حضرت مسیح (علیہ السلام) نے یہودیوں کی ظاہر پرستیوں اور اخلاقی محرومیوں کی جگہ رحم و محبت اور عفو و بخشش کی اخلاقی قربانیوں پر زور دیا تھا، اور ان کی دعوت کی اصلی روح یہی ہے، چنانچہ ہم انجیل کے مواعظ میں جا بجا اس طرح کے خطابات پاتے

مُقْضِيًّا ٥ (۱۹: ۲۱) | بتائیں، اور یہ بات (مشیتِ الٰہی میں) طے شدہ تھی
وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ | اور ان لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے (مسیحؑ کی)
اتَّبَعُوْہُ رَاْفَۃً وَّرَحْمَۃً | پیروی کی۔ ہم نے شفقت اور رحمت ڈال دی

اس موقع پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ قرآن نے جس قدر اوصاف خود اپنی نسبت بیان کیے ہیں، پوری فراخدلی کے ساتھ وہی اوصاف تورات و انجیل کے لیے بھی بیان کیے ہیں۔ مثلاً وہ جس طرح اپنے آپ کو ہدایت کرنے والا، روشنی رکھنے والا نصیحت کرنے والا، قوموں کا امام، متقیوں کا رہنما قرار دیتا ہے، ٹھیک اسی طرح پچھلے صحیفوں کو بھی ان تمام وصاف سے متصف قرار دیتا ہے۔ چنانچہ انجیل کی نسبت ہم جابجا پڑھتے ہیں وَاٰتَیْنٰہُ الْاِنْجِیْلَ فِیْہِ ھُدًی وَّنُوْرٌ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ مِنَ التَّوْرٰىۃِ وَھُدًی وَّمَوْعِظَۃً لِّلْمُتَّقِیْنَ ٥ (۵: ۴۶) یہ ظاہر ہے کہ جو تعلیم فطرتِ بشری کے خلاف اور ناقابل عمل ہو، وہ کبھی نور و ہدایت اور مَوْعِظَۃً لِّلْمُتَّقِیْنَ نہیں ہوسکتی۔

دعوتِ مسیحی کی حقیقت

اصل یہ ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی ان تمام تعلیمات کی وہ نوعیت نہ تھی جو غلطی سے سمجھ لی گئی، اور دنیا ہمیشہ انسان کی سب سے بڑی گمراہی اس کے انکار سے نہیں بلکہ کج اندیشانہ اعتراف ہی سے پیدا ہوئی ہے

حضرت مسیح کا ظہور ایک ایسے عہد میں ہوا تھا جبکہ یہودیوں کا اخلاقی تنزل انتہائی حد تک پہنچ چکا تھا۔ اور دل کی نیکی اور اخلاق کی پاکیزگی کی جگہ محض ظاہری احکام و رسوم کی پرستش اور دینداری و خدا پرستی سمجھی جاتی تھی۔ یہودیوں کے علاوہ جس قدر متمدن قومیں قرب و جوار میں موجود تھیں۔ مثلاً رومی، مصری، آشوری، وہ بھی انسانی رحم و محبت کی روح سے یکسر نا آشنا تھیں۔ لوگوں نے یہ بات تسلیم

کی تصدیق کے ساتھ ایسا منکرانہ خیال جمع نہیں ہوسکتا۔ اگر ہم ایک لمحے کے لیے بھی اسے تسلیم کرلیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم حضرت مسیحؑ کی تعلیم کی سچائی سے انکار کردیں، کیونکہ جو تعلیم فطرت انسانی کے خلاف ہو وہ کبھی انسان کے لیے سچی نہیں ہوسکتی، لیکن ایسا اعتقاد نہ صرف قرآن کی تعلیم کے خلاف ہوگا، بلکہ اس کی دعوت کی اصل بنیاد ہی متزلزل ہوجائے گی۔ اس کی دعوت کی بنیادی اصل یہ ہے کہ وہ دنیا کے تمام رہنماؤں کی یکساں طور پر تصدیق کرتا، اور سب کو خدا کی ایک ہی سچائی کا پیامبر قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے، پیروانِ مذہب کی سب سے بڑی گمراہی تفریق بین الرسل ہی ہے یعنی ایمان و تصدیق کے لحاظ سے خدا کے رسولوں میں تفریق کرنا، کسی ایک کو ماننا دوسروں کو جھٹلانا، یا سب کو ماننا، کسی ایک کا انکار کردینا۔ اسی لیے اس نے جابجا اسلام کی راہ یہ تبلائی ہے کہ

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ	ہم خدا کے رسولوں میں سے کسی کو بھی دوسروں
مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ	سے جدا نہیں کرتے (کہ کسی کو مانیں کسی کو نہ
مُسْلِمُونَ ۝ (۳:۸۴)	مانیں) ہم تو خدا کے آگے جھکے ہوئے ہیں، (اس

کی سچائی کہیں بھی آئی ہو اور کسی کی زبانی آئی ہو، ہمارا اس پر ایمان ہے!)

علاوہ بریں خود قرآن کریم نے حضرت مسیحؑ کی دعوت کا یہی پہلو جابجا نمایاں کیا ہے کہ وہ رحمت و محبت کے پیامبر تھے۔ اور یہودیوں کی اخلاقی خشونت و قساوت کے مقابلے میں مسیحی اخلاق کی رقت و رافت کی بار بار مدح کی ہے:

وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِّلنَّاسِ وَ	اور تاکہ ہم اس کو (یعنی مسیحؑ کے ظہور کو) لوگوں
رَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ أَمْرًا	کے لیے ایک الٰہی نشانی اور اپنی رحمت کا فیضان

انھوں نے جہاں کہیں یہ کہا ہے کہ "دشمنوں کو پیار کرو" تو یقیناً اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ ہر انسان کو چاہیے، اپنے دشمنوں کا عاشق زار ہو جائے بلکہ سیدھا سادہ مطلب یہ تھا کہ تم میں غیظ و غضب اور نفرت و انتقام کی جگہ رحم و محبّت کا پُرجوش جذبہ ہونا چاہیئے اور ایسا ہونا چاہیئے کہ دوست تو دوست دشمن تک کے ساتھ عفو و درگذر سے پیش آؤ۔ اس مطلب کے لیے کہ رحم کرو، بخش دو، انتقام کے پیچھے نہ پڑو، یہ ایک نہایت ہی بلیغ و موثر پیرایۂ بیان ہے کہ "دشمنوں تک کو پیار کرو"۔ ایک ایسے گردوپیش میں جہاں اپنوں اور عزیزوں کے ساتھ بھی رحم و محبّت کا برتاؤ نہ کیا جاتا ہو، یہ کہنا کہ اپنے دشمنوں سے بھی نفرت نہ کرو۔ رحم و محبت کی صورت کا ایک اعلیٰ اور کامل ترین تخیّل پیدا کرنا تھا۔

شنیدم کہ مردانِ راہِ خُدا — دلِ دشمناں ہم نہ کردند تنگ
ترا کے میسّر شود ایں مقام — کہ با دوستانت خلاف ست و جنگ

یا مثلاً اگر انھوں نے کہا "اگر کوئی تمھارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی آگے کر دو" تو یقیناً اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ سچ مچ تم اپنا گال آگے کر دیا کرو بلکہ صریح مطلب یہ تھا کہ انتقام کی جگہ عفو و درگذر کی راہ اختیار کرو، بلاغتِ کلام کے یہ وہ مجازات ہیں جو ہر زبان میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں، اور یہ ہمیشہ بڑی ہی جہالت کی بات سمجھی جاتی ہے کہ ان کے مقصود و مفہوم کی جگہ ان کے منطوق پر زور دیا جائے۔ اگر ہم اس طرح کے مجازات کو ان کے ظواہر پر محمول کرنے لگیں گے، تو نہ صرف تمام الہامی تعلیمات ہی درہم برہم ہو جائیں گی، بلکہ انسان کا وہ تمام کلام جو ادب و بلاغت کے ساتھ دنیا کی تمام زبانوں میں کہا گیا ہے، یک قلم مختل ہو جائے گا۔

اعمالِ انسانی میں اصل رحم و محبّت ہے نہ کہ تعزیر و انتقام

باقی رہی یہ بات کہ حضرت مسیحؑ نے سزا

کر لی تھی کہ مجرموں کو سزائیں دینی چاہئیں، لیکن اس حقیقت سے بے بہرہ تھے کہ رحم و محبت اور عفو و بخشش کی چارہ سازیوں سے جرموں اور گناہوں کی پیدائش رک دینی چاہیئے۔ انسانی قتل و ہلاکت کا تماشا دیکھنا، طرح طرح کے ہولناک طریقوں سے مجرموں کو ہلاک کرنا، زندہ انسانوں کو درندوں کے سامنے ڈال دینا، آباد شہروں کو جلا جلا کر خاکستر کر دینا اپنی قوم کے علاوہ تمام انسانوں کو غلام سمجھنا اور غلام بنا کر رکھنا رحم و محبّت اور حلم و شفقت کی جگہ قلبی قساوت و بے رحمی پر فخر کرنا، رومی تمدّن کا اخلاق اور مصری اور آشوری دیوتاؤں کا پسندیدہ طریقہ تھا۔

ضرورت تھی کہ نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے ایک ہستی مبعوث ہو جو سرتاسر رحمت و محبّت کا پیام ہو اور جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں سے قطع نظر کرکے صرف اس کی قلبی و معنوی حالت کی اصلاح و تزکیہ پر اپنی تمام پیغمبرانہ ہمّت مبذول کر دے چنانچہ حضرت مسیحؑ کی شخصیت میں وہ ہستی نمودار ہو گئی۔ اس نے جسم کی جگہ روح پر، زبان کی جگہ دل پر، اور ظاہر کی جگہ باطن پر نوعِ انسانی کو توجّہ دلائی اور انسانیتِ اعلیٰ کا فراموش شدہ سبق تازہ کر دیا۔

مواعظِ مسیحؑ کے مجازات کو تشریح حقیقت سمجھ لینا سخت غلطی ہے

معمولی سے معمولی کلام بھی، بشرطیکہ بلیغ ہو، اپنی بلاغت کے مجازات رکھتا ہے۔ قدرتی طور پر اس الہامی بلاغت کے بھی مجازات تھے۔ جو اس کی تاثیر کا زیور اور اس کی دل نشینی کی خوبرُوئی ہیں، لیکن افسوس کہ وہ دنیا جو اقانیم ثلاثہ اور کفّارہ جیسے دور از کار عقائد پیدا کر لینے والی تھی، ان کے مواعظ کا مقصد و محل نہ سمجھ سکی اور مجازات کو حقیقت سمجھ کر غلط فہمیوں کا شکار ہو گئی!

مسیحؑ نے تعزیر و عقوبت کی جگہ سرتاسر رحم و درگذر پر زور دیا تو یہ اس لیے نہیں تھا کہ وہ نفسِ تعزیر و سزا کے خلاف کوئی نئی تشریع کرنی چاہتے تھے، بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس ہولناک غلطی سے انسان کو نجات دلائیں جس میں تعزیر و عقوبت کے غلو نے مبتلا کر رکھا ہے۔ وہ دنیا کو بتانا چاہتے تھے کہ اعمالِ انسانی میں اصل رحم و محبّت ہے۔ تعزیر و انتقام نہیں ہے اور اگر تعزیر و سیاست جائز رکھی گئی ہے تو صرف اس لیے کہ بطور ایک ناگزیر علاج کے عمل میں لائی جائے۔ اس لیے نہیں کہ تمھارے دل رحم و محبّت کی جگہ سرتاسر نفرت و انتقام کا آشیانہ بن جائیں۔

شریعت موسوی کے پیرووں نے شریعت کو صرف سزا دینے کا آلہ بنا لیا تھا حضرت مسیحؑ نے بتلایا کہ شریعت سزا دینے کے لیے نہیں، بلکہ نجات کی راہ دکھلانے آتی ہے، اور نجات کی راہ سرتاسر رحمت و محبّت کی راہ ہے۔

"عمل" اور "عامل" میں امتیاز

دراصل اس بارے میں انسان کی بنیادی غلطی یہ رہی ہے کہ وہ "عمل" میں اور "عامل" میں امتیاز قائم نہیں رکھتا، حالانکہ جہاں تک مذہب کی تعلیم کا تعلّق ہے، اس بات میں کہ ایک عمل کیسا ہے، اور اس بات میں کہ کرنے والا کیسا ہے، بہت بڑا فرق ہے اور دونوں کا حکم ایک نہیں۔ بلا شبہ تمام مذاہب کا یہ عالمگیر مقصد رہا ہے کہ بدعملی اور گناہ کی طرف سے انسان کے دل میں نفرت پیدا کر دیں، لیکن انھوں نے کبھی گوارا نہیں کیا کہ خود انسان کی طرف سے انسان کے اندر نفرت پیدا ہو جائے۔ یقیناً انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ گناہ سے نفرت کرو، لیکن یہ کبھی نہیں کہا ہے کہ گنہگار سے نفرت کرو۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طبیب ہمیشہ لوگوں کو بیماریوں سے ڈراتا رہتا ہے، اور لسبا اوقات

کی جگہ محض رحم و درگذر ہی پر زور دیا، تو ان کے مواعظ کی اصلی نوعیت سمجھ لینے کے بعد بھی بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ بلا شبہ شرائع نے تعزیر و عقوبت کا حکم دیا تھا، لیکن اس لیے نہیں کہ تعزیر و عقوبت فی نفسہٖ کوئی مستحسن عمل ہے، بلکہ اس لیے کہ معیشتِ انسانی کی بعض ناگزیر حالتوں کے لیے یہ ایک ناگزیر علاج ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک کم درجہ کی برائی تھی جو اس لیے گوارا کر لی گئی کہ بڑے درجے کی برائیاں روکی جا سکیں۔ لیکن دنیا نے اسے علاج کی جگہ ایک دل پسند مشغلہ بنا لیا۔ اور رفتہ رفتہ انسان کی تعذیب و ہلاکت کا ایک خوفناک آلہ بن گئی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی قتل و غارتگری کی کوئی ہولناکی ایسی نہیں ہے جو شریعت اور قانون کے نام سے نہ کی گئی ہو، اور جو فی الحقیقت اسی بدلہ لینے اور سزا دینے کے حکم کا ظالمانہ استعمال نہ ہو۔ اگر تاریخ سے پوچھا جائے کہ انسانی ہلاکت کی سب سے بڑی قوتیں میدانہائے جنگ سے باہر کون کون سی رہی ہیں؟ تو یقیناً اس کی انگلیاں ان عدالت گاہوں کی طرف اُٹھ جائیں گی جو مذہب اور قانون کے ناموں سے قائم کی گئیں۔ اور جنھوں نے ہمیشہ اپنے ہم جنسوں کی تعذیب و ہلاکت کا عمل اس کی ساری وحشت انگیزیوں اور ہولناکیوں کے ساتھ جاری رکھا[۱]۔ پس اگر حضرت

[۱] شاید انسانی گمراہی کی بوالعجبیوں کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی کہ جس انجیل کی تعلیم کا یہ مطلب سمجھ لیا گیا تھا کہ وہ کسی حال میں بدلہ لینا اور سزا دینے کی اجازت نہیں دیتی اسی انجیل کے پیروؤں نے نوعِ انسانی کی تعذیب و ہلاکت کا عمل ایسی وحشت و بے رحمی کے ساتھ صدیوں تک جاری رکھا کہ آج ہم اس کا تصوّر بھی بغیر دہشت و ہراس کے نہیں کر سکتے، اور یہ سب جو کچھ کیا گیا، انجیل اور اس کے مقدس معلّم کے نام پر کیا گیا!

کھو کر اور زیادہ تمھارے رحم و شفقت کا مستحق ہو گیا ہی۔ تم اپنے بیمار بھائی کی تیمارداری کروگے، یا اسے جلّاد کے تازیانے کے حوالے کردوگے؟ وہ موقع یاد کرو جس کی تفصیل ہمیں سینٹ لوقا کی زبانی معلوم ہوئی ہے۔ جب ایک گناہگار عورت حضرت مسیحؑ کی خدمت میں آئی اور اس نے اپنے بالوں کی لٹوں سے ان کے پاؤں پونچھے تو اس پر ریاکار فریسیوں کو (اور اب فریسیت کے معنی ہی ریاکاری کے ہو گئے ہیں (PHARISAISM) سخت تعجب ہوا، لیکن انھوں نے کہا، طبیب بیماروں کے لیے ہوتا ہی نہ کہ تندرستوں کے لیے۔ پھر خدا اور اس کے گناہگار بندوں کا رشتۂ رحمت واضح کرنے کے لیے ایک نہایت ہی موثر اور دل نشین مثال بیان کی۔ فرض کرو، ایک ساہوکار کے دو قرضدار تھے۔ ایک پچاس روپے کا، ایک ہزار روپے کا ساہوکار نے دونوں کا قرض معاف کردیا۔ بتاؤ کس قرضدار پر اس کا احسان زیادہ ہوا اور کون اس سے زیادہ محبّت کرے گا، وہ جسے پچاس معاف کردیئے یا وہ جسے ہزار

نصیبِ ماست بہشت ای خداشناس برو   کہ مستحقِ کرامت گناہگارانند

یہی حقیقت ہے جس کی طرف بعض ائمۂ تابعین نے اشارہ کیا ہی: اِنکسار العاصیین اَحبُّ الی اللّٰہ من صولۃ المطیعین خدا کو فرمانبردار بندوں کی تمکنت سے کہیں زیادہ گناہگار بندوں کا عجز و انکسار محبوب ہی:

گدایاں را ازیں معنی خبر نیست   کہ سلطان جہاں با ماست امروز

قرآن اور گناہگار بندوں کے لیے صدائے تشریف و رحمت

اور پھر یہی حقیقت ہی کہ ہم قرآن میں دیکھتے ہیں، جہاں کہیں خدا نے گناہگار انسانوں کو مخاطب کیا ہی، یا ان کا ذکر کیا ہی، تو عموماً یائے نسبت کے ساتھ کیا ہی جو تشریف و محبّت پر دلالت کرتی ہے

ان کے مہلک نتائج کا ایسا ہولناک نقشہ کھینچ دیتا ہے کہ دیکھنے والے سہم کر رہ جاتے ہیں، لیکن یہ تو کبھی نہیں کرتا کہ جو لوگ بیمار ہو جائیں، ان سے ڈرنے اور نفرت کرنے لگے، یا لوگوں سے کہے "ڈرو اور نفرت کرو؟" اتنا ہی نہیں، بلکہ اس کی تو ساری توجہ اور شفقت کا مرکز بیمار ہی کا وجود ہوتا ہے۔ جو انسان جتنا زیادہ بیمار ہوگا، اتنا ہی زیادہ اس کی توجہ اور شفقت کا مستحق ہو جائے گا۔

مرض اور مریض

پس جس طرح جسم کا طبیب بیماریوں کے لیے نفرت لیکن بیمار کے لیے شفقت و ہمدردی کی تلقین کرتا ہے، ٹھیک اسی طرح روح و دل کے طبیب بیماریوں کے لیے نفرت لیکن گنہگاروں کے لیے سرتاپا رحمت و شفقت کا پیام ہوتے ہیں۔ یقیناً وہ چاہتے ہیں کہ گناہوں سے (جو روح و دل کی بیماریاں ہیں) ہم میں وحشت و نفرت پیدا کر دیں لیکن گناہوں سے پیدا کر دیں، گناہگار انسانوں سے نہیں، اور یہی وہ نازک مقام ہے جہاں پیروانِ مذہب نے ٹھوکر کھائی ہے۔ مذاہب نے چاہا تھا انھیں برائی سے نفرت کرنا سکھائیں، لیکن برائی سے نفرت کرنے کی جگہ انھوں نے ان انسانوں سے نفرت کرنا سیکھ لیا جنھیں وہ اپنے خیال میں برائی کا مجرم تصوّر کرتے ہیں!

گناہوں سے نفرت کرو
مگر گناہگاروں پر رحم کرو

حضرت مسیحؑ کی تعلیم سرتاسر اسی حقیقت کی دعوت تھی گناہوں سے نفرت کرو، مگر ان انسانوں سے نفرت نہ کرو جو گناہوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اگر ایک انسان گنہگار ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے روح و دل کی تن درستی باقی نہیں رہی۔ لیکن اگر اس نے بدبختانہ اپنی تندرستی ضائع کر دی ہے، تو تم اس سے نفرت کیوں کرو؟ وہ تو اپنی تندرستی

فدائے شیوۂ رحمت کہ در لباسِ بہار   بعذر خواہیٔ رندانِ بادہ نوش آمد

اصلاً انجیل اور قرآن کی تعلیم میں کوئی اختلاف نہیں

پس فی الحقیقت حضرت مسیح (علیہ السلام) کی تعلیم میں اور قرآن کی تعلیم میں اصلاً کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کا معیارِ احکام ایک ہی ہے۔ فرق صرف محلِ بیان اور پیرایۂ بیان کا ہے۔ حضرت مسیح نے صرف اخلاق اور تزکیۂ قلب پر زور دیا کیونکہ شریعتِ موسوی موجود تھی، اور وہ اس کا ایک نقطہ بھی بدلنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن قرآن کو اخلاق اور قانون دونوں کے احکام بہ یک وقت بیان کرنے تھے، اس لیے قدرتی طور پر اس نے پیرایۂ بیان ایسا اختیار کیا جو مجازات و تشابہات کی جگہ احکام و قوانین کا صاف صاف جچا تُلا پیرایۂ بیان تھا۔ اس نے سب سے پہلے عفو و درگذر پر زور دیا، اور اسے نیکی و فضیلت کی اصل قرار دیا۔ ساتھ ہی بدلہ لینے اور سزا دینے کا دروازہ بھی کھلا رکھا کہ ناگزیر حالتوں میں اس کے بغیر چارہ نہیں، لیکن نہایت قطعی اور واضح لفظوں میں بار بار کہہ دیا کہ بدلے اور سزا میں کسی طرح کی ناانصافی اور زیادتی نہیں ہونی چاہیئے۔ یقیناً دنیا کے تمام نبیوں اور شریعتوں کے احکام کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حتی تملأ خطایاکم ما بین السمآء والارض، ثم استغفرتم الله یغفر لکم والذی نفسی بیدہ لو لم تخطئوا لجاء الله بقوم یخطئون ثم یستغفرون فیغفر لھم۔ اخرجہ احمد و ابو یعلی باسناد رجالہ ثقات وعن ابن عمر مرفوعاً "لو لم تذنبوا لخلق الله خلقاً یذنبون ثم یغفر لھم اخرجہ احمد والبزار ورجالھم ثقات۔ ولخرج البزار من حدیث ابی سعید نحو حدیث ابی ھریرۃ فی الصحیح وفی اسنادہ یحیی بن بکیر وھو ضعیف۔

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ (۳۹: ۵۴) ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِیْ (۲۵: ۱۸) اس کی مثال بالکل ایسی ہی جیسے ایک باپ جوش محبت میں اپنے بیٹے کو پکارتا ہی، تو خصوصیت کے ساتھ اپنے اپنے رشتہ پدری پر زور دیتا ہے "اے میرے بیٹے!" "اے میرے فرزند!" حضرت امام جعفر صادق نے سورۂ زمر کی آیۂ رحمت کی تفسیر کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا ہے "جب ہم اپنی اولاد کو اپنی طرف نسبت دے کر مخاطب کرتے ہیں تو وہ بے خوف وخطر ہماری طرف دوڑنے لگتے ہیں۔ کیونکہ سمجھ جاتے ہیں، ہم ان پر غضبناک نہیں۔ قرآن میں خدا نے بیس سے زیادہ موقعوں پر ہمیں عِبَادِیْ کہہ کر اپنی طرف نسبت دی ہی۔ اور سخت سے سخت گناہگاروں کو بھی یٰعِبَادِیْ کہہ کر پکارا ہے۔ کیا اس سے بھی بڑھ کر اس کی آمرزش و رحمت کا کوئی پیام ہو سکتا ہی؟"

صحیح مسلم کی مشہور حدیث کا مطلب کس طرح واضح ہو جاتا ہی جب ہم اس روشنی میں اس کا مطالعہ کرتے ہیں:

والذی نفسی بیدہ لو	اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہی
لم تذنبوا لذھب اللہ	اگر تم ایسے ہو جاؤ کہ گناہ تم سے سرزد ہی نہ ہو تو
بکم ولجاء بقوم یذنبون	خدا تمھیں زمین سے ہٹا دے، اور تمھاری جگہ ایک دوسرا
فیستغفرون	گروہ پیدا کر دے جس کا شیوہ یہ ہو کہ گناہوں
(مسلم عن ابی ھریرۃ)[1]	میں مبتلا ہو، اور پھر خدا سے بخشش و مغفرت
	کی طلبگاری کرے۔

---

[1] و ایضًا عن انس قال صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفسی بیدہ لو اخطا تم

(باقی حاشیہ صفحہ آیندہ پر)

آشکارا ہو جائے کہ اگرچہ بدلے اور سزا کا دروازہ کھلا رکھا گیا ہے لیکن نیکی و فضیلت کی راہ عفو و درگذر ہی کی راہ ہے۔

پھر اس پہلو پر بھی نظر رہے کہ قرآن نے اس سزا کو جو برائی کے بدلے میں دی جائے برائی ہی کے لفظ سے تعبیر کیا "جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا" یعنی سیئۃ کے بدلے میں جو کچھ کیا جائے گا، وہ بھی سیئۃ ہی ہوگا۔ عملِ حسن نہیں ہوگا۔ لیکن اس کا دروازہ اس لیے باز رکھا گیا کہ اگر باز نہ رکھا جائے تو اس سے بھی زیادہ برائیاں ظہور میں آنے لگیں گی۔ پھر اس آدمی کی نسبت جو معاف کر دے، اصلح کا لفظ کہا۔ یعنی سنوارنے والا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہاں بگاڑ کے اصلی سنوارنے والے وہی ہوئے جو بدلے کی جگہ عفو و درگذر کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

قرآن کے زواجر و قوارع

ممکن ہے، بعض طبیعتیں یہاں ایک خارشہ محسوس کریں۔ اگر فی الحقیقت قرآن کی تمام تعلیم کا اصلِ اصول رحمت ہی ہے تو پھر اس نے اپنے مخالفوں کی نسبت زجرہ و توبیخ کا سخت پیرایہ کیوں اختیار کیا؟

اس کا مفصّل جواب تو اپنے محل میں آئے گا، لیکن تکمیلِ بحث کے لیے ضروری ہے کہ یہاں مختصراً اشارہ کر دیا جائے۔ بلاشبہ قرآن میں ایسے مقامات موجود ہیں جہاں اس نے اپنے مخالفوں کے لیے شدّت و غلظت کا اظہار کیا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کن مخالفو کے لیے؟ ان مخالفوں کے لیے جن کی مخالفت محض اختلافِ فکر و اعتقاد کی مخالفت تھی؟ یعنی ایسی مخالفت جو معاندانہ اور جارحانہ نوعیّت نہیں رکھتی تھی؟ نہیں اس سے

ماحصل یہی تین اصول رہے ہیں۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ	اور (دیکھو) برائی کے بدلے ویسی ہی اور اتنی
مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ	ہی برائی ہے لیکن جو کوئی بخش دے اور بگاڑنے کی
فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّهُ	جگہ سنوارے تو (یقین کرو) اس کا اجر اللہ کے
لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ۝ وَ	ذمہ ہے۔ اللہ ان لوگوں کو دوست نہیں رکھتا
لَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ	جو زیادتی کرنے والے ہیں۔
فَأُولَٰئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ	اور جس کسی پر ظلم کیا گیا ہو، اور وہ ظلم کے بعد
سَبِيلٍ ۗ إِنَّمَا السَّبِيلُ	اس کا بدلہ لے، تو اس پر کوئی الزام نہیں۔ الزام
عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ	ان لوگوں پر ہے جو انسانوں پر ظلم کرتے ہیں اور
النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي	ناحق ملک میں فساد کا باعث ہوتے ہیں۔ سو یہی
الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ	لوگ ہیں جن کے لیے عذاب الیم ہے۔
أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ	اور جو کوئی بدلہ لینے کی جگہ برائی برداشت
أَلِيمٌ ۝ وَلَمَنْ صَبَرَ	کر جائے اور بخش دے، تو یقیناً یہ بڑی ہی
وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ	اولوالعزمی کی بات ہے۔
عَزْمِ الْأُمُورِ ۝ (۴۲: ۴۳)	

اسلوب بیان پر غور کرو، اگرچہ ابتدا میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ" اور بظاہر عفو و درگذر کے لیے اتنا کہہ دینا کافی تھا لیکن آخر میں پھر دوبارہ اس پر زور دیا "وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ" یہ تکرار اس لیے ہے کہ عفو و درگذر کی اہمیت واضح ہو جائے یعنی یہ حقیقت اچھی طرح

جارحانہ انکار سے مقصود وہ حالت ہے جو صرف اتنے ہی پر قناعت نہیں کرتی بلکہ اس میں تمھارے خلاف ایک طرح کی کد اور ضد پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پھر یہ ضد بڑھتے بڑھتے بغض و عناد اور ظلم و شرارت کی سخت سے سخت صورتیں اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح کا مخالف صرف یہی نہیں کرتا کہ تم سے اختلاف رکھتا ہے بلکہ اس کے اندر تمھارے خلاف بغض و عناد کا ایک غیر محدود جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی زندگی اور زندگی کی ساری قوتوں کے ساتھ تمھاری بربادی و ہلاکت کے درپے ہو جائے گا۔ تم کتنی ہی اچھی بات کہو، وہ تمھیں جھٹلائے گا، تم کتنا ہی اچھا سلوک کرو، وہ تمھیں اذیت پہنچائیگا۔ تم کہو روشنی تاریکی سے بہتر ہے، تو وہ کہے تاریکی سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ تم کہو کڑواہٹ سے مٹھاس اچھی ہے، تو وہ کہے، نہیں، کڑواہٹ ہی میں دنیا کی سب سے بڑی لذت ہے۔ یہی حالت ہے جسے قرآن انسانی فکر و بصیرت کے تعطّل سے تعبیر کرتا ہے، اور اسی نوعیت کے مخالف ہیں جن کے لیے اس کے تمام زواجر و قوارع ظہور میں آئے ہیں۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا	ان کے پاس دل ہیں مگر سوچتے نہیں، ان کے
وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا	پاس آنکھیں ہیں، مگر دیکھتے نہیں، ان کے پاس
وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا	کان ہیں، مگر سنتے نہیں۔ وہ ایسے ہو گئے ہیں
أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ	جیسے چارپائے نہیں بلکہ چارپایوں سے بھی
أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝	زیادہ کھوئے ہوئے۔ بلاشبہ یہی لوگ ہیں
(۷ : ۱۷۹)	جو غفلت میں ڈوب گئے۔

ہمارے مفسّر اسی دوسری حالت کو "کفرِ جحود" سے تعبیر کرتے ہیں۔

دنیا میں جب کبھی سچّائی کی کوئی دعوت ظاہر ہوئی ہے تو کچھ لوگوں نے اسے قبول کر لیا

قطعاً انکار ہی۔ ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ تمام قرآن میں شدّت و غلظت کا ایک لفظ بھی نہیں مل سکتا۔ جو اس طرح کے مخالفوں کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔ اس نے جہاں کہیں بھی مخالفوں کا ذکر کرتے ہوئے سختی کا اظہار کیا ہے، اس کا تمام تر تعلق ان مخالفوں سے ہے جن کی مخالفت بغض و عناد اور ظلم و شرارت کی جارحانہ معاندت تھی، اور ظاہر ہے کہ اصلاح و ہدایت کی کوئی تعلیم بھی اس صورتِ حال سے گریز نہیں کر سکتی۔ اگر ایسے مخالفوں کے ساتھ بھی نرمی و شفقت ملحوظ رکھی جائے تو بلاشبہ یہ رحمت کا سلوک تو ہوگا مگر انسانیت کے لیے نہیں ہوگا، ظلم و شرارت کے لیے ہوگا، اور یقیناً سچی رحمت کا معیار یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ظلم و فساد کی پرورش کرے۔ ابھی چند صفحوں کے بعد تمھیں معلوم ہوگا کہ قرآن نے صفاتِ الٰہی میں رحمت کے ساتھ عدالت کو بھی اس کی جگہ دی ہے اور سورۂ فاتحہ میں ربوبیت اور رحمت کے بعد عدالت ہی کی صفت جلوہ گر ہوئی ہے کہ وہ رحمت سے عدالت کو الگ نہیں کرتا بلکہ اسے عینِ رحمت کا مقتضا قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے تم انسانیت کے ساتھ رحم و محبت کا برتاؤ کر ہی نہیں سکتے اگر ظلم و شرارت کے لیے تم میں سختی نہیں ہے۔ انجیل میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام بھی اپنے زمانے کے مفسدوں کو "سانپ کے بچے" اور "ڈاکوؤں کا مجمع" کہنے پر مجبور ہوئے۔

کفرِ محض اور کفرِ جارحانہ قرآن نے "کُفر" کا لفظ انکار کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ انکار دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ انکارِ محض ہو، ایک یہ کہ جارحانہ ہو۔

انکارِ محض سے مقصود یہ ہے کہ ایک شخص تمھاری تعلیم قبول نہیں کرتا اس لیے کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی، یا اس لیے کہ اس میں طلبِ صادق نہیں ہے، یا اس لیے کہ جو راہ چل رہا ہے، اسی پر قانع ہے۔ بہر حال کوئی وجہ ہو، لیکن وہ تم سے متفق نہیں ہے۔

(۵)

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

ربوبیت اور رحمت کے بعد جس صفت کا ذکر کیا گیا ہے، وہ عدالت ہے۔ اور اس کے لیے مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْن کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

الدِّیْن سامی زبانوں کا ایک قدیم مادہ "دان" اور "دین" ہے جو بدلہ اور مکافات کے معنوں میں بولا جاتا تھا۔ اور پھر آئین و قانون کے معنوں میں بھی بولا جانے لگا۔ چنانچہ عبرانی اور آرامی میں اس کے متعدد مشتقات ملتے ہیں۔ آرامی زبان ہی سے غالباً یہ لفظ قدیم ایران میں بھی پہنچا۔ اور پہلوی میں "دینیہ" نے شریعت و قانون کا مفہوم پیدا کر لیا۔ خورد اوستا میں ایک سے زیادہ موقع پر یہ لفظ مستعمل ہوا ہے اور زردشتیوں کی قدیم ادبیات میں انشاء و کتابت کے آئین و قواعد کو بھی دین دبیرہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ علاوہ بریں زردشتیوں کی ایک مذہبی کتاب کا نام "دین کارت" ہے جو غالباً نویں صدی مسیحی میں عراق کے ایک موبد نے مرتب کی تھی۔

بہرحال عربی میں "الدّین" کے معنی بدلہ اور مکافات کے ہیں۔ خواہ اچھائی کا ہو یا برائی کا۔

ستعلم لیلیٰ ای دین تداینت　　　وای غریم فی التقاضی غریمها

پس "مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْن" کے معنی ہوئے، وہ جزا کے دن حکمران ہے۔ یعنی روزِ قیامت کا۔

ہے، کچھ نے انکار کیا ہے، لیکن کچھ لوگ ایسے ہوئے ہیں، جنھوں نے ان کے خلاف طغیان وجحود اور ظلم وشرارت کی جتھہ بندی کر لی ہے، قرآن کا جب ظہور ہوا تو اس نے بھی یہ تینوں جماعتیں اپنے سامنے پائیں۔ اس نے پہلی جماعت کو اپنے آغوش تربیت میں لے لیا۔ دوسری کو دعوت وتذکیر کا مخاطب بنایا، مگر تیسری کے ظلم وطغیان پر حسب حالت وضرورت زجروتوبیخ کی۔ اگر ایسے گروہ کے لیے بھی اس کے لب ولہجہ کی سختی "رحمت" کے خلاف ہے، تو بلاشبہ اس معنی میں قرآن رحمت کا معترف نہیں اور یقیناً اس ترازو سے اس کی رحمت تولی نہیں جا سکتی۔

تم بار بار سن چکے ہو کہ وہ دین حق کے معنوی قوانین کو کائنات فطرت کے عام قوانین سے الگ نہیں قرار دیتا بلکہ انھیں کا ایک گوشہ قرار دیتا ہے۔ فطرت کائنات کا اپنے فعل وظہور کے ہر گوشے میں کیا حال ہے؟ یہ حال ہے کہ وہ اگرچہ سرتا سر رحمت ہے لیکن رحمت کے ساتھ عدالت اور بخشش کے ساتھ جزا کا قانون بھی رکھتی ہے۔ پس قرآن کہتا ہے، میں فطرت سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتا۔ تمہاری جس مزعومہ رحمت سے فطرت کا خزانہ خالی ہے یقیناً میرے آستین ودامن میں نہیں مل سکتی:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا	اللہ کی فطرت جس پر اللہ نے انسان کو
لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ الدِّيْنُ	پیدا کیا ہے، اللہ کی بناوٹ میں کبھی تبدیلی نہیں
الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ	ہو سکتی یہی دالله کی ٹھہرائی ہوئی فطرت سچا
لَا يَعْلَمُوْنَ ٥ (۳۰ : ۲۹)	اور ٹھیک ٹھیک دین ہے۔ لیکن اکثر انسان ایسے
	ہیں جو اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔

قرآن کے ان تمام مقامات پر نظر ڈالو جہاں اس نے سختی کے ساتھ منکروں کا ذکر کیا ہے، یہ حقیقت بیک نظر واضح ہو جائے گی۔

قوم بنا لیتا، کبھی جوشِ انتقام میں آکر بربادی و ہلاکت کے حوالے کر دیتا۔ عیسائیوں کا اعتقاد تھا کہ آدم کے گناہ کی وجہ سے اس کی پوری نسل مغضوب ہوگئی اور جب تک خدا نے اپنی صفتِ ابنیّت کو بشکل مسیح قربان نہیں کر دیا، اس کے نسلی گناہ اور مغضوبیت کا کفارہ نہ ہو سکا۔

مجازاتِ عمل کا معاملہ بھی دنیا کے عالمگیر قانونِ فطرت کا ایک گوشہ ہے

لیکن قرآن نے جزا و سزا کا اعتقاد ایک دوسری ہی شکل و نوعیت کا پیش کیا ہے۔ وہ اسے خدا کا کوئی ایسا فعل نہیں قرار دیتا جو کائناتِ ہستی کے عام قوانین و نظام سے الگ ہو، بلکہ اسی کا ایک قدرتی گوشہ قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے، کائناتِ ہستی کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ ہر حالت کوئی نہ کوئی اثر رکھتی ہے اور ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خاصہ ہے۔ ممکن نہیں یہاں کوئی شے اپنا وجود رکھتی ہو اور اثرات و نتائج کے سلسلہ سے باہر ہو۔ پس جس طرح غذا نے [illegible] ہیں خواص و نتائج رکھے ہیں، اسی طرح اعمال میں بھی خواص و نتائج ہیں، اور جس طرح جسم انسانی کے قدرتی انفعالات ہیں، اسی طرح روحِ انسانی کے لیے بھی قدرتی انفعالات ہیں۔ جسمانی موثرات جسم پر مرتب ہوتے ہیں۔ معنوی موثرات سے روح متاثر ہوتی۔ اعمال کے یہی قدرتی خواص و نتائج ہیں جنھیں جزا و سزا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اچھے عمل کا نتیجہ اچھائی ہے اور یہ ثواب ہے۔ برے عمل کا نتیجہ برائی ہے اور یہ عذاب ہے۔ ثواب اور عذاب کے ان تاثرات کی نوعیت کیا ہوگی؟ وحی الٰہی نے ہماری فہم و استعداد کے مطابق اس کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس نقشہ میں ایک مرقع بہشت کا ہے۔ ایک دوزخ کا۔ بہشت کے نعائم ان کے لیے ہیں جن کے اعمال بہشتی ہوں گے۔ دوزخ کی عقوبتیں ان کے لیے ہیں جن کے اعمال دوزخی ہوں گے:

اس سلسلے میں کئی باتیں قابلِ غور ہیں:

دین کے لفظ نے جزاء کی حقیقت واضح کردی

اوّلاً قرآن نے نہ صرف اس موقع پر بلکہ عام طور پر جزا کے لیے "الدّین" کا لفظ اختیار کیا ہے، اور اسی لیے وہ قیامت کو بھی عموماً "یَوْمِ الدِّیْن" سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ تعبیر اس لیے اختیار کی گئی کہ جزا کے بارے میں جو اعتقاد پیدا کرنا چاہتا تھا، اس کے لیے یہی تعبیر سب سے زیادہ موزوں اور واقعی تعبیر تھی۔ وہ جزاء کو اعمال کا قدرتی نتیجہ اور مکافات قرار دیتا ہے۔

نزولِ قرآن کے وقت پیروانِ مذاہب کا عالمگیر اعتقاد یہ تھا کہ جزا محض خوشنودی اور اس کے قہر و غضب کا نتیجہ ہے۔ اعمال کے نتائج کو اس میں دخل نہیں۔ الوہیت اور شاہیت کا تشابہ، تمام مذہبی تصوّرات کی طرح اس معاملے میں بھی گمراہی فکر کا موجب ہوا تھا۔ لوگ دیکھتے تھے کہ ایک مطلق العنان بادشاہ کبھی خوش ہوکر انعام و اکرام دینے لگتا ہے، کبھی بگڑ کر سزائیں دینے لگتا ہے۔ اس لیے خیال کرتے تھے کہ خدا کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ وہ کبھی ہم سے خوش ہو جاتا ہے۔ کبھی غیظ و غضب میں آجاتا ہے۔ طرح طرح کی قربانیوں اور چڑھاووں کی رسم اسی اعتقاد سے پڑی تھی۔ لوگ دیوتاؤں کا جوشِ غضب ٹھنڈا کرنے کے لیے قربانیاں کرتے اور ان کی نظرِ التفات حاصل کرنے کے لیے نذریں چڑھاتے۔

یہودیوں اور عیسائیوں کا عام تصوّر دیو بانی تصوّرات سے بلند ہوگیا تھا لیکن جہاں تک اس معاملے کا تعلق ہے، ان کے تصوّر نے بھی کوئی وسیع ترقی نہیں کی تھی۔ یہودی بہت سے دیوتاؤں کی جگہ، خاندان اسرائیل کا ایک خدا مانتے تھے، لیکن پرانے شہنشاہوں کی طرح یہ خدا بھی شاہی اور مطلق العنانی کا خدا تھا۔ یہ کبھی خوش ہوکر انھیں اپنی چہیتی

پاگل سمجھوگے۔ کیوں؟ اس لیے کہ فطرت کے قانونِ مکافات کا یقین تمھاری طبیعت میں راسخ ہوگیا ہے۔ تمھارے وہم و گمان میں بھی یہ خطرہ نہیں گذر سکتا کہ فطرت گیہوں لے کر اس کے بدلے میں جوار دیدے گی۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ تم یہ بھی نہیں مان سکتے کہ اچھے قسم کا گیہوں لے کر برے قسم کا گیہوں دے گی۔ تم جانتے ہو کہ وہ بدلہ دینے میں قطعی اور شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ پھر بتاؤ جو فطرت گیہوں کے بدلے گیہوں اور جوار کے بدلے جوار دے رہی ہے، کیونکر ممکن ہے کہ اچھے عمل کے بدلے اچھا اور برے عمل کے بدلے برا نتیجہ نہ رکھتی ہو؟

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا	جو لوگ برائیاں کرتے ہیں، کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم
السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ	انھیں ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان رکھتے
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَاۗءً	ہیں اور جن کے اعمال اچھے ہیں؟ دونوں برابر
مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاۗءَ	ہوجائیں زندگی میں بھی اور موت میں بھی؟ اگر
مَا يَحْكُمُوْنَ وَخَلَقَ اللّٰهُ	ان لوگوں کی فہم و دانش کا یہی فیصلہ ہے تو، افسوس
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ	ان کے اس فیصلے پر! اور اللہ نے زمین اور آسمان
وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا	کو بیکار اور عبث نہیں بنایا ہے، بلکہ حکمت و مصلحت
كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ	کے ساتھ بنایا ہے اور اس لیے بنایا ہے کہ ہر جان کو اس کی
(۴۵: ۲۱-۲۲)	کمائی کے مطابق بدلہ ملے، اور یہ بدلہ ٹھیک
	ٹھیک ملے گا۔ کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جزا و سزا کے لیے الدّین کا لفظ اختیار کیا، کیونکہ مکافاتِ عمل کا مفہوم ادا کرنے کے لیے سب سے زیادہ موزون لفظ یہی تھا۔

لَا يَسْتَوِیٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۵۹:۲۰﴾

اصحابِ جنت اور اصحاب دوزخ (اپنے اعمال و نتائج میں) یکساں نہیں ہو سکتے۔ کامیاب انسان وہی ہیں جو اصحابِ جنت ہیں

> جس طرح مادیات میں خواص و نتائج ہیں اسی طرح معنویات میں بھی ہیں۔

وہ کہتا ہے، تم دیکھتے ہو کہ فطرت ہر گوشۂ وجود میں اپنا قانونِ مکافات رکھتی ہے۔ ممکن نہیں کہ اس میں تغیر یا تساہل ہو۔ فطرت نے آگ میں یہ خاصہ رکھا ہے کہ جلائے۔ اب سوزش و تپش فطرت کی وہ مکافات ہوگئی جو ہر اُس انسان کے لیے ہے جو آگ کے شعلوں میں ہاتھ ڈال دیگا۔ ممکن نہیں کہ تم آگ میں کود و اور اس فعل کے مکافات سے بچ جاؤ۔ پانی کا خاصہ ٹھنڈک اور رطوبت ہے۔ یعنی ٹھنڈک اور رطوبت وہ مکافات ہے جو فطرت نے پانی میں ودیعت کردی ہے۔ اب ممکن نہیں کہ تم دریا میں اُترو اور اس مکافات سے بچ جاؤ۔ پھر جو فطرت کائناتِ ہستی کی ہر چیز اور ہر حالت میں مکافات رکھتی ہے، کیونکر ممکن ہے کہ انسان کے اعمال کے لیے مکافات نہ رکھے۔ یہی مکافات جزا و سزا ہے!

آگ جلاتی ہے، پانی ٹھنڈک پیدا کرتا ہے، سنکھیا کھانے سے موت، دودھ سے طاقت آتی ہے، کونین سے بخار رُک جاتا ہے۔ جب اشیاء کی ان تمام مکافات پر تمھیں تعجب نہیں ہوتا کیونکہ یہ تمھاری زندگی کی یقینیات ہیں، تو پھر اعمال کی مکافات پر کیوں تعجب ہوتا ہے؟ افسوس تم پر، تم اپنے فیصلوں میں کتنے ناہموار ہو!

تم گیہوں بوتے ہو، اور تمھارے دل میں کبھی یہ خدشہ نہیں گزرتا کہ گیہوں پیدا نہیں ہوگا۔ اگر کوئی تم سے کہے کہ ممکن ہے گیہوں کی جگہ جوار پیدا ہو جائے، تو تم اُسے

دیتا ہی اور بدعملی سے روکتا ہی، تو یہ صرف اس لیے ہی کہ انسان نقصان و ہلاکت سے بچے اور نجات و سعادت حاصل کرے۔ یہ بات نہیں ہی کہ خدا کا غضب و قہر اسے عذاب دینا چاہتا ہو اور اس سے بچنے کے لیے مذہبی ریاضتوں اور عبادتوں کی ضرورت ہو

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ	جس کسی نے نیک کام کیا تو اپنے لیے کیا اور
وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۗ وَمَا	جس کسی نے برائی کی تو خود اسی کے آگے آئیگی،
رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝	اور ایسا نہیں ہی کہ تمھارا پروردگار اپنے بندوں
(۴۱ : ۴۶)	کے لیے ظلم کرنے والا ہو!

ایک مشہور حدیث قدسی میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہی

یا عبادی ! لو انّ اوّلکم	اے میرے بندو! اگر تم میں سے سب انسان
وآخرکم وانسکم وجنّکم	جو پہلے گذر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے
کانوا علیٰ اتقیٰ قلب رجلٍ	اور تمام انس و جن۔ اس شخص کی طرح نیک ہو جاتے
واحدٍ منکم مازاد ذٰلک فی	جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہی، تو یاد رکھو، اس سے
ملکی شیئًا۔ یا عبادی !	میری خداوندی میں کچھ بھی اضافہ نہ ہوتا۔ اے میرے
لو انّ اوّلکم وآخرکم و	بندو! اگر وہ سب جو پہلے گذر چکے، اور وہ سب
انسکم وجنّکم کانوا علیٰ	جو بعد کو پیدا ہوں گے اور تمام انس اور تمام جن
افجر قلب رجلٍ واحدٍ منکم	اس شخص کی طرح بدکار ہو جاتے جو تم میں سب سے زیادہ
ما نقص ذٰلک من ملکی	بدکار ہی تو اس سے میری خداوندی میں کچھ بھی
شیئًا۔ یا عبادی! لو انّ	نقصان نہ ہوتا۔ اے میرے بندو! اگر وہ سب جو
اوّلکم وآخرکم وانسکم	پہلے گذر چکے، اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے

اصطلاحِ قرآنی میں "کسب" اور یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، اس نے اچھے بُرے کام کرنے کو جا بجا "کسب" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ "کسب" کے معنی عربی میں ٹھیک ٹھیک وہی ہیں جو اُردو میں کمائی کے ہیں۔ یعنی ایسا کام جس کے نتیجے سے تم کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہو، اگرچہ فائدہ کی جگہ نقصان بھی ہو جائے۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان کے لیے جزا اور سزا خود انسان ہی کی کمائی ہوگی۔ جیسی کسی کی کمائی ہوگی ویسا ہی نتیجہ پیش آئے گا۔ اگر ایک انسان نے اچھے کام کر کے اچھی کمائی کر لی ہے تو اس کے لیے اچھائی ہے۔ اگر کسی نے بُرائی کر کے بُرائی کمائی ہے تو اس کے لیے بُرائی ہے:

كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ (۵۲: ۲۱)	ہر انسان اس نتیجے کے ساتھ جو اس کی کمائی ہے بندھا ہوا ہے

سورۂ بقرہ میں جزا و سزا کا قاعدۂ کلیہ بتا دیا:

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲: ۲۸۶)	ہر انسان کے لیے وہی ہے جیسی کچھ اس کی کمائی ہوگی۔ جو کچھ اسے پانا ہے، وہ بھی اس کی کمائی ہے اور جس کے لیے اسے جواب دہ ہونا ہے، وہ بھی اس کی کمائی ہے۔

اسی طرح قوموں اور جماعتوں کی نسبت بھی ایک عام قاعدہ بتا دیا

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ٥ (۲: ۱۳۴)	یہ ایک اُمت تھی جو گذر چکی۔ اس کے لیے وہ نتیجہ تھا جو اس نے کمایا اور تمہارے لیے وہ نتیجہ ہے جو تم کماؤ گے

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا علاوہ بریں، صاف صاف لفظوں میں جا بجا یہ حقیقت واضح کر دی ...... کہ اگر دینِ الٰہی نیک عملی کی ترغیب

ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم قدیم اعتقاد سے نہ صرف مختلف ہے، بلکہ یکسر متضاد ہے
بہر حال جزاء و سزا کی اس حقیقت کے لیے "الدین" کا لفظ نہایت موزوں
لفظ ہے اور ان تمام گمراہیوں کی راہ بند کر دیتا ہے جو اس بارے میں پھیلی ہوئی تھیں
سورۂ فاتحہ میں مجرد اس لفظ کے استعمال نے جزا و سزا کی اصلی حقیقت آشکارا کر دی۔

الدین بمعنی قانون و مذہب

ثانیاً، یہی وجہ ہے کہ مذہب اور قانون کے لیے بھی "الدین" کا لفظ استعمال کیا گیا۔ کیونکہ مذہب کا بنیادی اعتقاد مکافاتِ عمل کا اعتقاد ہے، اور قانون کی بنیاد بھی تعزیر و سیاست پر ہے۔ سورۂ یوسف میں جہاں یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) نے اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے پاس روک لیا تھا، وہاں فرمایا: مَاكَانَ لِيَاخُذَ اَخَاهُ فِي دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (۱۲ : ۷۶) یہاں بادشاہِ مصر کے دین سے مقصود اس کا قانون ہے۔

"مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" میں عدالتِ الٰہی کا اعلان ہے

ثالثاً، یہاں ربوبیت اور رحمت کے بعد صفاتِ قہر و جلال میں سے کسی صفت کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی صفت بیان کی گئی جس سے عدالتِ الٰہی کا تصور ہمارے ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن نے خدا کی صفات کا جو تصور قائم کیا ہے، اس میں قہر و غضب کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ البتہ عدالت ضرور ہے اور صفاتِ قہریہ جس قدر دی گئی ہیں، دراصل اسی کے مظاہر ہیں۔

فی الحقیقت صفاتِ الٰہی کے تصور کا یہی مقام ہے جہاں فکرِ انسانی نے ہمیشہ ٹھوکر کھائی، یہ ظاہر ہے کہ فطرتِ کائنات ربوبیت و رحمت کے ساتھ اپنے مجازات بھی رکھتی ہے، اور اگر ایک طرف اس میں پرورش و بخشش ہے، تو دوسری طرف مواخذہ

وجنکم قاموا فی صعید	ایک مقام پر جمع ہو کر مجھ سے سوال کرتے، اور
واحد فسألونی فاعطیت	میں ہر انسان کو اس کی منہ مانگی مراد بخش دیتا
کل انسان مسئلتہ ما	تو میری بخشش و رحمت کے خزانے میں اس سے زیادہ
نقص ذلک مما عندی	کمی نہ ہوتی جتنی کمی سوئی کے ناکے جتنا پانی نکل جانے
الا کما ینقص المخیط	سے سمندر میں ہو سکتی ہے۔ اے میرے بندو! یاد
اذا دخل البحر۔ یاعبادی	رکھو، یہ تمھارے اعمال ہی ہیں جنھیں میں تمھارے
انما ھی اعمالکم احصیھا لکم ثم اوفیکم	لیے انضباط اور نگرانی میں رکھتا ہوں، اور پھر
ایاھا فمن وجد خیرا	انہی کے نتائج بغیر کسی کمی بیشی کے تمھیں واپس
فلیحمد اللہ ومن وجد	دے دیتا ہوں، پس جو کوئی تم میں اچھائی پائے،
غیر ذلک فلا یلومن	چاہیئے کہ اللہ کی حمد و ثنا کرے، اور جس کسی کو برائی
الا نفسہ (مسلم عن ابی ذرؓ)	پیش آئے تو چاہیئے کہ خود اپنے وجود کے سوا اور کسی

کو ملامت نہ کرے۔

یہاں یہ خدشہ کسی کے دل میں واقع نہ ہو کہ خود قرآن نے بھی تو جا بجا خدا کی خوشنودی اور نارضامندی کا ذکر کیا ہے؟ بلاشبہ کیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ انسان کی نیک عملی کا اعلیٰ درجہ یہی قرار دیتا ہے کہ جو کچھ کرے، صرف اللہ کی خوشنودی ہی کے لیے کرے۔ لیکن خدا کے جس رضا و غضب کا وہ اثبات کرتا ہے، وہ جزا و سزا کی علت نہیں بلکہ جزا و سزا کا قدرتی نتیجہ ہے۔ یعنی یہ نہیں کہتا کہ جزا و سزا محض خدا کی خوشنودی اور ناراضی کا نتیجہ ہے نیک و بد اعمال کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ کہتا ہے جزا و سزا تمام تر انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے، اور خدا نیک عملی سے خوشنود ہوتا ہے۔ بد عملی ناپسند کرتا

یہاں صرف ایک ہی ہے، اور وہ عدل و اعتدال ہے۔

عدل کے معنی ہیں، برابر ہونا، کم زیادہ نہ ہونا۔ اسی لیے معاملات اور قضایا میں فیصلہ کر دینے کو عدالت کہتے ہیں کہ حاکم دو فریقوں کی باہم دگر زیادتیاں دور کر دیتا ہے۔ ترازو کی تول کو بھی معادلت کہتے ہیں، کیونکہ وہ دونوں پلّوں کا وزن برابر کر دیتا ہے۔ یہی عدالت جب اشیاء میں نمودار ہوتی ہے تو ان کی کمیت اور کیفیت میں تناسب پیدا کر دیتی ہے۔ ایک جزء کا دوسرے جزء سے کمیت یا کیفیت میں مناسب و موزوں ہونا عدالت ہے۔

اب غور کرو، کارخانہ ہستی میں بناؤ اور خوبی کے جس قدر مظاہر ہیں، کس طرح اسی حقیقت سے ظہور میں آئے ہیں۔ وجود کیا ہے؟ حکیم بتلاتا ہے کہ عناصر کی ترکیب کا اعتدال ہے۔ اگر اس اعتدالی حالت میں ذرا بھی فتور واقع ہو جائے، وجود کی نمود معدوم ہو جائے۔ جسم کیا ہے؟ جسمانی مواد کی ایک خاص اعتدالی حالت ہے۔ اگر اس کا ایک جزء بھی غیر معتدل ہو جائے، جسم کی ہیئتِ ترکیبی بگڑ جائے۔ صحت و تندرستی کیا ہے؟ اخلاط کا اعتدال ہے۔ جہاں اس کا قوام بگڑا، صحت کا انحراف ہو گیا۔ حسن و جمال کیا ہے؟ تناسب و اعتدال کی ایک کیفیت ہے۔ اگر انسان میں ہے، تو خوبصورت انسان ہے، نباتات میں ہے تو پھول ہے۔ عمارت میں ہے تو تاج محل ہے۔ نغمہ کی حلاوت کیا ہے؟ سُروں کی ترکیب کا تناسب و اعتدال۔ اگر ایک سُر بھی بے میل ہوا نغمے کی کیفیت جاتی رہی۔

پھر کچھ اشیاء و اجسام ہی پر موقوف نہیں۔ کارخانۂ ہستی کا تمام نظام ہی عدل و توازن پر قائم ہے۔ اگر ایک لمحے کے لیے یہ حقیقت غیر موجود ہو جائے تو تمام نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے۔ یہ کیا بات ہے کہ نظامِ شمسی کا ہر کرہ اپنی اپنی جگہ معلق

مکافات بھی ہے۔ فکر انسانی کے لیے فیصلہ طلب سوال یہ تھا کہ فطرت کے مجازات اس کے قہر و غضب کا نتیجہ ہیں یا عدل و قسط کے؟ اس کا فکرِ نارسا عدل و قسط کی حقیقت معلوم نہ کر سکا۔ اس نے مجازات کو قہر و غضب پر محمول کر لیا اور یہیں سے خدا کی صفات میں خوف و دہشت کا تصور پیدا ہو گیا۔ حالانکہ اگر وہ فطرت کائنات کو زیادہ قریب ہو کر دیکھ سکتا تو معلوم کر لیتا کہ جن مظاہر کو قہر و غضب پر محمول کر رہا ہے، وہ قہر و غضب کا نتیجہ نہیں ہیں۔ بلکہ عین مقتضائے رحمت ہیں۔ اگر فطرت کائنات میں مکافات کا مواخذہ نہ ہوتا، یا تعمیر کی تحسین و تکمیل کے لیے تخریب نہ ہوتی، تو میزانِ عدل قائم نہ رہتا اور تمام نظامِ ہستی درہم و برہم ہو جاتا۔

کارخانۂ ہستی کے تین معنوی عناصر: ربوبیت، رحمت، عدالت

رابعاً: جس طرح کارخانۂ خلقت اپنے وجود و بقا کے لیے ربوبیت اور رحمت کا محتاج ہے، اسی طرح عدالت کا بھی محتاج ہے۔ یہی تین معنوی عنصر ہیں جن سے خلقت و ہستی کا قوام ظہور میں آیا ہے۔ ربوبیت پرورش کرتی ہے، رحمت افادہ و فیضان کا سرچشمہ ہے اور عدالت سے بناؤ اور خوبی ظہور میں آتی اور نقصان و فساد کا ازالہ ہوتا ہے۔

تعمیر و تحسین کے تمام حقائق دراصل عدل و توازن کا نتیجہ ہیں

تم نے ابھی ربوبیت اور رحمت کے مقامات کا مشاہدہ کیا ہے۔ اگر ایک قدم آگے بڑھو تو اسی طرح عدالت کا مقام بھی نمودار ہو جائے۔ تم دیکھو گے کہ اس کارخانۂ ہستی میں بناؤ، سلجھاؤ، خوبی اور جمال میں سے جو کچھ بھی ہے، اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ عدل و توازن کی حقیقت کا ظہور ہے۔ ایجاب و تعمیر کو تم اس کی بے شمار شکلوں میں دیکھتے ہو، اور اس لیے بے شمار ناموں سے پکارتے ہو، لیکن اگر حقیقت کا سراغ لگاؤ تو دیکھ لو کہ ایجابی حقیقت

اور سورۂ لقمان میں بھی اسی کی طرف اشارہ کیا ہے:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (۳۱: ۱۰) — اس نے آسمانوں کو (یعنی اجرام سماویہ کو) پیدا کر دیا اور تم دیکھ رہے ہو کہ کوئی ستون انھیں تھامے ہوئے نہیں ہے

یہ کہنا ضروری نہیں کہ عدل و تعادل کی حقیقت سمجھانے کے لیے میزان یعنی ترازو سے بہتر کوئی عام فہم اور دل نشین تعبیر نہیں ہو سکتی تھی۔

اسی طرح سورۂ آل عمران کی مشہور آیت شہادت میں قَائِمًا بِالْقِسْطِ (۳: ۱۸) کہہ کر اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی کائنات خلقت میں اس کے تمام کام عدالت کے ساتھ قائم ہیں، اور اس نے قیام ہستی کے لیے یہی قانون ٹھہرا دیا ہے۔

اعمالِ انسانی کا عدل و قسط پر مبنی ہونا قرآن کی اصطلاح میں "عمل صالح" ہے

قرآن کہتا ہے، جب عدالت کا یہ قانون کائنات خلقت کے ہر گوشے میں نافذ ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ انسان کے افکار و اعمال کے لیے بے اثر ہو جائے! پس اس گوشہ میں بھی وہی عمل مقبول ہوتا ہے جو افراط و تفریط اور میل و انحراف کی جگہ فطرت کے عدل و قسط پر مبنی ہوتا ہے، اور اسی کو وحی الٰہی عملِ صالح کے نام سے تعبیر کرتی ہے۔ اگر تعمیر و جمال کے سینکڑوں ناموں سے تمھیں مغالطہ نہیں ہوتا اور یہ بات پا لیتے ہو کہ ان سب میں اصل حقیقت ایک ہی ہے اور وہ عدالت ہے تو اس گوشہ میں ایمان و عمل کی اصطلاح سے تمھیں کیوں توحش ہو؟ اور کیوں بے تحاشا انکار کر بیٹھو؟

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ — کیا یہ لوگ چاہتے ہیں اللہ کا ٹھہرایا ہوا دین

وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ — چھوڑ کر کوئی دوسرا دین تلاش کریں، حالانکہ

وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا — آسمان اور زمین میں جو کوئی بھی ہے، سب اسی کے

ہیں۔ اپنے اپنے دائروں میں حرکت کر رہا ہے، اور ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ذرا بھی انحراف و میلان واقع ہو۔ یہی عدالت کا قانون ہے جس نے سب کو ایک خاص نظم کے ساتھ جکڑ بند کر رکھا ہے۔ تمام کرّے اپنی اپنی کشش رکھتے ہیں اور ان کے مجموعی جذب و انجذاب کے توازن سے ایسی حالت پیدا ہو گئی ہے کہ ہر کرّہ اپنی جگہ قائم و معلّق ہے۔ اگر کوئی کرّہ اس قانونِ عدالت سے باہر ہو جائے تو معًا دوسرے کروں سے ٹکرا جائے اور تمام نظامِ شمسی مختل ہو جائے۔

اعداد کے تناسب کی عظیم الشان صداقت جس پر ریاضی اور حساب کے تمام حقائق کا دار و مدار ہے، کیا ہے؟ یہی عدل و تعادل کی حقیقت ہے۔ جس دن یہ حقیقت ذہنِ انسانی پر کھلی تھی، علوم و معارف کے تمام دروازے باز ہو گئے تھے۔

وضع میزان

چنانچہ قرآن نے اس حقیقت کی طرف جا بجا اشارات کیے ہیں:

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ (۵۵: ۷-۸)	اور اس نے آسمان کو بلند کر دیا، اور (اجرامِ سماویہ کے قیام کے لیے قانونِ عدالت کا) میزان بنا دیا۔

یہ "المیزان" یعنی ترازو کیا ہے؟ تعادل و توازن کا قانون ہے جو تمام اجرامِ سماویّہ کو ان کی مقررہ جگہ میں تھامے ہوئے ہے اور کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کے توازن کا پلّہ کسی ایک طرف کو جھک پڑے۔ اجرامِ سماویہ کا یہی وہ غیر مرئی ستون ہے جس کی نسبت سورۂ رعد میں فرمایا:

اَللّٰهُ الَّذِي رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (۱۳: ۲)	اللہ جس نے آسمانوں کو (یعنی اجرامِ سماویہ کو) بغیر ستون کے بلند کر دیا ہے اور تم (اس کی یہ حکمت) دیکھ رہے ہو!

لیکن اگر ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے تو یہ اسراف ہوگا۔ دریا میں روپیہ پھینک دینا روپیہ خرچ کرنے کا صحیح محل نہیں ہے۔ اگر تم روپیہ پانی میں پھینک دو تو یہ فعل تبذیر ہوگا۔ دونوں صورتیں عدالت کے منافی ہیں۔ کیونکہ حقیقت عدل، مقدار اور محل دونوں میں تناسب چاہتی ہے۔

فساد کے معنی خروج الشیئ عن الاعتدال کے ہیں۔ یعنی کسی چیز کا اعتدال سے باہر ہونا۔

اعتداء اور عدُوان ایک ہی مادہ سے ہیں، اور دونوں کے معنی حد سے گذر جانا ہے۔

وَاِلَیۡہِ یُرۡجَعُوۡنَ ٥ (۳: ۸۳) حکم کی اطاعت کر رہے ہیں۔ خوشی سے ہو یا ناخوشی سے دگر سب کے لیے چلنا اسی کے ٹھہرائے ہوئے قانون پر ہے) اور بالآخر سب اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

بدعملی کے لیے قرآن کے اختیاراتِ لغویہ

یہی وجہ ہو کہ قرآن نے بدعملی اور بُرائی کے لیے جتنی تعبیرات اختیار کی ہیں، سب ایسی ہیں کہ اگر ان کے معانی پر غور کیا جائے تو عدل و توازن کی ضد اور مخالف ثابت ہوں گی۔ گویا قرآن کے نزدیک بُرائی کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ حقیقتِ عدل سے انحراف ہو۔ مثلاً ظلم، طغیان، اسراف، تبذیر، افساد، اعتدا، عدوان وغیر ذٰلک۔

ظلم کے معنی وضع الشیٔ فی غیر موضعہ کے ہیں۔ یعنی جو بات جس جگہ ہونی چاہیئے، وہاں نہ ہو، بے محل ہو، تو لغت میں اس حالت کو ظلم کہیں گے۔ اسی لیے قرآن نے شرک کو "ظلم عظیم" کہا ہو۔ کیونکہ اس سے زیادہ کوئی بے محل بات نہیں ہو سکتی۔ اور یہ ظاہر ہو کہ کسی چیز کا اپنی صحیح جگہ میں نہ ہونا ایک ایسی حالت ہو جو حقیقتِ عدل کے عین منافی ہو۔

طغیان کے معنی ہیں کسی چیز کا اپنی حد سے گزر جانا۔ دریا کا پانی اپنی حد سے بلند ہو جاتا ہو تو کہتے ہیں طغی الماء ظاہر ہو کہ حد سے تجاوز عین عدالت کی ضد ہے۔

اِسراف "سرف" سے ہو۔ "سرف" کے معنی یہ ہیں کہ جو چیز جتنی مقدار میں جہاں خرچ کرنی چاہیئے، اس سے زیادہ خرچ کر دی جائے۔

تبذیر کے معنی کسی چیز کو ایسی جگہ خرچ کرنا جہاں خرچ نہیں کرنا چاہیئے "اسراف" اور "تبذیر" میں مقدار اور محل کا فرق ہوا۔ کھانے میں خرچ کرنا، خرچ کا صحیح محل ہو

انسانوں کا سراغ لگاتے ہیں تو ہمیں ان کے قدم آگے بڑھنے کی جگہ پیچھے ہٹتے دکھائی دیتے ہیں۔

انسانی دماغ کا سب سے زیادہ پرانا تصور جو قدامت کی تاریکی میں چمکتا ہے، وہ توحید کا تصور ہے۔ یعنی صرف ایک ان دیکھی اور اعلیٰ ہستی کا تصور جس نے انسان کو اور ان تمام چیزوں کو جنھیں وہ اپنے چاروں طرف دیکھ رہا تھا، پیدا کیا۔ لیکن پھر اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس جگہ سے اس کے قدم بتدریج پیچھے ہٹنے لگے اور توحید کی جگہ آہستہ آہستہ اشراک اور تعدد الٰہ کا تصور پیدا ہونے لگا۔ یعنی اب اس ایک ہستی کے ساتھ جو سب سے بالاتر ہے، دوسری قوتیں بھی شریک ہونے لگیں، اور ایک معبود کی جگہ بہت سے معبودوں کی چوکھٹوں پر انسان کا سر جھک گیا۔

اگر خدا کے تصور میں وحدت کا تصور انسانی دماغ کا بلند تر تصور ہے، اور اشراک اور تعدد کے تصورات نچلے درجے کے تصورات ہیں تو ہمیں اس نتیجہ تک پہنچنا پڑتا ہے کہ یہاں ابتدائی کڑی جو نمایاں ہوئی وہ نچلے درجہ کی نہ تھی، اونچے درجے کی تھی، اور اس کے بعد جو کڑیاں ابھریں، انھوں نے بلندی کی جگہ پستی کی طرف رخ کیا۔ گویا ارتقاء کا عام قانون یہاں بے اثر ہو گیا۔ ترقی کی جگہ رجعت کی اصل کام کرنے لگی۔

انیسویں صدی کے نظریئے اور ارتقائی مذہب

انیسویں صدی کے علماء اجتماعیات کا عام نقطۂ خیال یہ تھا کہ انسان کے دینی عقائد کی ابتدا ان اوہامی تصورات سے ہوئی جو اس کی ابتدائی معیشت کے طبعی تقاضوں اور احوال و ظروف کے قدرتی اثرات سے نشوونما پانے لگے تھے۔ یہ تصورات قانون ارتقاء کے ماتحت درجہ بدرجہ مختلف کڑیوں سے گذرتے رہے۔ اور بالآخر انھوں نے اپنی ترقی یافتہ صورت میں ایک

قرآن اور صفاتِ الٰہی کا تصوّر

قرآن نے خدا کی صفات کا جو تصوّر قائم کیا ہے، سورۂ فاتحہ اس کی سب سے پہلی رونمائی ہے۔ ہم اس مرقع میں وہ شبیہ دیکھ سکتے ہیں جو قرآن نے نوعِ انسانی کے سامنے پیش کی ہے۔ یہ ربوبیّت، رحمت اور عدالت کی شبیہ ہے۔ انہی تین صفتوں کے تفکّر سے ہم اس کے تصوّرِ الٰہی کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔

خدا کا تصوّر ہمیشہ انسان کی روحانی و اخلاقی زندگی کا محور رہا ہے۔ یہ بات کہ مذہب کا معنوی اور نفسیاتی مزاج کیسا ہے؟ اور وہ اپنے پیروؤں کے لیے کس طرح کے اثرات رکھتا ہے؟ صرف یہ بات دیکھ کر معلوم کر لی جا سکتی ہے کہ اس کے تصوّرِ الٰہی کی نوعیت کیا ہے؟

انسان کا ابتدائی تصوّر جب ہم انسان کے تصوّراتِ الوہیت کا، ان کے مختلف عہدوں میں مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کے تغیرات کی رفتار کچھ عجیب طرح کی دکھائی دیتی ہے اور تعلیل و توجیہ کے عام اصول کام نہیں دیتے۔ موجوداتِ خلقت کے ہر گوشہ میں تدریجی ارتقاء (EVOLUTION) کا قانون کام کرتا رہا ہے اور انسان کا جسم و دماغ بھی اس سے باہر نہیں۔ جس طرح انسان کا جسم بتدریج ترقی کرتا ہوا نچلی کڑیوں سے اونچی کڑیوں تک پہنچا، اسی طرح اس کے دماغی تصوّرات بھی نچلے درجوں سے بلند ہوتے ہوئے بہ تدریج اونچے درجوں تک پہنچے۔ لیکن جہاں تک خدا کی ہستی کے تصوّرات کا تعلق ہے، معلوم ہوتا ہے کہ صورتِ حال اس سے بالکل برعکس ہے۔ اور ارتقاء کی جگہ ایک طرح کے تنزّل یا ارتجاع کا قانون یہاں کام کرتا رہا ہے جب ابتدائی عہد کے

نے انھی وحشی قبائل کے تصورات سے فیتش ورشپ (FETISH-WORSHIP) کا استنباط کیا تھا یعنی ایسی اشیاء کی پرستش کا جن سے کسی جنی روح کی وابستگی یقین کی جاتی تھی۔ اب پھر ۱۸۵۱ء میں اے کامٹ (COMETE) نے اسی پرستش سے خدا پرستی کی پیدائش کا نظریہ اختیار کیا، اور سر جان لبک نے جو آگے چل کر لارڈ اویبری کے لقب سے مشہور ہوا) اسے مزید بحث و نظر کا جامہ پہنایا۔ اس نظریہ کا اس عہد میں عام طور استقبال کیا گیا تھا، اور وقت کے علمی حلقوں کی قبولیت اس نے حاصل کرلی تھی۔

تقریباً اسی عہد میں مینِ ازم (MANISM) یعنی اجداد پرستی کے نظریے نے سر اٹھایا۔ اس نظریے کی بنیاد اس قیاس پر رکھی گئی تھی کہ انسان کو آباو اجداد کی عظمت و محبت نے پہلے ان کی پرستش کی راہ دکھائی۔ پھر اسی پرستش نے قانون ارتقار کے ماتحت ترقی کر کے خدا پرستی کی نوعیت پیدا کرلی۔ صحرانشین اور چراگاہوں کی جستجو کرنے والے قبیلوں کے ابتدائی تصورات میں اجداد پرستی کا ذہنی مواد موجود تھا۔ چین کی قدیم تاریخ میں بھی اس پرستش کا سراغ بہت دور تک ملنے لگا تھا۔ اس لیے اس نظریے کے لیے ضروری مواد فراہم ہوگیا، اور ۱۸۷۰ء میں جب ہربرٹ اسپنسر نے اپنے آسیبی نظریے (GHOST THEORY) کی بنیاد اسی تخیل پر استوار کی تو وقت کے فلسفیوں اور اجتماعیات کے عالموں کے حلقے میں اس نے فوراً مقبولیت پیدا کرلی

اسی عہد میں ایک دوسرا نظریہ بھی بروئے کار آیا اور اس نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کرلی۔ یہ ای۔ بی۔ ٹیلر کا انیمزم (ANIMISM) کا نظریہ تھا۔ ۱۸۷۲ء میں اس نے اپنی مشہور کتاب پری مے ٹیو کلچر شائع کی۔ اور اس میں دینی عقائد

اعلیٰ ہستی اور خالقِ کُل کے عقیدے کی نوعیت پیدا کر لی۔ گویا اس سلسلۂ ارتقاء کی ابتدائی کڑی اوہامی تصوّرات تھے جن سے طرح طرح کی الٰہی قوتوں کا تصوّر پیدا ہوا اور پھر اسی تصوّر نے ترقی کرتے ہوئے خدا کے ایک توحیدی اعتقاد کی شکل اختیار کر لی۔ بیجا نہ ہوگا اگر اختصار کے ساتھ یہاں ان تمام نظریوں پر ایک اجمالی نظر ڈال لی جائے جو اس سلسلے میں یکے بعد دیگرے نمایاں ہوئے اور وقت کے علمی حلقوں کو متاثر کیا۔

دینی عقائد اور تصوّرات کی تاریخ بہ حیثیت ایک مستقل شاخِ علم کے انیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں جب انڈو جرمن قبائل (یعنی وسط ایشیا کے آریائی قبائل) اور ان کی زبانوں کی تاریخ روشنی میں آئی تو ان کے دینی تصوّرات بھی نمایاں ہوئے اور اس طرح بحث و تنقید کا ایک نیا میدان پیدا ہو گیا۔ یہی میدان تھا جس کے مباحث نے انیسویں صدی کے اوائل میں بحث و نظر کی ایک مستقل شاخ پیدا کر دی۔ یعنی دینی عقائد کی پیدائش اور ان کے نشو و نما کی تاریخ کا علم مدوّن ہونے لگا۔ اسی دور میں عام خیال یہ تھا کہ خدا پرستی کی ابتداء نیچر متھس (NATURE-MYTHS) کے تصوّرات سے ہوئی۔ یعنی ان خرافاتی اساطیر سے ہوئی جو مظاہرِ فطرت کے متعلق بننا شروع ہو گئے تھے۔ مثلاً روشنی کی ایک مستقل ہستی کا تصوّر پیدا ہو گیا۔ بارش کی قوت نے ایک دیوتا کی شکل اختیار کر لی۔ قدیم آریائی تصوّرات سے جو مظاہرِ فطرت کی پرستش پر مبنی تھے، اس خیال کا مواد فراہم ہوا تھا۔

لیکن انیسویں صدی کے نصف ابتدائی دور میں جب افریقہ اور امریکہ کے وحشی قبائل کے حالات روشنی میں آئے تو ان کے دینی تصوّرات کی تحقیقات نے ایک نئے نظریے کا سامان فراہم کر دیا۔ سنہ ۱۷۶۰ء میں ڈی بروسے (DE BROSSES)

نام سے مشہور ہوئے۔

لیکن انیسویں صدی کے نصف آخری حصّے میں جبکہ یہ تمام نظریے سر اٹھا رہے تھے، دوسری طرف ایک خاص علمی حلقہ ایک دوسرے نظریے کی بنیادیں بھی چن رہا تھا اس نظریّے کا مواد قدیم ترین تمدّنی عہد کے شکار پیشہ قبائل کے تصوّرات نے بہم پہنچایا تھا۔ جن کے حالات اب تاریخ کی دسترس سے باہر نہیں رہے تھے۔ یہ نظریہ ٹوٹمزم (TOTEMISM) کے نام سے مشہور ہوا اور بہت جلد اس نے وقت کے علمی حلقوں کی توجّہ اپنی طرف کھینچ لی۔ ٹوٹمزم سے مقصود مختلف اشیاء اور جانوروں کے وہ انتسابات ہیں جو جمعیتِ بشری کی ابتدائی قبائلی زندگی میں پیدا ہوگئے تھے اور پھر کچھ عرصہ کے بعد ان جانوروں اور اشیاء کا غیر معمولی احترام کیا جانے لگا تھا۔ اس نظریے کی رُو سے خیال کیا گیا کہ ہندوستان کی گائے، مصر کا مگرمچھ اور بیل، شمالی خطوں کا ریچھ، اور بحر انشبن قبائل کا سفید بچھڑا، دراصل ٹوٹمزم ہی کے بقایا ہیں۔ سب سے پہلے ۱۸۸۵ء میں رابرٹسن سمتھ نے اس نظریے کا اعلان کیا تھا۔ پھر وقت کے دوسرے نظّار نے بھی اسی رُخ پر قدم اُٹھایا۔

لیکن کچھ عرصہ کے بعد اس نظریے کی مقبولیت مجروح ہونا شروع ہوگئی۔ پروفیسر جے۔ جی فریزر کا جمع کیا ہوا مواد جب منظرِ عام پر آیا تو معلوم ہوا کہ ٹوٹمزم کے تصوّرات نہ تو دینی تصوّرات کی نوعیت رکھتے تھے، نہ دینی تصوّرات کا مبدء بننے کی ان میں صلاحیت تھی۔ ان کی اصلی نوعیت زیادہ سے زیادہ ایک اجتماعی نظام کی تھی جس کے ساتھ طرح طرح کے تصوّرات کا ایک سلسلہ وابستہ ہوگیا تھا۔ اس سے زیادہ انھیں اس سلسلے میں اہمیّت نہیں دی جاسکتی۔

کی کم از کم تعریف اینیمزم کے ذریعے کی۔ اینیمزم سے مقصود یہ ہے کہ انسان کے تصورات میں اس کی جسمانی زندگی کے علاوہ ایک مستقل روحانی زندگی کا تصور بھی پیدا ہو جائے۔ اس "مستقل روحانی زندگی" کا تصور ٹیلر کے نزدیک خدا پرستی اور دینی عقائد کا بنیادی مادّہ تھا۔ اسی مادّہ نے نشو و نما پا کر خدا کی ہستی کے عقیدے کی نوعیت پیدا کر لی۔ غالباً دینی عقائد کی پیدائش کے تمام نظریوں میں یہ پہلا نظریہ ہے جو علمی طریقے پر پوری طرح مرتب کیا گیا۔ اور بحث و نظر کے تمام اطراف و جوانب منظم اور آراستہ کیے گئے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وقت کے تمام علمی حلقوں پر اس نظریے نے ایک خاص اثر ڈالا تھا، اور عام طور پر اسے ایک مقررہ اور طے شدہ اصل کی شکل میں پیش کیا جانے لگا تھا۔ انیسویں صدی کے اختتام تک اس نظریے کا یہ اقتدار بلا استثنا قائم رہا۔

اسی اثنا میں مصر، بابل اور اشوریا کے قدیم آثار و کتبات کے حل سے تاریخ قدیم کا ایک بالکل نیا میدان روشنی میں آنے لگا تھا۔ اور ان آثار کے مباحث نے مستقل علوم کی حیثیت پیدا کر لی تھی۔ اس نئے مواد نے مظاہر فطرت کی پرستش کی اصل کو از سر نو اہمیت دے کر ابھار دیا، کیونکہ وادی نیل اور وادی دجلہ و فرات کے یہ دونوں قدیم تمدن دینی عقائد کے یہی تصور نمایاں کرتے تھے۔ چنانچہ اب پھر ایک نیا مذہب (اسکول) پیدا ہو گیا جو خدا پرستی کی پیدائش کی ابتدائی بنیاد مظاہر فطرت کے تاثرات کو قرار دیتا تھا۔ اور خصوصیت کے ساتھ اجرام سماوی کے تاثرات پر زور دیتا تھا۔ اس نظریے کے حامیوں نے اینیمزم کی مخالفت کی اور ایسٹرل اینڈ نیچر میتھالوجسٹ (ASTRAL AND NATURE MYTHOLOGISTS) کے

دورکہیم آگے بڑھا اور اس نظریے کا سب سے بڑا علم بردار بن گیا۔ اس گروہ کی رائے میں ٹوٹمزم اور جادو کے تصورات کا مرکب مجموعہ جیسا کہ وسط آسٹریلیا کے قبائل کے اوہام میں پایا جاتا ہے، جمعیتِ بشری کے دینی تصورات کا اصلی مبدء تھا۔ قانونِ ارتقا کے ماتحت انہی تصورات نے خدا پرستی کے عقاید کی ترقی یافتہ شکل پیدا کر لی۔

اس زمانے کے چند سال بعد بعض پروٹسٹنٹ علماء نے جو دینی عقائد کے نفسیاتی مطالعہ میں مشغول تھے، مسئلے پر نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالی، اور اس نظریے کی حمایت شروع کر دی۔ وہ اس طرف گئے کہ خدا پرستی کے عقیدے کا مبدء ہمیں مذہب اور سحر کاری دونوں کے مرکب تصورات میں ڈھونڈھنا چاہیئے۔ اس جماعت کا پیشرو آرچ بشپ سوڈربلوم (SÖDERBLOM) تھا جس کے مباحث ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئے

اس کے بعد کا زمانہ پہلی عالمگیر جنگ کا زمانہ تھا جو بیسویں صدی کے ایک دور ختم کر کے دوسرے دور کا دروازہ کھول رہی تھی۔ اس نئے دور نے جہاں علم و نظر کے بہت سے گوشوں کو انقلابی تغیرات سے آشنا کیا، وہاں علم کی اس شاخ میں بھی ایک نیا انقلابی دور شروع ہو گیا۔

یہ تمام پچھلے نظریے مادی مذہب ارتقا (MATERIALISTIC EVOLUTIONISMS) کی اصل پر مبنی تھے۔ ان سب کے اندر یہ بنیادی اصل کام کر رہی تھی کہ اجسام و مولد کی طرح انسان کا دینی عقیدہ بھی بتدریج نچلی کڑیوں سے ترقی کرتا ہوا اعلیٰ کڑیوں تک پہنچا ہے۔ اور خدا پرستی کے عقیدے میں توحید (MONOTHEISM) کا تصور ایک طول طویل سلسلۂ ارتقا کا نتیجہ ہے۔ انیسویں صدی کا نصف آخر ڈارونزم کے شیوع و احاطہ کا زمانہ تھا۔ اور ٹیلر، ٹیلر، اسپنسر نے اسے اپنے فلسفیانہ مباحث سے انسانی

مگر اس سلسلہ میں معاملہ کا ایک اور گوشہ بھی نمایاں ہوا تھا۔ فریزر نے ٹوٹمزم کے تصوّرات میں ایک خاص قسم ایسی بھی پائی تھی جس میں دینی عقائد کا ابتدائی مواد بننے کی زیادہ صلاحیت دکھائی دیتی تھی۔ یعنی وہ قسم جو جادو کے اعتقاد سے تعلّق رکھتی ہے بحث و نظر کے اس گوشے نے مقلّدوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی طرف متوجّہ کر لیا۔ اور جادو کا نظریہ علمی حلقوں میں روشناس ہو گیا۔ ۱۸۹۲ء میں ایک امریکی عالم جے۔ ایچ کنیگ اس پہلو پر توجہ دلا چکا تھا۔ اب بیسویں صدی کی ابتدائی برسوں میں بیک وقت جرمنی، انگلینڈ، فرانس اور امریکہ کے علمی حلقوں سے اس کی بازگشت شروع ہو گئی اور انیمزم کے خلاف ردّ فعل کام کرنے لگا۔ اب یہ خیال عام طور پر پھیل گیا کہ انیمزم کے تصوّرات سے پیشتر بھی انسانی تصوّرات کا ایک دور گذر چکا ہے۔ اور یہ ماقبل انیمزم (PREANIMISM) دور، جادو کے تصوّرات کا دور تھا۔ اسی جادو کے اعمال کے عقیدے نے آگے چل کر روحانی عقائد کی شکل اختیار کر لی۔ اور خدا پرستی اور دینی عقاید کے مبادیات پیدا ہو گئے۔

اب جادو کا نظریہ ایک عام مقبول نظریہ بن گیا اور پچھلے نظریے اپنی جگہ کھونے لگے۔ ۱۸۹۵ء میں آر۔ آر میرٹ نے ۱۹۰۲ء میں، ہیوٹ نے ۱۹۰۴ء میں، کے۔ پریسو نے ۱۹۰۶ء میں، اے۔ وائرکنڈٹ نے، اور ۱۹۰۸ء میں ای۔ اس۔ ہارٹ لینڈ نے اسی نظریے پر اپنے بحث و فکر کی تمام دیواریں اٹھائیں۔ اور اسے دور تک پھیلاتے چلے گئے۔ سب سے زیادہ حصّہ اس میں فرانس کے علماء اجتماعیات کے اس طبقے نے لیا جو دورکیم (DURKHEIM) کے مسلک نظر سے تعلق رکھتا تھا۔ اس طبقہ کا زعیم پہلے ایچ ہیوبرٹ اور ام۔ ماس تھا۔ پھر ۱۹۱۲ء میں خود

علم شعوب و قبائلِ انسانی کے پورے میدان میں اب پرانا ارتقائی مذہب یکسر دیوالیہ ثابت ہوچکا ہے۔ نشوونما کی مرتب کڑیوں کا وہ خوش نما سلسلہ جو اس مذہب نے پوری آمادگی کے ساتھ طیار کر دیا تھا، اب ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا اور نئے تاریخی رجحانوں نے اسے اٹھا کر پھینک دیا ہے۔"[1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ انسان کے ابتدائی عمران و تصور کی "اعلیٰ ترین ہستی" فی الحقیقت توحیدی اعتقاد کا خدائے واحد تھا، اور انسان کا دینی عقیدہ جو اس سے ظہور پذیر ہوا، وہ پوری طرح ایک توحیدی دین تھا۔ یہ حقیقت اب اس درجہ نمایاں ہو چکی ہے کہ ایک سرسری نظرِ تحقیق بھی اس کے لیے کفایت کرے گی۔ نسل انسانی کے قدیم پستہ قد قبائل میں سے اکثروں کی نسبت یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے اسی طرح ابتدائی عہد کے جنگلی قبیلوں کے جو حالات روشنی میں آئے ہیں اور کرنائی کلین اور جنوب مشرقی آسٹریلیا کے یا بن قبیلوں کی نسبت جس قدر تاریخی مواد مہیا ہوا ہے، ان سب کی تحقیقات ہمیں اس نتیجہ تک پہنچاتی ہے۔ ارکینگ تہذیب کے قبیلوں کے روایتی آثار اور شمالی امریکہ کے قبائل کے دینی تصورات کی چھان بین نے بھی بالآخر اسی نتیجہ کو نمایاں کیا۔"[2]

زمانۂ حال کے نظار نے اب اس مسئلہ کا موسوعاتی (PAATOLOGIC)

---

[1] دی اوریجن اینڈ گروتھ آف ریلیجن صفحہ ۸ (THE ORIGIN AND GROWTH OF RELIGION)

[2] ایضاً صفحہ ۲۶۲

فکر و عمل کے تمام دائروں میں پھیلا دیا تھا۔ قدرتی طور پر خدا کے اعتقاد کی پیدائش کا مسئلہ بھی اس سے متاثر ہوا اور نظر و بحث کے جتنے قدم اُٹھے، وہ اسی راہ پر گام زن ہونے لگے۔

مذہب ارتقار کا خاتمہ اور زمانۂ حال کی تحقیقات

لیکن ابھی بیسویں صدی اپنے انقلاب انگیز انکشافوں میں بہت آگے نہیں بڑھی تھی کہ ان تمام نظریوں کی عمارتیں متزلزل ہونا شروع ہو گئیں۔ اور پہلی عالمگیر جنگ کے بعد کے عہد نے تو انھیں یک قلم منہدم کر دیا۔ اب تمام اہل نظر بالاتفاق دیکھنے لگے کہ اس راہ میں جتنے قدم اُٹھائے گئے تھے، وہ سرے سے اپنی بنیاد میں ہی غلط تھے۔ کیونکہ ان سب کی بنیاد قانونِ ارتقار کی اصل پر رکھی گئی تھی۔ اور ارتقائی اصل کی رہنمائی یہاں سودمند ہونے کی جگہ گمراہ کن ثابت ہوئی ہے۔ اب انھیں ٹھوس اور ناقابلِ انکار تاریخی شواہد کی روشنی میں صاف صاف نظر آ گیا کہ انسان کے دینی عقائد کی جس نوعیت کو انھوں نے اعلیٰ اور ترقی یافتہ قرار دیا تھا، وہ بعد کے زمانوں کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ جمعیتِ بشری کی سب سے زیادہ پرانی متاع ہے۔ مظاہرِ فطرت کی پرستش، حیوانی انتسابات کے تصورات، اجداد پرستی کی رسوم اور جادو کے توہمات کی اشاعت سے بھی بہت پہلے جو تصور انسانی دل و دماغ کے افق پر طلوع ہوا تھا، وہ ایک اعلیٰ ترین ہستی کی موجودگی کا بے لاگ تصور تھا یعنی خدا کی ہستی کا توحیدی اعتقاد تھا۔ چنانچہ اب بحث و نظر کے اس گوشے میں ارتقائی مذہب کا یک قلم خاتمہ ہو چکا ہے۔

ڈبلیو شمٹ (SCHMIDT) پروفیسر وائنا یونیورسٹی جنھوں نے اس موضوع پر زمانۂ حال کی سب سے بہتر کتاب لکھی ہے، لکھتے ہیں:

"اوسیریز" کی ان دیکھی ہستی کا اعتقاد دریائے نیل کی تمام آبادوادیوں میں چھایا ہوا تھا۔[1]

دجلہ فرات کی وادیوں کی قدیم آبادیاں اور خدا کی ہستی کا توحیدی تصور

پہلی عالمگیر جنگ کے بعد عراق کے مختلف حصوں میں کھدائی کی جو نئی مہمیں شروع کی گئی تھیں اور جو موجودہ جنگ کی وجہ سے ناتمام رہ گئیں، ان کے انکشافات نے اس مسئلہ کے لیے نئی روشنیاں بہم پہنچائی ہیں۔ اب اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کیا جاتا کہ دریائے نیل کی طرح دجلہ اور فرات کی وادیوں میں بھی جب انسان نے پہلے پہل اپنے خدا کو پکارا، تو وہ بہت سی ہستیوں میں بٹا ہوا نہیں تھا۔ بلکہ ایک ہی ان دیکھی ہستی کی صورت میں نمایاں ہوا تھا۔ کالڈیا کے سومیری اور اکادی قبائل جو انسانی نسلوں کے وارث ہوئے تھے، وہ "شمس" یعنی سورج اور "ناننار" یعنی چاند کی پرستش نہیں کرتے تھے، بلکہ اس ایک ہی لازوال ہستی کی جس نے سورج اور چاند اور تمام چمکدار ستاروں کو بنایا ہے۔"

موہنجو دارو کا خدائے واحد "ان"

ہندوستان میں "موہنجو دارو" کے آثار ہمیں آریوں کے

---

[1] "مردہ کی کتاب" قدیم مصری تصورات کا سب سے زیادہ مرتب اور منضبط نوشتہ ہے۔ مصریات کے مشہور محقق ڈاکٹر بج (BUDGE) کی رائے میں یہ سب سے زیادہ قدیم فکری مواد ہے جو مصری تمدن نے ہمارے حوالہ کیا ہے۔ یہ خود اتنی ہی پرانی ہے جتنا پرانا مصری تمدن ہے لیکن جو تصورات اس میں جمع کیے گئے ہیں وہ مصری تمدن سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔ وہ اتنے قدیم ہیں کہ ہم ان کی قدامت کی کوئی تاریخ معین نہیں کر سکتے۔ اس نوشتہ میں اوسیریز کے یہ صفات ہمیں ملتے ہیں: معبود اعظم، الخیر، ازلی پادشاہ، آخرت کا مالک۔

طریق نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ اور قدیم معلومات و مباحث کی تمام شاخیں جمع کر کے مجموعی نتائج نکالے ہیں۔ ضروری ہے کہ اس سلسلہ کی بعض جدید تحقیقات پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔ کیونکہ ابھی وہ اس درجہ شائع نہیں ہوئی ہیں کہ عام طور پر نظر و مطالعہ میں آچکی ہوں۔

آسٹریلیا اور جزائر کے وحشی قبائل اور مصر کے قدیم ترین آثار کی جدید تحقیقات

آسٹریلیا اور جزائر بحر محیط کے وحشی قبائل ایک غیر معین قدامت سے اپنی ابتدائی ذہنی طفولیت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ زندگی و معیشت کی وہ تمام ترقی یافتہ کڑیاں عام طور پر انسانی جماعتوں کے ذہنی ارتقاء کا سلسلہ مربوط کرتی ہیں، یہاں یکسر مفقود ہیں ابتدائی عہد کی بشری جمعیت کے تمام جسمانی اور دماغی خصائص ان کی قبائلی زندگی میں دیکھ لیے جا سکتے تھے۔ ان کے تصور اس درجہ محدود تھے کہ اوہام و خرافات میں بھی کسی طرح کا ارتقائی نظم نہیں پایا جاتا۔ تاہم ان کا ایک اعتقادی تصور بالکل واضح تھا۔ ایک بالاتر ہستی ہے جس نے ان کی زمین اور ان کا آسمان پیدا کیا اور ان کا مرنا اور جینا اسی کے قبضہ و تصرف میں ہے۔ مصر کے قدیم باشندوں کی صدائیں آٹھ ہزار برس پیشتر تک کی ہمارے کانوں سے ٹکرا چکی ہیں۔ قدیم مصری تصورات کا پورا سلسلہ اپنی عہد بعہد تبدیلیوں کے ساتھ ہمارے سامنے اُبھر آیا ہے۔ ہمیں صاف نظر آ رہا ہے کہ ایک خدا کی پرستش کا تصور اس سلسلہ میں بعد کو نہیں اُبھرا بلکہ سلسلہ کی سب سے زیادہ پرانی کڑی ہے۔ مصر کے وہ تمام معبود جن کے مرقعوں سے اس کے مشہور عالم ہیکلوں اور میناروں کی دیواریں منقش کی گئی ہیں، اس قدیم ترین عہد میں اپنی کوئی نمود نہیں رکھتے تھے جب صرف ایک

دائرۂ انشعاب میں آگئے تھے۔ عاد، ثمود، عمالقہ، ہکسوس، موابی، آشوری، آکاوی سومیری، عیلامی، آرامی اور عبرانی وغیرہم، مختلف مقاموں اور مختلف عہدوں کی قوموں کے نام ہیں۔ مگر دراصل سب ایک ہی قبائلی سرچشمہ سے نکلے ہوئے ہیں۔ یعنی عرب سے:

اب جدید سامی اثریات کے مطالعہ سے جو ان قوموں سے تعلق رکھتی ہیں، ایک حقیقت بالکل واضح ہو گئی ہے یعنی ان تمام قوموں میں ایک اَن دیکھے خدا کی ہستی کا اعتقاد موجود تھا اور وہ "آل - اِلاہُ" "یا اللہ" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہی "لاہ" ہے جس نے کہیں "ایل" کی صورت اختیار کی، کہیں "الوہ" کی، اور کہیں "الاہیا" کی۔

سرحدِ حجاز کی وادی عقبہ اور شمالی شام کے راسِ شمر کے جو آثار گذشتہ جنگ کے بعد منکشف ہوئے، ان سے یہ حقیقت اور زیادہ آشکارا ہو گئی ہے۔ مگر یہ موقعہ تفصیل کا نہیں۔

انسان کی پہلی راہ ہدایت کی تھی۔ گمراہی بعد کو آئی۔

بہرحال بیسویں صدی کی علمی جستجو اب ہمیں جس طرف لے جا رہی ہے، وہ انسان کا قدیم ترین توحیدی اور غیر اصنامی اعتقاد ہے۔ اس سے زیادہ اس کے تصورات کی کوئی بات پُرانی نہیں۔ اس نے اپنے عہدِ طفولیت میں ہوش و خرد کی آنکھیں جونہی کھولی تھیں، ایک یگانہ ہستی کا اعتقاد اپنے اندر موجود پایا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے قدم بھٹکنے لگے، اور بیرونی اثرات کی جولانیاں اسے نئی نئی صورتوں اور نئے نئے ڈھنگوں سے آشنا کرنے لگیں۔ اب ایک سے زیادہ مافوق الفطرت طاقتوں کا تصور نشوونما پانے لگا، اور مظاہرِ فطرت کے بے شمار جلوے اسے اپنی طرف کھینچنے لگے۔ یہاں تک کہ پرستش کی ایسی چوکھٹیں بننا شروع ہو گئیں جنھیں اس کی جبینِ نیاز چھو سکتی تھی، اور تصورات کی ایسی صورتیں ابھرنے لگیں جو اس کے دیدۂ صورت پرست کے سامنے نمایاں ہو سکتی تھیں۔ یہیں اسے ٹھوکر لگی، لیکن راہ ایسی تھی کہ ٹھوکر سے بچ بھی نہیں سکتا تھا:

عہدِ داؤدی سے بھی آگے لے جاتے ہیں۔ ان کے مطالعہ و تحقیق کا کام ابھی پورا نہیں ہوا ہے۔ تاہم ایک حقیقت بالکل واضح ہوگئی ہے۔ اس قدیم ترین انسانی بستی کے باشندوں کا بنیادی تصوّر توحیدِ الٰہی کا تصوّر تھا۔ اصنام پرستانہ تصوّر نہ تھا۔ وہ اپنے یگانہ خدا کو "ادن" کے نام سے پکارتے تھے جس کی مشابہت ہمیں سنسکرت کے لفظ "اندوان" میں مل جاتی ہے۔ اس یگانہ ہستی کی حکومت سب پر چھائی ہوئی ہے۔ طاقت کی تمام ہستیاں اسی کے ٹھہرائے ہوئے قانون کے ماتحت کام کر رہی ہیں۔ اس کی صفت "ویدوکن" ہے یعنی ایسی ہستی جس کی آنکھیں کبھی غافل نہیں ہوسکتیں۔ لَا تَاخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ!

"اللہ" کی یگانہ اور اَن دیکھی ہستی کا قدیم سامی تصوّر

سامی قبائل کا اصلی سرچشمہ صحرائے عرب کے بعض شاداب علاقے تھے۔ جب اس چشمہ میں نسلِ انسانی کا پانی بہت بڑھ جاتا تو اطراف میں پھیلنے لگتا۔ یعنی قبائل کے جتھے عرب سے نکل کر اطراف و جوانب کے ملکوں میں منتشر ہونے لگتے اور پھر چند صدیوں کے بعد نیا رنگ روپ اور نئے نام اختیار کر لیتے۔

شاید انسانی قبائل کا انشعاب کرۂ ارضی کے دو مختلف حصّوں میں بہ یک وقت جاری رہا اور زمانۂ مابعد کی مختلف قوموں اور تمدّنوں کا بنیادی مبدأ بنا۔ صحرائے گوبی کے سرچشمے سے وہ قبائل نکلے جو ہندی، یورپی (انڈو یوروپین) آریاؤں کے نام سے پکارے گئے۔ صحرائے عرب سے وہ قبائل نکلے جن کا پہلا نام سامی پڑا اور پھر یہ نام بے شمار ناموں کے ہجوم میں گم ہوگیا۔ تاریخ کی موجودہ معلومات اس حد تک پہنچ کر رک گئی ہیں اور آگے کی خبر نہیں رکھتیں۔

عرب قبائل کا یہ انشعاب بتدریج مغربی ایشیا اور قریبی افریقہ کے تمام دور دراز حصّوں تک پھیل گیا تھا۔ فلسطین، شام، مصر، نوبیا، عراق اور سواحلِ خلیج فارس سب اُن کے

وَكَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً	ابتدا میں تمام انسانوں کا ایک ہی گروہ تھا، یعنی
فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ	فطری ہدایت کی ایک ہی راہ پر تھے۔ پھر اس کے بعد
وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ	اختلافات پیدا ہوگئے، پس اللہ نے ایک کے بعد ایک
الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ	نبی مبعوث کیے وہ نیک عملی کے نتیجوں کی خوشخبری دیتے
النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ	تھے بدعملی کے نتیجوں سے متنبہ کرتے تھے۔ نیز ان کے ساتھ

نازل کیے تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے ہیں ان کا فیصلہ کر دیں۔

> ارتقائی نظریہ خدا کی ہستی کے اعتقاد میں نہیں مگر اس کی صفات کے تصورات کے مطالعہ میں مدد دیتا ہے

پس خدا کی ہستی کے عقیدے کے بارے میں انیسویں صدی کا ارتقائی نظریہ اب اپنی علمی اہمیت کھو چکا ہے اور بحث و نظر میں بہت کم مدد دے سکتا ہے۔ البتہ جہاں تک انسان کے ان تصورات کا تعلق ہے جو خدا کی صفات کی نقش آرائیاں کرتے رہے ہیں ارتقائی نقطۂ خیال سے ضرور مدد ملتی ہے کیونکہ بلاشبہ یہاں تصورات کے نشو و ارتقاء کا ایک سلسلہ موجود ہے جس کی ارتقائی کڑیاں ایک دوسرے سے الگ کی جا سکتی ہیں اور نچلے درجوں سے اونچے درجے کی طرف ہم بڑھ سکتے ہیں۔

خدا کی ہستی کا اعتقاد انسان کے ذہن کی پیداوار نہ تھا کہ ذہنی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ وہ بدلتا رہتا۔ وہ اس کی فطرت کا ایک وجدانی احساس تھا اور وجدانی احساسات میں نہ تو ذہن و فکر کے مؤثرات میں مداخلت کر سکتے ہیں، نہ باہر کے اثرات سے ان میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔

لیکن انسان کی عقل ذات مطلق کے تصور سے عاجز ہے۔ وہ جب کسی چیز کا تصور کرنا چاہتی ہے تو اگرچہ تصور ذات کا کرنا چاہے، لیکن تصور میں صفات و عوارض ہی آتے

کمند کوتہ و بازوے سست و بام بلند　　بمن حوالہ و نومید م گنہ گیرند!

پس معلوم ہوا کہ اس راہ میں ٹھوکر بعد کو لگی، پہلی حالت ٹھوکر کی نہ تھی، راہ راست پر گام فرسائیوں کی تھی۔

من ملک بودم و فردوسِ بریں جایم بود　　آدم آورد دریں خانہ خراب آبادم!

اگر اس عورتِ حال کو گمراہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے تو ماننا پڑیگا کہ پہلی حالت جو انسان کو پیش آئی تھی، وہ گمراہی کی نہ تھی، ہدایت کی تھی اس نے آنکھیں روشنی میں کھولی تھیں پھر آہستہ آہستہ تاریکی پھیلنے لگی۔

دینی نوشتوں کی شہادت اور قرآن کا اعلان۔

زمانہ حال کی علمی تحقیقات کا یہ نتیجہ ادیانِ عالم کے مقدس نوشتوں کی تصریحات کے عین مطابق ہے۔ مصر، یونان، کالڈیا، ہندوستان چین، ایران، سب کی مذہبی روایتیں ایک ایسے ابتدائی عہد کی خبر دیتی ہیں جب نوعِ انسانی گمراہی اور عصیان سے آشنا نہیں ہوئی تھی۔ اور فطری ہدایت کی زندگی بسر کرتی تھی۔ افلاطون نے کریطیاس (CRITIAS) میں آبادیٔ عالم کی جو حکایت درج کی ہے اس میں اس اعتقاد کی پوری جھلک موجود ہے اور طیماوس (TIMAEUS) کی حکایت جو ایک مصری پجاری کی زبانی ہے، مصری روایت کی خبر دیتی ہے۔ تورات کی کتاب پیدائش نے آدم کا قصہ بیان کیا ہے اس قصہ میں آدم کی پہلی زندگی ہدایت کی بہشتی زندگی تھی۔ پھر لغزش ہوئی اور بہشتی زندگی مفقود ہوگئی۔ اس قصہ میں بھی یہی اصل کام کر رہی ہے کہ یہاں پہلا دور فطری ہدایت کا تھا انحراف و گمراہی کی راہیں بعد کو کھلیں۔ قرآن نے تو صاف صاف اعلان کر دیا ہے کہ

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً　　ابتدا میں تمام انسان ایک ہی گروہ تھے (یعنی الگ الگ

وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا (۱۰:۱۹)　　راہوں میں بھٹکے ہوئے نہ تھے) پھر اختلاف میں پڑ گئے۔

دوسری جگہ مزید تشریح کی:

کی صورت ہو۔ حالانکہ وہ اس کے معبود کی صورت نہ تھی خود اسی کے ذہنی صفات کا عکس تھا!

فکرِ انسانی کی سب سے پہلی درماندگی یہی ہے جو اس راہ میں پیش آئی!

حرم جویاں درے را می پرستند فقیہاں دفترے را می پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد کہ یاراں دیگرے را می پرستند

یہی درماندگی ہے جس سے نجات دلانے کے لیے وحیِ الٰہی کی ہدایت ہمیشہ نمودار ہوتی رہی۔ انبیائے کرام (علیہم السلام) کی دعوت کی ایک بنیادی اصل یہ رہی ہے کہ انہوں نے ہمیشہ خدا پرستی کی تعلیم ویسی ہی شکل و اسلوب میں دی، جیسی شکل و اسلوب کے فہم و تحمل کی استعداد مخاطبوں میں پیدا ہو گئی تھی۔ وہ مجمعِ انسانی کے معلم و مربی تھے اور معلم کا فرض ہے کہ متعلموں میں جس درجے کی استعداد پائی جائے اسی درجے کا سبق بھی دے۔ پس انبیائے کرام نے بھی وقتاً فوقتاً خدا کی صفات کے لیے جو پیرایۂ تعلیم اختیار کیا، وہ اس سلسلۂ ارتقا سے باہر نہ تھا، بلکہ اسی کی مختلف کڑیاں مہیا کرتا ہے۔

ارتقائے تصور کے نقاطِ ثلاثہ اس سلسلہ کی تمام کڑیوں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں اور ان کے فکری عناصر کی تحلیل کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ان کی بے شمار نوعیتیں قرار دی جا سکتی ہیں، لیکن ارتقائی نقطے ہمیشہ تین ہی رہے اور انہی سے اس سلسلہ کی بدایت و نہایت معلوم کی جا سکتی ہے:

(۱) تجسم سے تنزیہہ کی طرف

۱؎ تجسم سے مقصود یہ ہے کہ خدا کی نسبت ایسا تصور قائم کرنا کہ وہ مخلوق کی طرح جسم و صورت رکھتا ہے۔ تشبیہ سے مقصود یہ ہے کہ ایسی صفات تجویز کرنی جو مخلوقات کی صفات سے مشابہ ہوں۔ تنزیہہ سے مقصود یہ ہے کہ ان تمام

(باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

ہیں۔ اور صفات ہی کے جمع و تفرقہ سے وہ ہر چیز کا تصوّر آراستہ کرتی ہے۔ پس جب فطرت کے اندرونی جذبہ نے ایک بالاتر ہستی کے اعتراف کا ولولہ پیدا کیا، تو ذہن نے چاہا، اس کا تصوّر آراستہ کرے، لیکن جب تصوّر کیا، تو یہ اس کی ذات کا تصوّر نہ تھا، اس کی صفات کا تصوّر تھا۔ اور صفات میں سے بھی ان ہی صفات کا جن کا ذہنِ انسانی تخیل کر سکا تھا۔ یہیں سے خدا پرستی کے فطری جذبے میں ذہن و فکر کی مداخلت شروع ہو گئی۔

عقلِ انسانی کی درماندگی اور صفاتِ الٰہی کی صورت آرائی

عقلِ انسانی کا ادراک محسوسات کے دائرے میں محدود ہے۔ اس لیے اس کا تصوّر اس دائرے سے باہر قدم نہیں نکال سکتا۔ وہ جب کسی ان دیکھی اور غیر محسوس چیز کا تصوّر کرے گی، تو ناگزیر ہے کہ تصوّر میں وہی صفات آئیں جنھیں وہ دیکھتی اور سنتی ہے، اور جو اس کے حاسۂ ذوق و لمس کی دسترس سے باہر نہیں ہیں۔ پھر اس کے ذہن و تفکّر کی جتنی بھی رسائی ہے، بیک دفعہ ظہور میں نہیں آئی ہے بلکہ ایک طول طویل عرصہ کے نشو و ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ ابتدا میں اس کا ذہن عہدِ طفولیت میں تھا۔ اس لیے اس کے تصوّرات بھی اسی نوعیّت کے ہوتے تھے۔ پھر جوں جوں اس میں اور اس کے ماحول میں ترقی ہوتی گئی، اس کا ذہن بھی ترقی کرتا گیا۔ اور ذہن کی ترقی و تزکیہ کے ساتھ اس کے تصوّرات میں بھی شائستگی اور بلندی آتی گئی۔

اس صورتِ حال کا یہ نتیجہ تھا کہ جب کبھی ذہنِ انسانی نے خدا کی صورت بنانی چاہی تو ہمیشہ ویسی ہی بنائی جیسی صورت خود اس نے اور اس کے احوال و ظروف نے پیدا کر لی تھی، جوں جوں اس کا معیارِ فکر بدلتا گیا، وہ اپنے معبود کی شکل و شباہت بھی بدلتا گیا۔ اسے اپنے آئینۂ تفکّر میں ایک صورت نظر آتی تھی۔ وہ سمجھتا تھا، یہ اس کے معبود

ہر نو دھما کا ہوتا ہی اور تم بے اختیار چونک اٹھتے ہو۔ اس صورت حال کا قدرتی نتیجہ یہ ہو کہ حیوانی طبیعت سلبی افعال سے فوراً متاثر ہو جاتی ہو۔ کیونکہ ان کی نمود میں شورش اور ہولناکی ہے۔ لیکن ایجابی افعال سے متاثر ہونے میں دیر لگاتی ہو، کیونکہ ان کا حسن و جمال یکا یک مشاہدہ میں نہیں آجاتا۔ اور ان کا مزاج شورش کی جگہ خاموشی اور سکون ہو۔

فطرت کے سلبی مظاہر کی قہرمانی اور ایجابی مظاہر کا حسن و جمال انسان پر شیفتگی سے پہلے دہشت طاری ہوئی

اسی بنا پر عقل انسانی نے جب صفاتِ الٰہی کی صورت آرائی کرنی چاہی تو فطرتِ کائنات کے سلبی مظاہر کی دہشت سے فوراً متاثر ہو گئی، کیونکہ زیادہ نمایاں اور پُرشور تھے، اور ایجابی و تعمیری حقیقت سے متاثر ہونے میں بہت دیر لگ گئی، کیونکہ ان میں شورش اور ہنگامہ نہ تھا۔ بادلوں کی گرج، بجلی کی کڑک، آتش فشاں پہاڑوں کا انفجار، زمین کا زلزلہ، آسمان کی ژالہ باری، دریا کا سیلاب سمندر کا تلاطم، ان تمام سلبی مظاہر میں اس کے لیے رعب و ہیبت تھی اور اسی ہیبت کے اندر وہ ایک غضبناک خدا کی ڈراونی صورت دیکھنے لگا تھا۔ اسے بجلی کی کڑک میں کوئی حسن محسوس نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بادلوں کی گرج میں کوئی شانِ محبوبیت نہیں پا سکتا تھا۔ وہ آتش فشاں پہاڑوں کی سنگ باری سے پیار نہیں کر سکتا تھا، اور اس کی عقل ابھی خدا کے انہی کاموں سے آشنا ہوئی تھی!

خود اس کی ابتدائی معیشت کی نوعیت بھی ایسی ہی تھی کہ انس و محبت کی جگہ خوف و وحشت کے جذبات برانگیختہ ہوتے۔ وہ کمزور اور نہتا تھا، اور دنیا کی ہر چیز اسے دشمنی اور ہلاکت پر تلی نظر آتی تھی۔ دلدل کے مچھروں کے جھنڈ چاروں طرف منڈلا رہے تھے۔ زہریلے جانور ہر طرف رینگ رہے تھے، درندوں کے حملوں سے ہر وقت مقابل رہنا پڑتا

(۲) تعدّد و اشراک (POLYTHEISM) سے توحید (MONOTHEISM) کی طرف

(۳) صفات قہر و جلال سے صفات رحمت و جمال کی طرف۔

یعنی تجسّم اور صفاتِ قہریہ کا تصوّر اس کا ابتدائی درجہ ہے۔ اور تنزّہ اور صفات رحمت و جمال سے اتّصاف اعلیٰ و کامل درجہ۔ جو تصوّر جس قدر ابتدائی اور ادنیٰ درجہ کا ہے، اتنا ہی تجسّم اور صفاتِ قہر کا عنصر اس میں زیادہ ہے۔ جو تصوّر جس قدر زیادہ ترقی یافتہ ہے، اتنا ہی زیادہ منزّہ اور صفاتِ رحمت و جلال سے متّصف ہے

انسان کا تصوّر صفاتِ قہریہ کے تاثر سے کیوں شروع ہوا؟

انسان کا تصوّر صفاتِ قہریہ کے تخیّل سے کیوں شروع ہوا؟ اس کی علّت واضح ہے۔ فطرت کائنات کی تعمیر، تخریب کے نقاب میں پوشیدہ ہے۔ انسانی فکر کی طفولیّت تعمیر کا حُسن نہ دیکھ سکی۔ تخریب کی ہولناکیوں سے سہم گئی۔ تعمیر کا حسن و جمال دیکھنے کے لیے فہم و بصیرت کی دور رس نگاہ مطلوب تھی، اور وہ ابھی اس کی آنکھوں نے پیدا نہیں کی تھی۔

دنیا میں ہر چیز کی طرح ہر شغل کی نوعیت بھی اپنا مزاج رکھتی ہے۔ بناؤ ایک ایسی حالت ہے جس کا مزاج سر تا سر سکون اور خاموشی ہے۔ اور بگاڑ ایک ایسی حالت ہے کہ اس کا مزاج سر تا سر شورش اور ہولناکی ہے۔ بناؤ، ایجاب ہے، نظم ہے، جمع و ترتیب ہے۔ بگاڑ سلب ہے، برہمی ہے، تفرقہ و اختلال ہے۔ جمع و نظم کی حالت ہی سکون کی حالت ہوتی ہے، اور تفرقہ و برہمی کی حالت ہی شورش و انفجار کی حالت ہے۔ دیوار جب بنتی ہے، تو ہمیں کوئی شورش محسوس نہیں ہوتی، لیکن جب گرتی

لہ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۱) باتوں سے جو اسے مخلوقات سے مشابہ کرتی ہوں، اسے مبرّا یقین کرنا۔ انگریزی میں تجسّم کے لیے ان تھروپو مارفزم (ANTHROPOMORPHISM) اور تشبہ کے لیے ان تھراپیفوئزم (ANTHROPOPHUISM) کی مصطلحات استعمال کرتے ہیں۔

(۱) چینی (۲) ہندوستانی (۳) مجوسی (۴) یہودی اور (۵) مسیحی۔

دنیا کی تمام قدیم قوموں میں چینیوں کی یہ خصوصیت تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ ان کے تصوّرِ الوہیت نے ابتدا میں جو ایک سادہ اور مبہم نوعیت اختیار کر لی تھی، وہ بہت حد تک برابر قائم رہی، اور زمانۂ مابعد کی ذہنی وسعت پذیریاں اس میں زیادہ مداخلت نہ کر سکیں تاہم تصوّر کا کوئی مرقع بغیر رنگ و روغن کے بن نہیں سکتا۔ اس لیے آہستہ آہستہ اس سادہ خاکے میں بھی مختلف رنگتیں نمایاں ہونے لگیں، اور بالآخر ایک رنگین تصویر متشکل ہو گئی

چین میں قدیم زمانے سے مقامی خداؤں کے ساتھ ایک "آسمانی" ہستی کا اعتقاد بھی موجود تھا۔ ایک ایسی بلند اور عظیم ہستی جس کے علویت کے تصوّر کے لیے ہم آسمان کے سوا اور کسی طرف نظر نہیں اٹھا سکتے۔ آسمان حسن و بخشائش کا بھی مظہر ہے۔ قہر و غضب کی بھی ہولناکی ہے۔ اس کا سورج روشنی اور حرارت بخشتا ہے، اس کے ستارے اندھیری راتوں میں قندیلیں روشن کر دیتے ہیں، اس کی بارش زمین کو طرح طرح کی روئیدگیوں سے معمور کر دیتی ہے، لیکن اس کی بجلیاں ہلاکت کا بھی پیام ہیں۔ اور اس کی گرج دلوں کو دہلا بھی دیتی ہے۔ اس لیے آسمانی خدا کے تصوّر میں بھی دونوں صفتیں نمودار ہوئیں۔ ایک طرف اس کی جود و بخشائش ہے، دوسری طرف اس کا قہر و غضب ہے۔ چینی شاعری کی قدیم کتاب میں ہم قدیم ترین چینی تصوّرات کی جھلک دیکھ لے سکتے ہیں۔ ان میں جا بجا ہمیں ایسے مخاطبات ملتے ہیں جن میں آسمانی اعمال کی ان متضاد نمودوں پر حیرانی و سرگشتگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ "یہ کیا بات ہے کہ تیرے کاموں میں یکسانی اور ہم آہنگی نہیں؟ تو زندگی بھی بخشتا ہے اور تیرے پاس ہلاکت کی بجلیاں بھی ہیں۔"

"آسمان" چینی تصوّر کا ایک ایسا بنیادی عنصر بن گیا کہ چینی جمعیت آسمانی جمعیت اور

تھا۔ سر پر سورج کی تپش بے پناہ تھی، اور چاروں طرف موسم کے اثرات ہولناک تھے۔
غرض اس کی زندگی سرتاسر جنگ اور محنت تھی۔ اور اس ماحول کا قدرتی نتیجہ تھا کہ اس کا ذہن
خدا کا تصور کرتے ہوئے خدا کی ہلاکت آفرینیوں کی طرف جاتا۔ رحمت و فیضان کا ادراک نہ کر سکتا۔

بالآخر صفاتِ رحمت و جمال کا اشتمال

لیکن جوں جوں اس میں اور اس کے ماحول میں تبدیلی
ہوتی گئی، اس کے تصور میں بھی یاس و دہشت کی جگہ امید و رحمت کا عنصر شامل ہوتا گیا۔
یہاں تک کہ معبودیت کے تصور میں صفاتِ رحمت و جمال نے بھی ویسی ہی جگہ پالی جیسی
صفاتِ قہر و جلال کے لیے تھی۔ چنانچہ اگر قدیم اقوام کے اصنام پرستانہ تصورات کا مطالعہ
کریں، تو ہم دیکھیں گے کہ ان کی ابتدا ہر جگہ صفاتِ قہر و غضب کے تصور ہی سے ہوئی ہے
اور پھر آہستہ آہستہ رحمت و جمال کی طرف قدم اٹھا ہے۔ آخری کڑیاں وہ نظر آئیں گی جن
میں قہر و غضب کے ساتھ رحمت و جمال کا تصور بھی مساویانہ حیثیت سے قائم ہو گیا ہے
مثلاً قہر و ہلاکت کے دیوتاؤں اور قوتوں کے ساتھ زندگی، رزق، دولت، اور حسن و علم
کے دیوتاؤں کی بھی پرستش شروع ہو گئی ہے۔ یونان کا علم الاصنام اپنے لطافتِ تخیل کے
لحاظ سے تمام اصنامی تخیلات میں اپنی خاص جگہ رکھتا ہے، لیکن اس کی پرستش کے بھی قدیم
معبود وہی تھے جو قہر و غضب کی خوفناک قوتیں سمجھی جاتی تھیں۔ ہندوستان میں اس وقت
تک زندگی اور بخشش کے دیوتاؤں سے کہیں زیادہ، ہلاکت کے دیوتاؤں کی پرستش ہوتی ہے۔

ظہورِ قرآن کے وقت دنیا کے عام تصورات

(۱) چینی تصور

بہر حال ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ قرآن کے ظہور کے وقت صفاتِ
الٰہی کے عام تصورات کی نوعیت کیا تھی، اور قرآن نے جو تصور پیش
کیا، اس کی حیثیت کیا ہے؟

ظہورِ قرآن کے وقت پانچ دینی تصور فکرِ انسانی پر چھائے ہوئے تھے:

بالائے ہستی کے ساتھ کارخانۂ عالم کے تصرفات میں شرکت رکھتے تھے۔ چینی تصور میں یہ خانہ بزرگوں کی روحوں نے بھرا اور اس طرح اشتراک اور تعدد کے تصور کی پوری نقش آرائی ہوگئی۔

کنگ فوزی کے ظہور سے پہلے قربانیوں کی رسم عام طور پر رائج تھی۔ کنگ فوزی نے اگرچہ ان پر زور نہیں دیا لیکن ان سے تعرض بھی نہیں کیا۔ چنانچہ وہ چینی مندروں کا تقاضہ برابر پورا کرتی رہیں۔ قربانیوں کے عمل کے پیچھے طلبِ بخشش اور طلبِ تحفظ دونوں کے تصور کام کرتے تھے۔ قربانیوں کے ذریعے ہم اپنے مقاصد بھی حاصل کر سکتے ہیں اور خدا کے قہر و غضب سے محفوظ بھی ہو جا سکتے ہیں۔ پہلی غرض کے لیے وہ نذر ہیں۔ دوسری غرض کے لیے فدیہ!

لاؤتزے نے "تاؤ" یعنی طریقت کے مسلک کی بنیاد ڈالی۔ اسے چین کا تصوف اور ویدانت سمجھنا چاہیے۔ تاؤ نے چینی زندگی کو روحانی استغراق اور داخلی مراقبہ کی راہوں سے آشنا کیا اور مذہبی اور اخلاقی تصورات میں ایک طرف گہرائی اور دقت آفرینی پیدا ہوئی دوسری طرف لطافتِ فکر اور رقتِ خیال کے نئے نئے دروازے کھلے۔ لیکن تصوف ملک کا عام دینی تصور نہیں بن سکتا تھا۔ اس کی محدود جگہ چین میں بھی وہی رہی جو ویدانت کی ہندوؤں میں اور تصوف کی مسلمانوں میں رہی ہے۔

چین کا شمنی تصور اس کے بعد وہ زمانہ آیا جب ہندوستان کے شمنی[ل] مذہب (یعنی بدھ

ل سنسکرت میں "شمن" زاہد اور تارک الدنیا کو کہتے ہیں۔ بدھ مذہب کے تارک الدنیا بھکشو اس لقب سے پکارے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ تمام پیروانِ بدھ کو "شمنی" کہنے لگے۔ اسی شمنی کو عربوں نے "سمنی" بنا لیا۔ اور وسط ایشیا کے باشندوں نے "شامانی"۔ چنانچہ زکریا رازی، البیرونی اور ابن الندیم وغیرہم نے بدھ مذہب کا ذکر سمنیہ ہی کے نام سے کیا ہے۔ البیرونی بدھ مذہب کی عالمگیر اشاعت کی تاریخ کی بھی خبر رکھتا تھا چنانچہ کتاب الہند کی پہلی فصل میں اس طرف اشارات کیے ہیں۔

چنگیز خاں کی نسبت تصریح ملتی ہے کہ وہ شامانی مذہب کا پیرو تھا یعنی بدھ مذہب کا۔ چونکہ شامانی اور بدھ مذہب کا ترادف واضح نہیں ہوا تھا، اس لیے بیسویں صدی کے بعض مورخوں کو طرح طرح کی غلط فہمیاں ہوئیں اور وہ اس کا صحیح مفہوم متعین نہ کر سکے۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

چینی مملکت آسمانی مملکت کے نام سے پکاری جانے لگی۔ رومی جب پہلے پہل چین سے آشنا ہوئے تو انھیں ایک "آسمانی مملکت" ہی کی خبر ملی تھی۔ اس وقت سے (COELUM) کے مشتقات کا چین کے لیے استعمال ہونے لگا۔ یعنی "آسمان والے" اور "آسمانی" اب بھی انگریزی میں چین کے باشندوں کے لیے مجازاً "سلسٹیل" (CELESTIAL) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، یعنی آسمانی ملک کے باشندے۔

اس آسمانی ہستی کے علاوہ گزرے ہوئے انسانوں کی روحیں بھی تھیں جنھیں دوسرے عالم میں پہنچ کر تدبیر و تصرف کی طاقتیں حاصل ہو گئی تھیں۔ اور اس لیے پرستش کی مستحق سمجھی گئی تھیں۔ ہر خاندان اپنی معبود روحیں رکھتا تھا اور ہر علاقہ اپنا مقامی خدا:

لاؤ۔ تزو اور کنگ فوزی کی تعلیم

سنہ مسیحی سے پانچ سو برس پہلے لاؤ تزو (LAO-TZU) اور کنگ فوزی[1] (KUNG-FU-TSE) کا ظہور ہوا۔ کنگ فوزی نے ملک کو عملی زندگی کی سعادتوں کی راہ دکھائی اور معاشرتی حقوق و فرائض کی ادائگی کا ایک قانون مہیا کر دیا۔ لیکن جہاں تک خدا کی ہستی کا تعلق ہے "آسمان" کا قدیمی تصور بدستور قائم رہا اور اجداد پرستی کے عقائد نے اس کے ساتھ مل کر ایک ایسی نوعیت پیدا کر لی گویا آسمانی خدا تک پہنچنے کا ذریعہ گزری ہوئی روحوں کا وسیلہ اور تشفع ہے۔ روحانی تصورات میں وسیلہ کا اعتقاد ہمیشہ عابدانہ پرستش کی نوعیت پیدا کر لیتا ہے، چنانچہ یہ توسل بھی عملاً تعبد تھا اور ہر طرح کے دینی اعمال و رسوم کا مرکزی نقطہ بن گیا تھا۔

ہندوستان اور یونان میں دیوتاؤں کے تصور نے نشوونما پائی تھی جو خدائی کی ایک

---

[1] "کنگ فوزی" فارسی تلفظ ہے۔ صحیح چینی تلفظ "کونگ ۔ فوتسی" ہے۔ ایرانیوں نے اسے زیادہ صحت کے ساتھ نقل کیا یعنی صرف اتنی تبدیلی کی کہ "فوتسی" کو "فوزی" کر دیا۔ لیکن یورپ کی زبانوں نے اسے یک قلم مسخ کر کے "کنفوشیس" (CONFUCIUS) بنا دیا اور اس کی آواز اصل آواز سے اس درجہ مختلف ہو گئی کہ ایک چینی سن کر حیران رہ جاتا ہے کہ یہ کس چیز کا نام ہے اور کس ملک کی بولی میں؟

اس کے خواص نے اپنے لیے توحید کی جگہ پسند کی اور عوام کے لیے اشراک اور اصنام پرستی کی راہ مناسب سمجھی۔

اوپانی شد کا توحیدی اور وحدۃ الوجودی تصوّر

رگ وید کے زمزموں میں ہمیں ایک طرف مظاہر قدرت کی پرستش کا ابتدائی تصوّر بتدریج پھیلتا اور متجسم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ دوسری طرف ایک بالاتر اور خالقِ کُل ہستی کا توحیدی تصوّر بھی آہستہ آہستہ اُبھرتا نظر آتا ہے۔ خصوصاً دسویں حصّے کے زمزموں میں تو اسکی نمود صاف صاف دکھائی دینے لگتی ہے۔ یہ توحیدی تصوّر کسی بہت پرانے گذشتہ عہد کے بنیادی تصوّر کا بقیہ تھا، یا مظاہر قدرت کی کثرت آرائیوں کا تصوّر اب خود بخود کثرت سے وحدت کی طرف ارتقائی قدم اٹھانے لگا تھا؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے، لیکن بہرحال ایک ایسے قدیم عہد میں بھی جبکہ رگ وید کے تصوّرات نے نظم و سخن کا جامہ پہننا شروع کیا تھا، توحیدی تصوّر کی جھلک صاف صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ خداؤں کا وہ ہجوم جس کی تعداد تین سو تینتیس یا اسی طرح کی ثلاثی کثرت تک پہنچ گئی تھی، بالآخر تین دائروں میں سمٹنے لگا۔ یعنی زمین، فضا، اور آسمان میں اور پھر اس نے ایک ربّ الاربابی تصوّر (HENOTHEISM) کی نوعیت پیدا کرلی۔ پھر یہ ربّ الاربابی تصوّر اور زیادہ سمٹنے لگتا ہے اور ایک سب سے بڑی اور سب پر چھائی ہوئی ہستی نمایاں ہونے لگتی ہے۔ یہ ہستی کبھی ورون میں نظر آتی ہے کبھی "اِندر" میں اور کبھی "اگنی" میں، لیکن بالآخر ایک خالقِ کُل ہستی کا تصوّر پیدا ہو جاتا ہے جو "پرجاپتی" (پروردگارِ عالم) اور "وشوا کرمن" (خالقِ کُل) کے نام سے پکاری جانے لگتی ہے، اور جو تمام کائنات کی اصل و حقیقت ہے۔ "وہ ایک ہے مگر علم والے اُسے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں: اگنی، یم، ماتری شوان" (۱۶۴-۴۶) "وہ ایک نہ تو آسمان ہے نہ زمین ہے نہ سورج کی روشنی ہے نہ ہوا کا طوفان ہے۔ وہ کائنات کی روح ہے۔ تمام قوتوں کا سرچشمہ، ہمیشگی، لازوالی

---

[1] رگ وید۔ حصہ سوم ۹-۹ [2] ربّ الاربابی تصوّر سے مقصود تصوّر کی وہ نوعیت ہے۔ جب خیال کیا جاتا ہے کہ بہت سے خداؤں میں ایک خدا سب سے بڑا ہے، اور چھوٹے خداؤں کو اس کے ماتحت رہنا پڑتا ہے جیسا کہ یونانیوں اور رومیوں کا عقیدہ مشتری کی نسبت تھا۔

مذہب) کی چین میں اشاعت ہوئی - یہ مہایانا بُدھ مذہب تھا جو مذہب کے اصلی مبادیات سے بہت دور جا چکا تھا - اور جس نے تبدّل پذیری کی ایسی بے روک لچک پیدا کر لی تھی کہ جس شکل و قطع کا زمانہ ملتا تھا، ویسا ہی جسم بنا کر اس میں سما جاتا تھا - یہ جب چین، کوریا اور جاپان پہنچا تو اسے ہندوستان اور سیلون سے مختلف قسم کی فضا ملی اور اس نے فوراً مقامی وضع و قطع اختیار کر لی -

بُدھ مذہب کی نسبت یقین کیا جاتا ہے کہ خدا کی ہستی کے تصور سے خالی ہے، لیکن پیروانِ بدھ نے خود بُدھ کو خدا کی جگہ دے دی اور اس کی پرستش کا ایک ایسا عالمگیر نظام قائم کر دیا جس کی کوئی دوسری نظیر اصنامی مذاہب کی تاریخ میں نہیں ملتی چنانچہ چین، کوریا اور جاپان کی عبادتگاہیں بھی اب اس نئے معبود کے بُتوں سے معمور ہو گئیں -

(۴) ہندوستانی تصوّر | ہندوستان کے تصوّرِ الوہیت کی تاریخ متضاد تصوّروں کا ایک حیرت انگیز منظر ہے - ایک طرف اس کا توحیدی فلسفہ ہے دوسری طرف اس کا عملی مذہب ہے - توحیدی فلسفہ نے استغراقِ فکر و عمل کے نہایت گہرے اور دقیق مرحلے طے کیے اور معاملہ کو فکر کی بلندیوں کی ایک ایسی اونچی سطح تک پہنچا دیا جس کی کوئی دوسری مثال ہمیں قدیم قوموں کے مذہبی تصورات میں نہیں ملتی - عملی مذہب نے اشراک اور تعدّدِ الٰہ کی بے روک راہ اختیار کی اور اصنامی تصوّروں کو اتنی دور تک پھیلنے دیا کہ ہر پتھر معبود ہو گیا - ہر درخت خدائی کرنے لگا اور ہر چوکھٹ سجدہ گاہ بن گئی - وہ بیک وقت زیادہ سے زیادہ بلندی کی طرف بھی اُڑا، اور زیادہ سے زیادہ پستی میں بھی گرا -

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) یہ غلط فہمی یورپ کے عام اہلِ قلم میں آج بھی موجود ہے - شمالی سائبریا اور چینی ترکستان کے ہمسایہ علاقوں کے تورانی قبائل اپنے مذہبی پیشواؤں کو (جو تبت کے لاماؤں کی طرح طبی پیشوائی بھی رکھتے ہیں) "شامان" کہتے ہیں - سوویٹ روس کی حکومت آج کل ان کی تعلیم و تربیت کا سر و سامان کر رہی ہے - یہ لوگ بھی بلاشبہ بدھ مذہب کے پیرو ہیں لیکن ان کا بدھ مذہب منگولیوں کے محرف مذہب کی بھی ایک مسخ شدہ صورت ہے اسلئے اصلیت کی بہت کم جھلک باقی رہ گئی ہے اور اسی لئے انکی مذہبی حیثیت کے بارے میں آجکل کے مصنف حیرانی ظاہر کرتے ہیں - انگریزی میں انھی تورانی قبائل کے مذہب کی نسبت شےمنزم (SHAMANISM) کی ترکیب رائج ہو گئی ہے اور جادوگری کے اعمال و اثرات کو SHAMANIC اور (SHAMANISTIC) وغیرہ سے تعبیر کرنے لگے ہیں - یہ "شیمن" بھی وہی "شامانی" اور "شمنی" ہی کی ایک محرف صورت ہے چونکہ ان قبائل میں جادوگری کا اعتقاد عام ہے اور وہ اپنے شامانوں سے بیماریوں میں جادو کے ٹوٹکے کراتے ہیں اسلئے جادوگری کیلئے یہ لفظ مستعمل ہو گیا ہے

یہی وجہ ہو کہ اوپانی شد نے پہلے ذاتِ مطلق (برہمان) کو ذاتِ متشخص (ایشور) کے مرتبہ میں اُتارا[1] اور جب اطلاق نے تشخص کا نقاب چہرہ پر ڈال لیا تو پھر اس نقاب پوش چہرہ کی صفتوں کی نقش آرائیاں کی گئیں اور اس طرح وحدۃ الوجودی عقیدہ نے ذاتِ متشخص و متصف (ساگون) کے تصوّر کا مقام بھی مہیّا کر دیا۔

جب ان صفات کا ہم مطالعہ کرتے ہیں تو بلاشبہ ایک نہایت بلند تصوّر سامنے آجاتا ہو جس میں سلبی اور ایجابی دونوں طرح کی صفات اپنی پوری نمود اریاں رکھتی ہیں۔ اس کی ذات یگانہ ہو۔ اس ایک کے لیے دوسرا نہیں۔ وہ بے ہمتا ہو، بے مثال ہو، ظرف و زمان اور مکان کے قیود سے بالاتر۔ ازلی و ابدی۔ ناممکن الادراک، واجب الوجود۔ وہی پیدا کرنے والا ہو، وہی حفاظت کرنے والا، اور وہی فنا کر دینے والا۔ وہ علۃ العلل اور علّتِ مطلقہ ("اپاونا" اور "نیمیتا کارنا") ہے۔ تمام موجودات اسی سے بنیں، اسی سے قائم رہتی ہیں، اور پھر اسی کی طرف لوٹنے والی ہیں۔ وہ نور ہے، کمال ہو، حسن ہو، سرتاسر پاکی ہو، سب سے زیادہ طاقتور، سب سے زیادہ رحم و محبّت والا، ساری عبادتوں اور عاشقیوں کا مقصودِ حقیقی!

لیکن ساتھ ہی دوسری طرف یہ حقیقت بھی ہمیں صاف صاف دکھائی دیتی ہو کہ توحیدی تصوّر کی یہ بلندی بھی اشراک اور تعدّد کی آمیزش سے خالی نہیں رہی اور توحید فی الذات کے ساتھ توحید فی الصّفات کا بے میل عقیدہ جلوہ گر نہ ہو سکا۔ زمانۂ حال کے ایک قابل ہندو مصنّف کے لفظوں میں دراصل اشراکی اور تعدّدی تصوّر (POLYTHEISTIC) ہندوستانی دل و دماغ میں اس درجہ جڑ

---

[1] ہمارے صوفیائے کرام نے اسی صورتِ حال کو یوں تعبیر کیا ہو کہ "احدیت" نے مرتبہ "واحدیت" کی تجلّی میں نزول کیا" احدیت" یعنی یگانہ ہونا، "واحدیت" یعنی اول ہونا۔ یگانہ ہستی کو ہم اول نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اول جبھی ہوگا جب دوسرا تیسرا اور چوتھا بھی ہو، اور یگانگی بحت کے مرتبہ میں دوسرے اور تیسرے کی گنجائش ہی نہیں۔ لیکن جب احدیت کے مرتبہ نے واحدیت میں نزول کیا تو اب "ہوالاول" کا مرتبہ ظہور میں آگیا۔ اور جب اول ہوا تو دوسرے، تیسرے اور چوتھے کے تعینات بھی ظہور میں آنے لگے۔ وما الملح قول الشاعر العارف

دریائے کہن چو برزند موجۂ نو　　موجش خوانند و فی الحقیقت دریاست

وہ کیا ہے؟ وہ شاید رِت ہے جو ... کے روپ میں، آدیتی ہے روحانیت کے بھیس میں۔ وہ بغیر سانس کے سانس لینے والی ہستی!" (حصّہ دہم - ۱۲۱، ۲) "ہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ ہم اسے پوری طرح بتا نہیں سکتے" (ایضاً - ۱۲۱) وہ "ایکم است" ہے یعنی حقیقت یگانہ۔ الحق۔ یہی وحدت ہے جو کائنات کی تمام کثرت کے اندر دیکھی جاسکتی ہے۔

یہی مبادیات ہیں جنھوں نے اوپانی شدوں میں توحید وجودی (PANTHEISM) کے تصوّر کی نوعیت پیدا کرلی، اور پھر ویدانت کے مابعد الطبیعات (METAPHYSICS) نے انھی بنیادوں پر استغراقِ فکر و نظر کی بڑی بڑی عمارتیں طیار کر دیں۔

وحدۃ الوجودی اعتقاد ذاتِ مطلق کے کشفی مشاہدات پر مبنی تھا۔ نظری عقائد کو اس میں دخل نہ تھا۔ اس لیے اصلاً یہاں صفات آرائیوں کی گنجائش ہی نہ تھی۔ اور اگر تھی بھی تو صرف سلبی صفات (NEGATIVE ATTRIBUTES) ہی اُبھر سکتی تھیں۔ ایجابی (POSITIVE) صفات کی صورت آرائی نہیں کی جاسکتی تھی۔ یعنی یہ تو کہا جاسکتا تھا کہ وہ ایسا نہیں ہے، ایسا نہیں ہے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ ایسا ہے اور ایسا ہے۔ کیونکہ ایجابی صفات کا جو نقشہ بھی بنایا جائے گا، وہ ہمارے ذہن و فکر ہی کا بنایا ہوا نقشہ ہوگا، اور ہمارا ذہن و فکر امکان و اضافت کی چار دیواری میں اس طرح مقیّد ہے کہ مطلق اور غیر محدود حقیقت کا تصوّر کر ہی نہیں سکتا۔ وہ جب تصوّر کرے گا تو ناگزیر ہے کہ مطلق کو متشخّص بنا کر سامنے لائے اور جب تشخّص آیا تو اطلاق باقی نہیں رہا۔ بابا فغانی نے دو مصرعوں کے اندر معاملہ کی پوری تصویر کھینچ دی تھی۔

مشکل حکایتیست کہ ہر ذرّہ عینِ اوست ۔۔۔ امّا نمی تواں کہ اشارت بہ او کنند

۱؎ رگ وید اور اوپانی شد کے مطالب کے لیے ہم نے حسبِ ذیل مصادر سے مدد لی ہے:-

MAXMüLLER: دی ویدک ہیمز ۔ BLOOMFIELD: دی ریلیجن آف دی وید ۔ KAEGI: دی رگ وید

CHATE: لیکچرز آن دی رگ وید ۔ DEUSSEN: دی فلاسفی آف اوپانی شد ۔ HUME: دی تھرٹین پرنسپل اوپانی شد

ہے۔کوئی اس سے باہر نہیں۔" (نتیترا - ۱ - ۱۰)

یہاں ہم مصنّف موصوف کے الفاظ پھر مستعار لیتے ہیں۔ "یہ دراصل ایک سمجھوتہ تھا جو چند خاص دماغوں کے فلسفیانہ تصوّر نے انسانی بھیڑ کے وہم پرست لوگوں کے ساتھ کر لیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خواص اور عوام کی فکری موافقت کی ایک آب و ہوا پیدا ہوگئی اور وہ برابر قائم رہی"

آگے چل کر ویدانت کے فلسفہ نے بڑی وسعتیں اور گہرائیاں پیدا کیں، لیکن خواص کے توحیدی تصوّر میں عوام کے اشراکی تصوّر سے مفاہمت کا جو میلان پیدا ہو گیا تھا، وہ متزلزل نہ ہو سکا بلکہ اور زیادہ مضبوط اور وسیع ہوتا گیا۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کر لی گئی کہ سالک جب عرفانِ حقیقت کی منزلیں طے کر لیتا ہے تو پھر ماسوا کی تمام ہستیاں معدوم ہو جاتی ہیں۔ اور ماسوا میں دیوتاؤں کی ہستیاں بھی داخل ہیں۔ گویا دیوتاؤں کی ہستیاں مظاہرِ وجود کی ابتدائی تعینات ہوئیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بنیاد بھی برابر قائم رکھی گئی کہ جب تک اس آخری مقامِ عرفان تک رسائی حاصل نہ ہو جائے، دیوتاؤں کی پرستش کے بغیر چارہ نہیں۔ اور ان کی پرستش کا جو نظام قائم ہو گیا ہے اسے چھیڑنا نہیں چاہیئے۔ اس طرح گویا ایک طرح کے توحیدی اشراکی تصوّر (MONOTHEISTIC POLY THEISM) کا مخلوط مزاج پیدا ہو گیا جو بیک وقت فکر و نظر کا توحیدی تقاضہ بھی پورا کرنا چاہتا تھا اور ساتھ ہی اصنامی عقائد کا نظامِ عمل بھی سنبھالے رکھنا چاہتا تھا۔ ویدانت کے بعض مذہبوں میں تو یہ مخلوط نوعیت بنیادی تصوّروں تک سرایت کر گئی۔ مثلاً نیمبارک اور اس کا شاگرد سری نواس برہم سوتر کی شرح کرتے ہوئے ہمیں بتلاتے ہیں کہ "اگرچہ برہما یا کرشن کی طرح کوئی نہیں مگر اس سے ظہور میں آئی ہوئی قوتیں بھی ہیں جو اس کے ساتھ اپنی نمود رکھتی ہیں اور اسی کی طرح

ے ویدانت پاری جات سورابھ جلد سوم صفحہ ۲۵۔ اس کا انگریزی ترجمہ مترجمہ ڈاکٹر رما بوس رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے حال میں شائع کیا ہے۔

پکڑ چکا تھا کہ اب اسے یک قلم اکھاڑ کے پھینک دینا آسان نہ تھا۔ اس لیے ایک یگانہ ہستی کی جلوہ طرازی کے بعد بھی دوسرے خدا نابود نہیں ہو گئے۔ البتہ اس یگانہ ہستی کا قبضہ و اقتدار ان سب پر چھا گیا اور سب اس کی ماتحتی میں آگئے۔[ۓ]

اب اس طرح کی تصریحات ہمیں ملنے لگتی ہیں کہ بغیر اس بالاتر ہستی (برہماں) کے "اگنی" دیبی کچھ نہیں کر سکتی۔ "یہ اسی کا (برہماں کا) خوف ہی جو تمام دیوتاؤں سے ان کے فرائض منصبی انجام دلاتا ہی" (تیترا اوپانی شد) راجہ اشواپتی نے جب پانچ گھر والوں سے پوچھا "تم اپنے دھیان میں کس کی پرستش کرتے ہو؟" تو ان میں سے ہر ایک نے ایک ایک دیوتا کا نام لیا۔ اس پر اشوانپی نے کہا "تم میں سے ہر ایک نے حقیقت کے صرف ایک ہی حصہ کی پرستش کی۔ حالانکہ وہ سب کے ملنے سے تشکل پذیر ہوتی ہی۔ "اندر" اس کا سر ہی۔ "سوریہ" (سورج) اس کی آنکھیں ہیں۔ "وایو" سانس ہے۔ "اکاش" (اتیھر) جسم ہی۔ "دھرتی" (زمین) اس کا پاؤں ہی"۔ (ایضاً)[ۓ]

لیکن پھر ساتھ ہی یہ بھی ہی کہ جب حقیقت کی قیومیت اور احاطہ پر زور دیا جاتا ہی تو تمام موجودات کے ساتھ دیوتاؤں کی ہستی بھی غائب ہو جاتی ہی۔ کیونکہ تمام موجودات اسی پر موقوف ہیں۔ وہ کسی پر موقوف نہیں "جس طرح رتھ کے پہیے کی تمام شاخیں ایک ہی دائرے کے اندر اپنا وجود رکھتی ہیں، اسی طرح تمام چیزیں، تمام دیوتا، تمام دنیائیں اور تمام آلات اسی ایک وجود کے اندر ہیں"۔ (برہا درنیاک اوپانی شد باب ۲ - ۵) یہاں وہ درخت موجود ہی جس کی جڑ اوپر کی طرف چلی گئی ہی اور شاخیں نیچے کی طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ برہما ہی لافانی، تمام کائنات اس میں

ۓ پروفیسر اس۔ رادھا کرشنا: انڈین فلاسفی جلد اول صفحہ ۱۴۴۔ طبع ثانی۔

ۓ اگر اوپانی شد کی اشراقی تعلیم کے دوسرے صریح شواہد موجود نہ ہوتے تو اس طرح کی تصریحات بآسانی مجازات پر محمول کی جا سکتی تھیں۔ چنانچہ دارا شکوہ نے انھیں استعارات ہی پر محمول کیا ہی۔

یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اوپانی شد ایک سو سا ٹھ ہیں۔ اور مختلف عہدوں میں مرتب ہوئے ہیں۔ ہر اوپانی شد اپنے عہد کے تدریجی تصورات و مباحث کے اثرات پیش کرتا ہی اور یہاں جو کچھ لکھا گیا ہی وہ ان نتائج پر مبنی ہی جو مجموعی حیثیت سے نکالے گئے ہیں۔

بہرحال شرک فی الصفات اور شرک فی العبادت کا یہی وہ عنصری مادہ تھا جس نے ہندوستان کے علمی مذہب کو سرتاسر اشراک اور اصنام پرستی کے عقائد سے معمور کردیا' اور بالآخر یہ صورت حال اس درجہ گہری اور عام ہوگئی کہ جب تک ایک سراغ رساں جستجو اور تفحص کی دور و دراز مسافتیں طے نہ کرلے' ہندو عقیدہ کے توحیدی تصوّر کا کوئی نشان نہیں پا سکتا۔ توحیدی تصوّر نے یہاں ایک ایسے راز کی نوعیت پیدا کرلی جس تک صرف خاص خاص عارفوں ہی کی رسائی ہوسکتی ہے۔ ہم اس کا سراغ پہاڑوں کے غاروں میں پا سکتے ہیں۔ لیکن کوچہ و بازار میں نہیں پا سکتے۔ گیارہویں صدی مسیحی میں جب ابوریحان بیرونی ہندوستان کے علوم و عقائد کے سراغ میں نکلا تھا تو یہ متضاد صورتِ حال دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ سولہویں صدی میں ویسی ہی حیرانی ابوالفضل کو پیش آئی۔ اور پھر اٹھارہویں صدی میں سر ولیم جونس کو۔

بہترین معذرت جو اس صورتِ حال کی کی جاسکتی ہے' وہ وہی ہے جس کا اشارہ گیتا کے شہرہ آفاق ترانوں میں ہمیں ملتا ہے اور جس نے البیرونی کے فلسفیانہ دماغ کو بھی اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ یعنی یہاں پہلے دن سے عقائد و عمل کی مختلف راہیں مصلحتاً کھلی رکھی گئیں تاکہ خواص اور عوام دونوں کی فہم و استعداد کی رعایت ملحوظ رہے۔ توحیدی تصوّر خواص کے لیے تھا کیونکہ وہی اس بلند مقام کے متحمل ہوسکتے تھے۔ اصنامی تصوّر عوام کے لیے تھا کیونکہ ان کی طفلانہ عقول کے لیے یہی راہ موزوں تھی۔ اور پھر چونکہ خواص بھی جمعیت و معاشرت کے عام ضبط و نظم سے باہر نہیں رہ سکتے' اس لیے عملی زندگی میں انھیں بھی اصنام پرستی کے تقاضے پورے ہی کرنے پڑتے تھے۔ اور اس طرح ہندو زندگی کی وضع و قطع بلا استثنا اشراک اور اصنام پرستی ہی کی رہتی آئی۔

البیرونی نے حکماء یونان کے اقوال نقل کر دکھایا ہے کہ اس بارے میں ہندوستان اور

کارفرمائی میں شریک ہیں۔ چنانچہ کرشن کے بائیں طرف رادھا ہے۔ یہ بخشش و نوال کی ہستی
ہے۔ تمام نتائج و ثمرات بخشنے والی۔ ہمیں چاہیئے کہ برہما کے ساتھ رادھا کی بھی پرستش کریں۔

اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ فطرتِ کائنات کے جن قوائے
مدبّرہ کو سامی تصوّر نے "ملاک" اور "ملائکہ" سے تعبیر کیا تھا، اسی کو آریائی تصوّر نے "دیو" اور
"یزتا" سے تعبیر کیا۔ یونانیوں کا "قیوس" (ΘEOS)، رومیوں کا ڈے یوس (DEUS)
پارسیوں کا "یزتا" (یزداں) سب کے اندر وہی ایک بنیادی مادہ اور وہی ایک بنیادی تصوّر
کام کرتا رہا۔ سنسکرت میں "دیو" ایک لچکدار لفظ ہے جو متعدد معنوں میں مستعمل ہوا ہے
لیکن جب مافوق الفطرت ہستیوں کے لیے بولا جاتا ہے تو اس کے معنی ایک ایسی غیر مادّی
اور روحانی ہستی کے ہو جاتے ہیں جو اپنے وجود میں روشن اور درخشاں ہو۔ سامی ادیان نے
ان روحانی ہستیوں کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں دیکھی کہ وہ خدا کی پیدا کی ہوئی کارکن
ہستیاں ہیں، لیکن آریائی تصوّر نے ان میں تدبیر و تصرّف کی بالاستقلال طاقتیں دیکھیں
اور جب توحیدی تصوّر کے قیام سے وہ استقلال باقی نہیں رہا تو توسّل اور تزلّف کا درمیانی
مقام انھوں نے پیدا کر لیا۔ یعنی اگرچہ وہ خود خدا نہیں ہیں لیکن خدا تک پہنچنے کے لیے ان
کی پرستش ضروری ہوئی۔ ایک پرستار کی پرستش اگرچہ ہوگی معبود حقیقی کے لیے، مگر ہوگی
انھی کے آستانوں پر۔ ہم براہ راست خدا کے آستانے تک پہنچ نہیں سکتے۔ ہمیں پہلے
دیوتاؤں کے آستانوں کا وسیلہ پکڑنا چاہیئے۔ دراصل یہی توسّل و تزلّف کا عقیدہ ہے جس نے
ہر جگہ توحیدی اعتقاد و عمل کی تکمیل میں خلل ڈالا۔ ورنہ ایک خدا کی یگانگی اور بالاتری سے تو
کسی کو بھی انکار نہ تھا۔ عرب جاہلیت کے بت پرستوں کا بھی یہی عقیدہ قرآن نے نقل کیا
ہے کہ ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفی۔

کی جدولیں، غرضیکہ موجودات خلقت کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جو خدائی حکومت میں شریک نہ کرلی گئی ہو۔ گویا ایک بے لگام اور خودرو تخیل کو پروانہ مِل گیا تھا کہ دنیا کی جتنی چیزوں کو خدائی مسند پر بٹھا سکتا ہو، بے روک ٹوک بٹھاتا رہے۔ پھر جیسے خداؤں کی یہ بے شمار بھیڑ بھی اس کے ذوقِ خداسازی کے لیے کافی نہ ہوئی ہوں۔ طرح طرح کے عفریتوں اور عجیب الخلقت جسموں کی متخیلہ صورتوں کا بھی ان پر اضافہ ہوتا رہا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اوپانی شدوں نے فکر و نظر کی دنیا میں ان خداؤں کی سلطانی برہم کر دی تھی۔ لیکن عمل کی زندگی میں انھیں چھیڑا گیا۔ وہ بدستور اپنی خدائی مسندوں پر جمے رہے۔[1]

شمنی مذہب اور اس کے تصوّرات قدیم برہمنی مذہب کے بعد شمنی مذہب (یعنی بدھ مذہب) کا ظہور ہوا۔ اسلام کے ظہور سے پہلے ہندوستان کا عام مذہب یہی تھا۔ شمنی مذہب کے اعتقادی مبادیات کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں۔ انیسویں صدی کے مستشرقوں کے ایک گروہ نے اسے اوپانی شدوں کی تعلیم ہی کا ایک عملی استغراق قرار دیا تھا۔ اور خیال کیا تھا کہ "نروان" میں جاذبِ انفصال کی روحانی اصل پوشیدہ ہے۔ یعنی جس سرچشمہ سے انسانی ہستی نکلی ہے پھر اسی میں واصل ہو جانا "نروان" یعنی نجاتِ کامل ہے۔ لیکن اب عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ شمنی مذہب خدا اور روح کی ہستی کا کوئی تصوّر نہیں رکھتا۔ اس کا دائرۂ اعتقاد و عمل صرف زندگی کی سعادت اور نجات کے مسئلہ میں محدود ہے۔ وہ صرف پرکرتی یعنی مادہ ازلی کا حوالہ دیتا ہے جسے کائناتی طبیعت حرکت میں لاتی ہے۔ نروان سے مقصود یہ ہے کہ ہستی کی انانیت فنا ہو جائے اور زندگی کے چکّر سے نجات مل جائے۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک

---

[1] پروفیسر ایس۔ رادھا کرشنان۔ انڈین فلاسفی جلد اول، صفحہ ۴۵۳، طبع ثانی۔

یونان، دونوں کا حال ایک ہی طرح کا رہا۔ پھر گیتا کا یہ قول نقل کیا ہے "کہ" بہت سے لوگ مجھ تک (یعنی خدا تک) اس طرح پہنچنا چاہتے ہیں کہ میرے سوا دوسروں کی عبادت کرتے ہیں۔ لیکن میں ان کی مراد پوری بھی کر دیتا ہوں۔ کیونکہ میں ان سے اور ان کی عبادت سے بے نیاز ہوں[1]

بے محل نہ ہوگا، اگر اس موقعے پر زمانۂ حال کے ایک ہندو مصنّف کی رائے پر بھی نظر ڈال لی جائے۔ گوتم بدھ کے ظہور سے پہلے ہندو مذہب کے تصوّرِ الوہیت نے جو عام شکل و صورت پیدا کر لی تھی، اس پر بحث کرتے ہوئے یہ قابل مصنّف لکھتا ہے:۔

گوتم بدھ کے عہد میں جو مذہب ملک پر چھایا ہوا تھا، اس کے نمایاں خط و خال یہ تھے کہ لین دین کا ایک سودا تھا، جو خدا اور انسانوں کے درمیان ٹھہر گیا تھا جبکہ ایک طرف اوپانی شد کا برہماں تھا جو ذاتِ الوہیت کا ایک اعلیٰ اور شائستہ تصوّر پیش کرتا تھا، تو دوسری طرف اَن گنت خداؤں کا ہجوم تھا جن کے لیے کوئی حد بندی نہیں ٹھہرائی جا سکتی تھی۔ آسمان کے ستارے، مادہ کے عناصر، زمین کے درخت، جنگل کے حیوان، پہاڑوں کی چٹانیں، دریاؤں

---

[1] البیرونی نے کتاب الہند میں بعض سنسکرت کتابوں سے بتوں کے بنانے کے احکام و قواعد نقل کیے ہیں۔ اس کے بعد لکھتا ہے: وکان الغرض فی حکایۃ ھذا الھذیان ان تعرف الصورۃ من صنعھا اذا شوھد ولیتحقق ما قلنا من ان ھذہ الاصنام للعوام الذین سفلت مراتبھم وقصرت معارفھم وما عمل صنم قط باسم من علا المادۃ فضلاً عن اللّٰہ تعالیٰ ولیعرف کیف یعبد السفل بالتمویھات، وکذالک قیل فی کتاب گیتا ان کثیراً من الناس یتقربون فی مباغیھم الی الغیر ویتوسّلون بالصدقات والتسبیح والصلوٰۃ لسوای فاقویھم علیھا واوفقھم لھا واوصلھم الی ارادتھم لاستغنائی عنھم (صفحہ ۵۹) آج کل کے تمام ہندو اہل نظر جو ہندو عقائد و تصوّرات کی فلسفیانہ تعبیر کرنی چاہتے ہیں، عموماً یہی توجیہہ پیش کرتے ہیں۔ جو البیرونی نے پیش کی تھی۔ ابوالفضل اور دارا شکوہ نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے۔

اس اضافی انکار نے مطلق انکار کی شکل پیدا کر لی اور پھر برہمنی مذہب کی مخالفتوں کے علاوہ نے معاملہ کو دور تک پہنچا دیا۔[۵]

بہر حال خود گوتم بدھ اور اس کی تعلیم کے شارحوں کی تصریحات اس بارے میں کچھ بھی رہی ہوں مگر یہ واقعہ ہے کہ اس کے پیرووں نے خدا کے تصور کی خالی مسند بہت جلد بھر دی۔ انھوں نے اس مسند کو خالی دیکھا تو خود گوتم بدھ کو وہاں لا کر بٹھا دیا، اور پھر اس نئے معبود کی پرستش اس جوش و خروش کے ساتھ شروع کر دی کہ آدھی سے زیادہ دنیا اس کے بتوں سے معمور ہو گئی!

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را   وقت است کہ دیگر نبکدہ سازند حرم را

گوتم بدھ کی وفات پر ابھی زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا کہ پیروانِ بدھ کی اکثریت نے اس کی شخصیت کو عام انسانی سطح سے بالاتر دیکھنا شروع کر دیا تھا، اور اس کے آثار و تبرکات کی پرستش کا میلان بڑھنے لگا تھا۔ اس کی وفات کے کچھ عرصہ بعد جب مذہب کی پہلی مجلس اعظم راج گیری میں منعقد ہوئی اور اس کے شاگرد خاص آنند نے اس کی آخری وصایا بیان کیں تو بیان کیا جاتا ہے کہ لوگ اس کی روایت پر مطمئن نہ ہوئے۔ اور اس کے مخالف ہو گئے۔ کیونکہ اس کی روایتوں میں انھیں وہ ماوراءِ انسانیت عظمت نظر نہیں آئی جسے اب ان کی طبیعت ڈھونڈنے لگی تھی۔ تقریباً سو برس بعد جب دوسری مجلس ویسالی (مظفر پور حالی) میں منعقد ہوئی تو اب مذہب کی بنیادی سادگی اپنی جگہ کھو چکی تھی اور اس کی جگہ

۱؎ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ میرا ذاتی استنباط ہے اور مجھے حق نہیں کہ اپنی رائے کو وثوق کے ساتھ ان محققوں کے مقابلہ میں پیش کروں جنھوں نے اس موضوع کے مطالعہ میں زندگیاں بسر کر دی ہیں۔ تاہم میں مجبور ہوں کہ اپنی محدود معلومات کی روشنی میں جن نتائج تک پہنچا ہوں ان سے دست بردار نہ ہوں۔ یورپ کے محققوں نے بدھ مذہب کے مصادر (پالی، تبتی، چینی) کی تحقیق میں بڑی کد و کاوش کی ہے اور پالی زبان کے تمام اہم مصادر فرنچ یا انگریزی میں منتقل کر لیے ہیں۔ میں نے حتی الامکان اس تمام مواد کے مطالعہ کی کوشش

مابعد زمانے کے شمنی مفکرین کی تصریحات کا تعلق ہے، یہی تفسیر صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اگر ان کا ایک گروہ لاادریت (Agnosticism) تک پہنچ کر رُک گیا ہے تو دوسرا گروہ اس سے بھی آگے نکل گیا ہے اور مدّعیانہ انکار کی راہ اختیار کی ہے۔ موکشا آکر گپتا نے "ترک بھاشا"[1] میں ان تمام دلائل کا رد کیا ہے جو نیائے[2] اور ویشیسک طریق نظر کے نظّار خدا کی ہستی کے اثبات میں پیش کرتے تھے۔ تاہم یہ بات بھی قطعی طور پر نہیں کہی جا سکتی کہ خود گوتم بدھ کا سکوت و توقف بھی انکار پر مبنی تھا۔ اس کے سکوتی تحفظات متعدد مسئلوں میں ثابت ہیں۔ اور اس کے متعدد محمل قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ اگر ان تمام اقوال پر جو براہ راست اس کی طرف منسوب ہیں غور کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا مسلک نفیٔ ذات کا نہ تھا، نفیٔ صفات کا تھا۔ نفیٔ صفات کا مقام ایسا ہے کہ انسانی فکر و زبان کی تمام تعبیرات معطل ہو جاتی ہیں اور سکوت کے سوا چارہ کار باقی نہیں رہتا۔

علاوہ بریں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ اس کے ظہور کے وقت اصنامی خدا پرستی کے مفاسد بہت گہرے ہو چکے تھے اور اصنامی خدا پرستی بجائے خود راہ حقیقت کی سب سے بڑی روک بن گئی تھی۔ اس نے اس روک سے راستہ صاف کر دینا چاہا اور تمام توجہ زندگی کی عملی سعادت کے مسئلہ پر مرکوز کر دی۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ برہمنی خدا پرستی کے عقائد سے انکار کیا جائے اور اس پر زور دیا جائے کہ نجات کی راہ ان معبودوں کی پرستش میں نہیں ہے بلکہ علم حق اور عمل حق میں ہے۔ یعنی "اشٹانگ مارگ"[3] میں ہے۔ آگے چل کر

---

[1] یہ قدیم کتاب جس کا صرف تبتی نسخہ دنیا کے علم میں آیا تھا، اب اصل سنسکرت میں نکل آئی ہے۔ اور گائیکواڑ اورینٹل سیریز کے ادارے نے حال میں شائع کر دی ہے۔ میسور کا مشرقی کتب خانہ بھی اس کا ایک دوسرا نسخہ اشاعت کے لیے مرتب کر رہا ہے

[2] "نیائے" یعنی منطق "ویشیسک" طریق نظر سے مقصود منطقی نقد و تحلیل کا ایک خاص مسلک ہے۔

[3] گوتم بدھ کی تعلیم میں "اشٹانگ مارگ" یعنی آٹھ باتوں کا طریقہ ایک بنیادی اصل ہے، آٹھ باتوں سے مقصود علم اور عمل کا تزکیہ و طہارت ہے۔ علم حق، رحم و شفقت، قربانی، ہوا و ہوس سے آزادی، خودی کو مٹانا وغیرہ

بدھ کی شخصیت کسی بُت کے ذریعے نہیں، بلکہ صرف ایک کنول کے پھول یا ایک خالی کرسی کی شکل میں دکھائی گئی ہے۔ پھر کنول اور خالی کرسی کی جگہ دو قدم نمودار ہونے لگے اور پھر بتدریج قدموں کی جگہ خود بودھ کا پورا مجسمہ نمودار ہو گیا۔ اگر یہ استنباط صحیح تسلیم کر لیا جائے جب بھی ماننا پڑے گا کہ اشوک کے زمانے کے بعد سے بدھ کے بتوں کی عام پرستش جاری ہو گئی تھی۔ اشوک کا عہد ۲۵۰ قبل از مسیح تھا۔

(۳) ایرانی مجوسی تصوّر زردشت کے ظہور سے پہلے ماوا زمیڈیا) اور پارس میں ایک قدیم ایریانی[1] طریقِ پرستش رائج تھا۔ ہندوستان کے ویدوں میں دیوتاؤں کی پرستش اور قربانیوں کے اعمال و رسوم جس طرح پائے جاتے ہیں قریب قریب ویسے ہی عقائد و رسوم پارس اور ماد میں بھی پھیلے ہوئے تھے۔ دیوتائی طاقتوں کو ان کے دو بڑے مظہروں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک طاقت روشن ہستیوں کی تھی جو انسان کو زندگی کی تمام خوشیاں بخشتی تھی۔ دوسری برائی کے تاریک عفریتوں کی تھی جو ہر طرح کی مصیبتوں اور ہلاکتوں کا سرچشمہ تھی۔ آگ کی پرستش کے لیے قربان گاہیں بنائی جاتی تھیں اور ان کے پجاریوں کو "موگوش" کے نام سے پکارا جاتا تھا اوستا کے گاتھا میں انہیں "کارپان" اور "کاوی" کے نام سے بھی پکارا گیا ہے۔ آگے چل کر اسی "موگوش" نے آتش پرستی کا مفہوم پیدا کر لیا اور غیر قومیں ایرانیوں کو "مگ" اور "مگوش" کے نام سے پکارنے لگیں۔ عربوں نے اسی "موگوش" کو "مجوس" کر دیا۔

مزدیسنا زردشت کا جب ظہور ہوا تو اس نے ایرانیوں کو ان کے قدیم عقائد سے

---

[1] "ایرایان" وہی لفظ ہے جو ہندوستان میں "آریا" ہو گیا۔ اوستا میں جو بیس ملکوں کی پیدائش کا ذکر کیا گیا ہے جس میں سب سے پہلا اور سب سے بہتر "ایریانا ویج" ہے اور غالباً اسی سے شمالی ایران مقصود ہے (وندیداد۔ فرگرد اول۔ فقرہ ۲) ہرمزدیشت کے فقرہ ۲۱ میں بھی "ایریانا ویج" کا ذکر کیا ہے اور اس پر درود بھیجا ہے۔ "ویج" جرمن مستشرق اسپیگل کی قرأت ہے۔ انک تیل نے اسے "ویگو" پڑھا تھا۔ "ویج" یا "ویگو" کے معنی پہلوی میں مبارک کے ہیں۔ یعنی مبارک ایریانا کی سرزمین۔

نئے نئے تصوروں اور مخلوط عقیدوں نے لے لی تھی۔ اب مسیحی مذہب کے اقانیم ثلاثہ کی طرح جو پانچ سو برس بعد ظہور میں آنے والا تھا، ایک شمنی اقانیم کا عقیدہ بدھ کی شخصیت کے گرد ہالے کی طرح چمکنے لگا اور عام انسانی سطح سے وہ ماورا تسلیم کر لی گئی۔ یعنی بدھ کی ایک شخصیت کے اندر تین وجودوں کی نمود ہوگئی: اس کی تعلیم کی شخصیت، اس کے دنیاوی وجود کی شخصیت اس کے حقیقی وجود کی شخصیت لوگ (بہشت) میں رہتی ہے۔ دنیا میں جب کبھی بدھ کا ظہور ہوتا ہے تو یہ اس حقیقی وجود کا ایک پرتو ہوتا ہے۔ نجات پانے کے معنی یہ ہوئے کہ آدمی حقیقی بدھ کے اسی ماورا عالم مسکن میں پہنچ جائے۔ پہلی صدی مسیح میں بعہد کوشان جب چوتھی مجلس پرشادر (پشاور حالی) میں منعقد ہوئی تو اب بنیادی مذہب کی جگہ ایک طرح کا کلیسائی مذہب قائم ہو چکا تھا۔ اور بدھ کے اشٹانگ مارگ (طریق ثمانیہ) کی عملی روح طرح طرح کی رسوم پرستیوں اور قواعد آرائیوں میں معدوم ہو چکی تھی

بالآخر پیروانِ بدھ دو بڑے فرقوں میں بٹ گئے۔ "ہینیان" اور "مہایان"۔ پہلا فرقہ بدھ کی شخصیت میں ایک رہنما اور معلم کی انسانی شخصیت دیکھنی چاہتا تھا، لیکن دوسرے نے اسے پوری طرح ماورائے انسانیت کی ربانی سطح پر متمکن کر دیا تھا اور پیروانِ بدھ کی عام راہ وہی ہو گئی تھی۔ افغانستان، بامیان، وسط ایشیا، چین، کوریا، جاپان، تبت، سب میں مہایان مذہب ہی کی تبلیغ و اشاعت ہوئی۔ چینی سیاح فاہین جب چوتھی صدی مسیحی میں ہندوستان آیا تھا، تو اس نے پورب کے ہینیان شمنیوں سے مباحثہ کیا تھا اور مہایان طریقہ کی صداقت کے دلائل پیش کیے تھے۔ موجودہ زمانے میں سیلون کے سوا جہاں ہینیان طریقے کا ایک محرف بقیہ "تھیراواد" کے نام سے پایا جاتا ہے تمام پیروانِ بدھ کا مذہب مہایان ہے۔

موجودہ زمانے کے بعض محققینِ شمنیہ کا خیال ہے کہ اشوک کے زمانے تک بدھ مذہب میں بت پرستی کا عام رواج نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ اس عہد تک جو بدھ آثار ملتے ہیں، ان میں

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ چند صدیوں کے بعد ایران کے قدیم تصورات اور بیرونی اثرات پھر غالب آگئے۔ اور ساسانی عہد میں جب "مزدیسنا" کی تعلیم کی از سر نو تدوین ہوئی تو قدیم مجوسی یونانی اور زردشتی عقائد کا ایک مخلوط مرکب تھا اور اس کا بیرونی رنگ و عنق تو تمام تر مجوسی تصور ہی نے فراہم کیا تھا۔ اسلام کا جب ظہور ہوا تو یہی مخلوط تصور ایران کا قومی مذہبی تصور تھا۔ مغربی ایران کے پارسی مہاجر یہی تصور اپنے ساتھ ہندوستان لائے اور پھر یہاں کے مقامی اثرات کی ایک تہہ اس پر اور چڑھ گئی۔

مجوسی تصور کی بنیاد ثنویت (Dualism) کے عقیدے پر تھی یعنی خیر اور شر کی دو الگ الگ قوتیں ہیں۔ اہورامزد جو کچھ کرتا ہے، خیر اور روشنی ہے، انگرامے نیوش یعنی اہرمن جو کچھ کرتا ہے، شر اور تاریکی ہے۔ عبادت کی بنیاد سورج اور آگ کی پرستش پر رکھی گئی کہ روشنی یزدانی صفات کی سب سے بڑی مظہر ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ مجوسی تصور نے خیر اور شر کی گتھی یوں سلجھانی چاہی کہ کارخانۂ ہستی کی سربراہی دو متقابل اور متعارض قوتوں میں تقسیم کردی۔

(۴) یہودی تصور یہودی تصور ابتدا میں ایک محدود نسلی تصور تھا۔ یعنی کتاب پیدائش کا یہوا خاندان اسرائیل کے نسلی خدا کی حیثیت سے نمایاں ہوا تھا لیکن پھر یہ تصور بتدریج وسیع ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ یشعیا دوم[1] کے صحیفہ میں "تمام قوموں کا خدا" اور "تمام قوموں کا ہیکل" نمایاں ہوگیا۔ تاہم "اسرائیلی خدا" کا نسلی اختصاص کسی نہ کسی شکل میں برابر کام کرتا ہی رہا۔ اور ظہور اسلام کے وقت اس کے نمایاں خال و خط نسل اور جغرافیہ ہی کے خال و خط تھے۔

---

[1] عہد عتیق میں یشعیا نبی کی طرف جو کتاب منسوب ہے، اس کی زبان اور مطالب کا آیت ۱۵ تک ایک خاص انداز ہے اور پھر اس کے بعد بالکل دوسرا ہو جاتا ہے۔ ابتدائی حصہ ایک ایسے شخص کا کلام معلوم ہوتا ہے جو قید بابل سے پہلے تھا لیکن بعد کے حصہ میں قید بابل کے زمانے کے اثرات صاف صاف نمایاں ہیں۔ اس لیے انیسویں صدی کے نقادوں نے اسے دو شخصوں کے کلام میں تقسیم کردیا۔ ایک کو یشعیا اول اور دوسرے کو دوم سے تعبیر کرتے ہیں۔

نجات دلائی اور "مزدلیسنا" کی تعلیم دی یعنی دیوتاؤں کی جگہ ایک خدائے واحد" اہورامزد" کی پرستش کی۔ یہ اہورامزد یگانہ ہے، بے ہمتا ہے، بے مثال ہے، نور ہے، پاک ہے، سرتاسر حکمت اور خیر ہے اور تمام کائنات کا خالق ہے۔ اس نے انسان کے لیے دو عالم بنائے۔ ایک عالم دنیوی زندگی کا ہے، دوسرا مرنے کے بعد کی زندگی کا۔ مرنے کے بعد جسم فنا ہو جاتا ہے مگر روح باقی رہتی ہے اور اپنے اعمال کے مطابق جزا پاتی ہے۔

دیوتاؤں کی جگہ اس نے "امش سپند" اور "یزتا" کا تصور پیدا کیا۔ یعنی فرشتوں کا یہ فرشتے اہورامزد کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔ برائی اور تاریکی کی طاقتوں کی جگہ "انگرامے نیوش" کی ہستی کی خبر دی یعنی شیطان کی۔ یہی انگرامے نیوش پاژند کی زبان میں "اہرمن" ہو گیا۔

زردشت کی تعلیم میں ہندوستانی آریاؤں کے ویدی عقائد کا رد صاف نمایاں ہے۔ ایک ہی نام ایران اور ہندوستان دونوں جگہ ابھرتا ہے اور متضاد معنی پیدا کر لیتا ہے۔ اوستا کا "اہورا" سام اور یجر وید میں "اسورا" ہے۔ اور اگرچہ رگ وید میں اس کا اطلاق اچھے معنوں پر ہوا تھا مگر اب وہ برائی کی شیطانی روح بن گیا ہے۔ ویدوں کا "اندرا" اوستا کا "انگرا" ہو گیا۔ ویدوں میں وہ آسمان کا خدا تھا۔ اوستا میں زمین کا شیطان ہے۔ ہندوستان اور یورپ میں "دیو" اور "ڈے یوس" اور "تھیوس" خدا کے لیے بولا گیا، لیکن ایران میں دیو کے معنی عفریت کے ہو گئے۔ گویا دونوں عقیدے ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ ایک کا خدا دوسرے کا شیطان ہو جاتا تھا، اور دوسرے کا شیطان پہلے کے لیے خدا کا کام دیتا تھا۔ اسی طرح ہندوستان میں یم موت کی طاقت ہے۔ اوستا کی روایتوں میں "یم" زندگی اور انسانیت کی سب سے بڑی سود سوئی اور پھر یہی "یم" جم ہو کر جمشید ہو گیا۔

فسانہ ہا کہ بہار جیبہ روز گار سرود کنوں بہ مسند جمشید تاج کے لستنند

ہوئی اور یہودی تصور میں بیک وقت وسعت اور لطافت دونوں طرح کے عناصر نمایاں ہونے لگے۔ گویا اب ایک نئی تصوری فضا کے لیے زمانے کا مزاج تیار ہونے لگا تھا۔ چنانچہ مسیحیت آئی تو رحم و محبت اور عفو و بخشش کا ایک نیا تصور لے کر آئی۔ اب خدا کا تصور نہ تو جابر بادشاہ کی طرح قہر آلود تھا، نہ رشک و غیرت میں ڈوبے ہوئے شوہر کی طرح سخت گیر تھا بلکہ باپ کی محبت و شفقت کی مثال نمایاں کرتا تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ یہودی تصور کی شدت و غلظت کے مقابلہ میں رحم و محبت کی رقت کا یہ ایک انقلابی تصور تھا۔ انسانی زندگی کے سارے رشتوں میں ماں اور باپ کا رشتہ سب سے بلند تر رشتہ ہے۔ اس میں شوہر کے رشتہ کی طرح جذبوں اور خواہشوں کی غرضوں کو دخل نہیں ہوتا۔ یہ سراسر رحم و شفقت اور پرورش و چارہ سازی ہوتی ہے۔ اولاد بار بار قصور کرے گی، لیکن ماں کی محبت پھر بھی گردن نہیں موڑے گی۔ اور باپ کی شفقت پھر بھی معافی سے انکار نہیں کرے گی۔ پس اگر خدا کے تصور کے لیے انسانی رشتوں کی مشابہتوں سے کام لیے بغیر چارہ نہ ہو، تو بلاشبہ شوہر کی تمثیل کے مقابلہ میں باپ کی تمثیل کہیں زیادہ شائستہ اور ترقی یافتہ تمثیل ہے[1]۔

تجسم اور تنزیہ کے لحاظ سے مسیحی تصور کی سطح اصلاً وہی تھی جہاں تک یہودی تصور پہنچ چکا تھا۔ مگر جب مسیحی عقائد کا رومی اصنام پرستی کے تصوروں سے امتزاج ہوا تو اقانیم ثلاثہ، کفارہ اور مسیح پرستی کے تصورات چھا گئے۔ اور اسکندریہ کے فلسفہ آمیز اصنامی تصور سراپیز (SERAPIS) نے مسیحی اصنامی تصور کی شکل اختیار کر لی۔ اب مسیحیت کو بت پرستوں کی بت پرستی سے تو انکار تھا، لیکن خود اپنی بت پرستی پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ میڈونا کے قدیم

---

[1] اسی لیے ہندو تصور نے ماں کی تشبیہ سے کام لیا، کیونکہ ماں کی تشبیہ میں اگرچہ انسانیت آجاتی ہے، مگر تشبیہ باپ سے بھی زیادہ پُر اثر ہو جاتی ہے۔ باپ کی شفقت کبھی کبھی جواب دے جائے گی لیکن ماں کی محبت کو اگر اثر کے لیے کوئی [illegible] نہیں۔

تجسّم اور تنزیہہ کے اعتبار سے وہ ایک درمیانی درجہ رکھتا تھا، اور اس میں غالب عنصر قہر و غضب اور انتقام و تعذیب کا تھا۔ خدا کا بار بار متشکل ہوکر نمودار ہونا مخاطبات کا تمام تر انسانی اوصاف و جذبات سے آلودہ ہونا، قہر و انتقام کی شدّت اور ابتدائی درجہ کا تمثیلی اسلوب، تورات کے صحیفوں کا عام تصوّر ہے۔

خدا کا انسان سے رشتہ اس نوعیّت کا رشتہ ہوا جیسے ایک شوہر کا اپنی بیوی سے ہوتا ہے۔ شوہر نہایت غیور ہوتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کی ساری خطائیں معاف کر دے گا لیکن یہ جرم معاف نہیں کرے گا کہ اس کی محبت میں کسی دوسرے مرد کو بھی شریک کرے اسی طرح خاندان اسرائیل کا خدا بھی بہت غیور ہے۔ اس نے اسرائیل کے گھرانے کو اپنی چہیتی بیوی بنایا اور چونکہ چہیتی بیوی بنایا، اس لیے خاندان اسرائیل کی بے وفائی اور غیر قوموں سے آشنائی اس پر بہت ہی شاق گذرتی ہے اور ضروری ہے کہ وہ اس جرم کے بدلے سخت سزائیں دے۔ چنانچہ احکام عشرہ (TEN COMMANDMENTS) میں ایک حکم یہ بھی تھا۔ "تو کسی چیز کی صورت نہ بنائیو اور نہ اس کے آگے جھکیو۔ کیونکہ میں خداوند تیرا خدا رشک کرنے والا ایک بہت ہی غیور خدا ہوں!" (خروج ۲۱)

شوہر کے رشتے کی یہ تمثیل جو مصر سے خروج کے بعد متشکل ہونا شروع ہو گئی تھی، آخر عہد تک کم و بیش قائم رہی۔ یہودیوں کی ہر گمراہی پر خدا کے غضب کا اظہار ایک غضبناک شوہر کا پُر جوش اظہار ہوتا ہے۔ جو اپنی چہیتی بیوی کو اس کی ایک ایک بے وفائی یاد دلا رہا ہو یہ اسلوب تمثیل بظاہر کتنا ہی موثر اور شاعرانہ دکھائی دیتا ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ خدا کے تصوّر کے لیے ایک ابتدائی درجہ کا غیر ترقی یافتہ تصوّر تھا۔

(۵) مسیحی تصوّر — لیکن یسعیاہ دوم کے زمانے سے اس صورت حال میں تبدیلی شروع

سراغ لگانا چاہا تھا جسے اصل کائنات قرار دیا جا سکے۔ پانچویں صدی قبل از مسیح فیثا غورث (PYTHAGORAS) کا ظہور ہوا اور اس نے نئے نئے فکری عنصروں سے فلسفہ کو آشنا کیا۔ فیثا غورث کے سفرِ ہند کی روایت صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کے فلسفیانہ تصوّروں میں ہندوستانی طریقِ فکر کی مشابہتیں پوری طرح نمایاں ہیں۔ تناسخ کا غیر مشتبہ عقیدہ پانچویں آسمانی عنصر (QUINTA ESSENTIA) کا اعتراف نفس انسانی کی انفرادیت کا تصوّر، مکاشفاتی طریقِ ادراک کی جھلک اور سب سے زیادہ یہ کہ ایک "طریقِ زندگی" کے ضابطہ کا اہتمام ایسے مبادیات ہیں جو ہمیں اوپانی شد کے دائرۂ فکر و نظر سے بہت قریب کر دیتے ہیں۔ فیثا غورث کے بعد انکساغورس (ANAXAGORAS) نے ان مبادیات کو کلیاتی (ABSTRACTS) تصوّرات کی نوعیت کا جامہ پہنایا اور اس طرح یونانی فلسفے کی وہ بنیاد استوار ہو گئی جس پر آگے چل کر سقراط اور افلاطون اپنی کلّیاتی تصوّریت کی عمارتیں کھڑی کرنے والے تھے۔

سقراط کی شخصیت میں یونان کے توحیدی اور تنزیہی اعتقاد کی سب سے بڑی نمود ہوئی سقراط سے پہلے جو فلسفی گذرے تھے، انھوں نے قومی پرستش گاہوں کے دیوتاؤں سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ کیونکہ خود ان کے دل و دماغ بھی ان کے اثرات سے خالی نہیں ہوئے تھے نفوسِ فلکی کے تصوّرات کی اگر اصل حقیقت معلوم کی جائے تو اس سے زیادہ نہیں نکلے گی کہ یونان کے کواکبی دیوتاؤں نے علم و نظر کے حلقوں سے روشناس ہونے کے لیے ایک نیا فلسفیانہ نقاب اپنے چہروں پر ڈال لیا تھا۔ اور اب ان کی ہستی صرف عوام ہی کو نہیں بلکہ فلسفیوں کو بھی تسکین دینے کے قابل بنا دی گئی تھی۔ یہ تقریباً ویسی ہی صورتِ حال تھی جو ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہم ہندوستان کی قدیم تاریخ کے صفحوں پر دیکھ رہے تھے۔ لیکن فکری غور و خوض کے نتائج ایک ایسی لچکدار صورت میں ابھرنے لگے کہ ایک طرف فلسفیانہ دماغوں کے تقاضوں کا تشفی

بُت کی جگہ اب ایک نئی مسیحی میڈونا کا بُت تیار ہو گیا۔ یہ خدا کے فرزند کو گود میں لیے ہوئے تھی اور ہر راسخ الاعتقاد مسیحی کی جبینِ نیاز کا سجدہ طلب کرتی تھی!

غرضیکہ قرآن کا جب نزول ہوا تو مسیحی تصوّر رحم و محبّت کی پدری تمثیل کے ساتھ اقانیم ثلاثہ، کفارہ اور تجسّم کا ایک مخلوط اشراکی۔ توحیدی تصوّر تھا۔

فلاسفۂ یونان اور اسکندریہ کا تصوّر ان تصوّروں کے علاوہ ایک تصوّر فلاسفۂ یونان کا بھی ہے جو اگرچہ مذاہب کے تصوّروں کی طرح اقوامِ عالم کا تصوّر نہ ہو سکا، تاہم انسان کی فکری نشوونما کی تاریخ میں اس نے بہت بڑا حصّہ لیا، اور اس لیے اُسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تقریباً پانچسو برس قبل از مسیح یونان میں توحید کا تصوّر نشوونما پانے لگا تھا۔ اس کی سب سے بڑی معلم شخصیت سقراط (SOCRATES) کی حکمت میں نمایاں ہوئی جسے افلاطون (PLATO) نے تدوین و انضباط کے جامے سے آراستہ کیا۔

جس طرح ہندوستان میں رگ وید کے دیوبانی تصوّرات نے بالآخر ایک ربُّ الاربابی تصوّر کی نوعیت پیدا کر لی تھی اور پھر اسی ربُّ الاربابی تصوّر نے بتدریج توحیدی تصوّر کی طرف قدم بڑھایا تھا، ٹھیک اسی طرح یونان میں بھی اُلمپس کے دیوتاؤں کو بھی بالآخر ایک ربُّ الارباب ہستی کے آگے جھکنا پڑا اور پھر یہ ربّ الاربابی تصوّر بتدریج کثرت سے وحدت کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ یونان کے قدیم ترین تصوّروں کے معلوم کرنے کا تنہا ذریعہ اس کی پرانی شاعری ہے۔ جب ہم اسکا مطالعہ کرتے ہیں تو دو عقیدے برابر پسِ پردہ کام کرتے دکھائی دیتے ہیں: مرنے کے بعد کی زندگی، اور ایک سب سے بڑی اور سب پر چھائی ہوئی اُلوہیّت۔

آئیونی (IONIE) فلسفے نے جو یونانی مذاہب فلسفہ میں سب سے زیادہ پرانا ہے اجرامِ سماوی کی ان نیکی روحوں کا اعتراف کیا تھا اور پھر ان روحوں کے اوپر کسی ایسی روح کا

اس نے مرنے سے پہلے آخری بات جو کہی تھی، وہ یہ تھی "وہ ایک کمتر دنیا سے بہتر دنیا کی طرف جا رہا ہے"۔[1]

افلاطون نے سقراط کے باحثانہ (DIALECTIC) افکار کو جو ایک معلّم کے درس و املا کی نوعیت رکھتے تھے، ایک مکمّل ضابطہ کی شکل دے دی اور منطقی تحلیل کے ذریعے انھیں کلیات و جوامع کی صورت میں مرتب کیا۔ اس نے اپنے تمام فلسفیانہ بحث و نظر کی بنیاد کلّیات (ABSTACTS) پر رکھی اور حکومت سے لے کر خدا کی ہستی تک سب کو تصوریّت (IDEA) کا جامہ پہنا دیا۔ اگر تصوریت محسوسات سے الگ ہستی رکھتی ہے تو ناؤس[1] (NAUSE) یعنی نفس ناطقہ بھی مادّے سے الگ اپنی ہستی رکھتا ہے اور اگر نفس مادے سے الگ ہستی رکھتا ہے تو خدا کی ہستی بھی مادّیات سے الگ اپنی نمود رکھتی ہے۔ اس نے انکساغورس کے مسلک کے خلاف دو نفسوں میں امتیاز کیا۔ ایک کو فانی قرار دیا۔ دوسرے کو لافانی۔ فانی نفس خواہشیں رکھتا ہے اور وہی مجسّم ایجو (EGO) ہے، لیکن لافانی نفس کائنات کی اصل عاقلہ ہے۔ اور جسمانی زندگی کی تمام آلائشوں سے یک قلم منزہ۔ یہی نفس کلّی کی وہ الہٰی چنگاری ہے جس نے انسان کے اندر قوتِ مدرکہ کی روشنی کا چراغ روشن کر دیا ہے۔ یہاں پہنچ کر نفس کلّی کا تصوّر بھی ایک طرح سے وحدۃ الوجودی تصوّر کی نوعیت پیدا کر لیتا ہے۔ دراصل ہندو فلسفے کا "آتما" اور یونانی فلسفے کا "نفس" ایک ہی مسمّٰی کے دو نام ہیں۔ یہاں "آتما" کے بعد "پرم آتما"

---

[1] "ناؤس" جس کا تلفظ "ناؤز" کیا جاتا ہے، عربی کے "نفس" سے اس درجہ صوتی مشابہت رکھتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے "ناؤز" تعریب کا جامہ پہن کر نفس ہو گیا۔ اسی طرح نوئٹک (NOETIC) اور "ناطق" اس درجہ قریب ہیں کہ دوسرے کو پہلے کی تعریب سمجھا جا سکتا ہے چنانچہ رینان اور دوزی نے نفس ناطقہ کو "نوئٹک ناؤز" کا معرّب قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ ناطق نطق سے نہیں ہے، بلکہ "نوئٹک" کی تعریب ہے جس کے معنے ادراک کے ہیں۔ بعض عربی مصادر سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ اصل یونانی الفاظ پیش نظر رکھے گئے تھے۔

"نفس" عربی لغت میں ذات اور خود کے معنی میں بولا جاتا تھا اور ارسطو نے عاقلانہ نطق کو انسان کی فصل قرار دیا تھا اسلیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب مترجموں نے یونانی تعبیر سامنے رکھ کر نفس ناطقہ کی ترکیب اختیار کر لی اور یہ تعریب دعربی الفاظ کے مدلول ..

جواب دیا جا سکے، دوسری طرف عوام کے قومی عقائد سے بھی تصادم نہ ہو۔ ہندوستان کی طرح یونان میں بھی خواص و عوام کے فکر و عمل نے باہم دگر سمجھوتہ کر لیا تھا یعنی توحیدی اور اصنامی عقیدے ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔

لیکن سقراط کا معنوی علو فکر اس عام سطح سے بہت بلند ہو چکا تھا۔ وہ وقت کے اصنامی عقائد سے کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکا۔ اس کا توحیدی تصور تجسّم اور تشبّہ کی تمام آلودگیوں سے پاک ہو کر ابھرا۔ اس کی بے لوث خدا پرستی کا تصور اس درجہ بلند تھا کہ وقت کے عام مذہبی تصورات اسے سر اونچا کر کے بھی دیکھ نہیں سکتے تھے۔ اس کی حقیقت شناس نگاہ میں یونان کی اصنامی خدا پرستی اس سے زیادہ کوئی اخلاقی بنیاد نہیں رکھتی تھی کہ ایک طرح کا دکاندارانہ لین دین تھا جو اپنے خود ساختہ معبودوں کے ساتھ چکایا جاتا تھا۔ افلاطون، یوثی فرادہ (EUTHYPHRO) کے مکالمہ میں ہمیں صاف صاف بتلاتا ہے کہ یونان کے دینی تصورات و اعمال کی نسبت سقراط کے بے لاگ فیصلے کیا تھے؟ سقراط پر مذہبی بے احترامی کا الزام لگایا گیا تھا۔ وہ پوچھتا ہے کہ مذہبی احترام کی حقیقت کیا ہے؟ پھر جو جواب ملتا ہے، وہ اسے اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ "مذہبی احترام گویا مانگنے اور دینے کا ایک فن ہوا۔ دیوتاؤں سے وہ چیز مانگنی جس کی ہمیں خواہش ہے اور انھیں وہ چیز دینی جس کی انھیں احتیاج ہے۔ مختصراً یہ کہ تجارتی کاروبار کا ایک خاص ڈھنگ"۔

ایسی بے پردہ تعلیم وقت کے دار و گیر سے بچ نہیں سکتی تھی۔ اور نہ بچی۔ لیکن سقراط کی اولوالعزم روح وقت کی کوتاہ اندیشیوں سے مغلوب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے ایک ایسے صبر و استقامتِ حق کے ساتھ جو صرف نبیوں اور شہیدوں ہی کے اندر گھر بنا سکتا ہے، زہر کا جام اٹھایا اور بغیر کسی تلخ کامی کے پی لیا۔

تمنت سلیمیٰ ان نموت بحبّہا　　　واھون شیئٔ عندنا ما تمنت

نے سوال کیا کہ شاعروں کو خدا کا ذکر کرتے ہوئے کیا پیرایۂ بیان اختیار کرنا چاہیئے ؟

سقراط: ہر حال میں خدا کی توصیف ایسی کرنی چاہیئے جیسا کہ وہ اپنی ذات میں ہو۔ خواہ رزمی (EPIC) شعر ہو خواہ غنائی (LYRIC) علاوہ بریں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خدا کی ذات صالح ہو۔ پس ضروری ہو کہ اس کی صفات بھی اصلاح پر مبنی ہوں۔

اڈمنٹس: درست ہو۔

سقراط: اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو وجود صالح ہوگا، اس سے کوئی بات مضر صادر نہیں ہو سکتی اور جو ہستی غیر مضر ہوگی، وہ کبھی شر کی صانع نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح یہ بات بھی ظاہر ہے کہ جو ذات صالح ہوگی، ضروری ہو کہ نافع بھی ہو۔ پس معلوم ہوا کہ خدا صرف خیر کی علّت ہو۔ شر کی علّت نہیں ہو سکتا۔

اڈمنٹس: درست ہے۔

سقراط: اور یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ خدا کا تمام حوادث کی علّت ہونا ممکن نہیں۔ جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہو۔ بلکہ وہ انسانی حالات کے بہت ہی تھوڑے عرصہ کی علّت ہو۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں، ہماری برائیاں بھلائیوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ اور برائیوں کی علّت خدا کی نافع اور صالح ذات نہیں ہو سکتی۔ پس چاہیئے کہ صرف اچھائی ہی کو اس کی طرف نسبت دیں اور برائی کی علّت کسی دوسری جگہ ڈھونڈھیں۔

اڈمنٹس: میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ بات بالکل واضح ہو۔

سقراط: تو اب ضروری ہو کہ ہم شاعروں کے ایسے خیالات سے متفق نہ ہوں جیسے ہومر کے حسب ذیل شعروں میں ظاہر کیے گیے ہیں: مشتری[1] کی ڈیوڑھی میں دو پیالے

---

[1] مشتری یعنی "زیوس" (ZEUS) یونان کے اصنامی عقائد میں رب الارباب یعنی دیوتاؤں میں سب سے بڑا اور حکمران دیوتا تھا۔ ہومر نے ایلیڈ میں دیوتاؤں کی جو مجلس آراستہ کی ہو اس میں تخت نشین ہستی مشتری ہی کی ہو۔

نمودار ہوا تھا۔ وہاں نفس کے بعد نفس کلی نمودار ہوا:

سقراط نے خدا کی ہستی کے لیے "اگا تھوس" (ARAQOS) یعنی الخیر کا تصوّر قائم کیا تھا، وہ سرتاسر اچھائی اور حُسن ہے۔ افلاطون وجود کی دنیاؤں سے بھی اوپر اُڑا اور اس نے خیر محبت کا سراغ لگانا چاہا لیکن سقراط کے صفاتی تصوّر پر کوئی اضافہ نہ کر سکا۔

ارسطو (ARISTOTLE) جس نے فلسفے کو روحانی تصوّر سے خالص کر کے صرف مشاہدہ و احساسات کے دائرہ میں دیکھنا چاہا تھا۔ اس سقراطی تصوّر کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے عقل اول اور عقل فعّال کا تصوّر قائم کیا جو ایک بادی، غیر متجزّی اور بسیط بحت ہستی ہے۔ پس گویا سقراط اور افلاطون نے جس ذات کی صفت "الخیر" میں دیکھی تھی، ارسطو نے اسے "العقل" میں دیکھا اور اس منزل پر پہنچ کر رُک گیا۔ اس سے زیادہ جو کچھ مشّائی فلسفہ (PERIPATETIC) میں ہمیں ملتا ہے، وہ خود ارسطو کی تصریحات نہیں ہیں، اس کے یونانی اور عرب شارحوں کے اضافے ہیں۔

اس تمام تفصیل سے معلوم ہوا کہ "الخیر" اور "العقل" یونانی فلسفے کے تصور الوہیّت کا ماحصل ہے۔

سقراط کے صفاتی تصوّر کو وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ افلاطون کی جمہوریت (REPUBLIC) کا حسب ذیل مکالمہ پیش نظر رکھا جائے۔ اس مکالمہ میں اس نے تعلیم کے مسئلہ پر بحث کی ہے اور واضح کیا ہے کہ اس کے بنیادی اصول کیا ہونے چاہئیں: "اڈمنٹس"[1]

---

[1] جمہوریت کے اشخاص مکالمہ میں "اڈمنٹس" اور "گلوکن" افلاطون کے بھائی ہیں چنانچہ افلاطون نے خود ایک جگہ اس کی تصریح کی ہے۔

افلاطون کی دوسری مصنّفات کے ساتھ جمہوریت کا ترجمہ بھی عربی میں ہو گیا تھا۔ چنانچہ چھٹی صدی ہجری میں ابن رشد نے اس کی شرح لکھی۔ شرح کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ میں نے ارسطو کی کتاب السیاسہ کی شرح لکھنی چاہی تھی مگر اندلس میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ملا۔ مجبوراً افلاطون کی کتاب اختیار کرنی پڑی۔ ابن رشد کی شرح کے عبرانی اور لاطینی تراجم یورپ میں موجود ہیں مگر اصل عربی ناپید ہے۔ یورپ کے موجودہ تراجم براہ راست یونانی سے ہوئے ہیں۔ ہمارے پیش نظر اے۔ ٹیلر اور بی جوویٹ (JUWELT) کے انگریزی ترجمے ہیں۔

ہو جائے۔

خدا کی ہستی کے بارے میں فلاطینس بھی اسی نتیجہ پر پہنچا جس پر اوپانی شد کے مصنف اس سے بہت پہلے پہنچ چکے تھے۔ یعنی نفی صفات کا مسلک اس نے بھی اختیار کیا۔ ذات مطلق ہمارے تصوّر و ادراک کی تمام تعبیرات سے ماوراء ہے۔ اس لیے ہم اس بارے میں کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔" ذات مطلق ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی نہیں جو اس سے ظہور میں آئیں۔ ہم اس کی نسبت کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔ ہم نہ تو اسے موجودیت سے تعبیر کر سکتے ہیں، نہ جوہر سے۔ نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ زندگی ہے۔ حقیقت ان تعبیروں سے وراء الوراء ہے۔[1]

سقراط اور افلاطون نے حقیقت کو "الخیر" سے تعبیر کیا تھا۔ اس لیے فلاطینس وہاں تک بڑھنے سے انکار نہ کر سکا۔ لیکن اس سے آگے کی تمام راہیں بند کر دیں "جب تم نے کہا 'الخیر' تو بس یہ کہہ کر رک جاؤ اور اس پر اور کچھ نہ بڑھاؤ۔ اگر تم کسی دوسرے خیال کا اضافہ کرو گے تو ہر اضافے کے ساتھ ایک نئے نقص کی اس سے تقریب کرتے جاؤ گے۔"[2] ارسطو نے حقیقت کا سراغ عقول مجرّدہ کی راہ سے لگایا تھا۔ اور علّۃ العلل کو عقلِ اوّل سے تعبیر کیا تھا۔ مگر فلاطینس کا مطلق اس تعبیر کی گرانی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ "یہ بھی مت کہو کہ وہ عقل ہے۔ تم اس طرح اسے منقسم کرنے لگو گے۔"[3]

لیکن اگر ہم "عقل" کا اطلاق اس پر نہیں کر سکتے تو پھر "الوجود" اور "الخیر" کیونکر کہہ سکتے ہیں؟ اگر ہم اپنے متصوّرہ صفتوں میں سے کوئی صفت بھی اس کے لیے نہیں بول سکتے، تو پھر وجودیت اور خیریت کی صفات بھی کیوں ممنوع نہ ہوں؟ اس اعتراض کا وہ خود جواب دیتا ہے:—

---

[1] ET. MERENNA جلد ۲ صفحہ ۱۳۴ [2] ایضاً [3] ایضاً

رکھے ہیں۔ ایک خیر کا ہی، ایک شر کا، اور وہی انسان کی بھلائی اور بُرائی کی تمام تر علّت ہیں جس انسان کے حصّے میں خیر کے پیالے کی شراب آگئی، اس کے لیے تمام تر خیر ہی۔ جس کے حصّے میں شر کی آئی، اس کے لیے تمام تر شر ہی اور پھر جس کسی کو دونوں پیالوں کا مِلا جُلا گھونٹ مِل گیا۔ اس کے حصّے میں اچھائی بھی آگئی اور بُرائی بھی۔"[1]

پھر اس کے بعد تجسّم کے عقیدے پر بحث کی ہی اور اس سے انکار کیا ہی کہ خدا ایک بازیگر اور بہروپیئے کی طرح کبھی ایک بھیس میں نمودار ہوتا ہی کبھی دوسرے بھیس میں۔"[2]

اسکندریہ کا مذہب افلاطون جدید

تیسری صدی مسیح میں اسکندریہ کے فلسفۂ تصوّف نے "مذہب افلاطون جدید" (NEO-PLATONIC) کے نام سے ظہور کیا جس کا بانی امونیس سکاس (AMMONIUS SACCAS) تھا۔ امونیس کا جانشین فلاطینس (PLATINUS) اور فلاطینس (PLATINUS) ہوا اور فلاطینس کا شاگرد فور فوریوس (PORPHYRY) تھا جو اسکندر افرودسی کے بعد ارسطو کا سب سے بڑا شارح تسلیم کیا گیا ہی اور جس نے افلاطونیہ جدیدہ کی مبادیات مشائی فلسفے میں مخلوط کر دیں۔ فلاطینس اور فور فوریوس کی تعلیم سر تا سر اسی اصل پر مبنی تھی جو ہندوستان میں اوپانیشد کے مذہب نے اختیار کی ہی۔ یعنی علم حق کا اصلی ذریعہ کشف ہی نہ کہ استدلال، اور معرفت کا کمال مرتبہ یہ ہی کہ جذب و فنا کا مقام حاصل

---

[1] یہ اشعار ایلیڈ کے ہیں۔ سلیمان بستانی نے اپنے بے نظیر ترجمۂ عربی میں ان کا ترجمہ حسب ذیل شعروں میں کیا ہی:

قبل عتاب زفس قارورتان — ذی لخیر وذی لشر الهوان

فیهما کل قسمة الانسان

فالذی منهما مزیجا انالا — زفس یلقی خیرا ویلقی وبالا

والذی لاینال الا من الشر — فتنتابه الخطوب انتیابا

یطواه یطوی البلاد کلیلا — تائها فی عرض الفلاة ذلیلا

من بنی الخلد والوری مخذولا — (الیاذہ نشید ۲۴ صفحہ ۱۲۳)

[*] ان اشعار میں "زفس" یونانی "زیوس" کی تعریب ہی۔

[2] دی ری پبلک ترجمہ جیلر باب ۲۔

خدا کو الموجود کہنے سے بھی انکار کرتا ہے اور کہتا ہے "ہم جونہی "موجود" کا وصف بولتے ہیں، ہمارے تصوّر پر مخلوق کے اوصاف و خواص کی پرچھائیں پڑنے لگتی ہیں اور خدا ان اوصاف سے منزّہ ہے۔ اس نے اس سے بھی انکار کیا کہ خدا کو وحدہٗ لاشریک کہا جائے۔ کیونکہ "وحدت" اور "عدم شرکت" کے تصوّرات بھی اضافی نسبتوں سے خالی نہیں"۔ ابن میمون کا یہ مسلک درا صل فلسفہ اسکندریہ ہی کی بازگشت تھی۔

قرآنی تصوّر

بہر حال چھٹی صدی مسیحی میں دنیا کی خدا پرستانہ زندگی کے تصوّرات اس حد تک پہنچے تھے کہ قرآن کا نزول ہوا۔

اب غور کرو کہ قرآن کے تصوّرِ الٰہی کا کیا حال ہے؟ جب ہم ان تمام تصوّرات کے مطالعہ کے بعد قرآن کے تصوّر پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف نظر آجاتا ہے کہ تصوّرِ الٰہی کی تمام تصویروں میں اس کی تصویر جامع اور بلند تر ہے۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل امور قابلِ غور ہیں:۔

(۱) تنزیہہ کی تکمیل

اوّلاً: تجسّم اور تنزیہہ کے لحاظ سے قرآن کا تصوّرِ تنزیہہ کی ایسی تکمیل ہے جس کی کوئی نمود اس وقت دنیا میں موجود نہیں تھی۔ قرآن سے پہلے تنزیہہ کا بڑے سے بڑا مرتبہ جس کا ذہنِ انسانی متحمل ہو سکا تھا، یہ تھا کہ اصنام پرستی کی جگہ ایک اَن دیکھے خدا کی پرستش کی جائے۔ لیکن جہاں تک صفاتِ الٰہی کا تعلق ہے، انسانی اوصاف و جذبات کی مشابہت اور جسم و ہیئت کے تمثّل سے کوئی تصوّر بھی خالی نہ تھا۔ ہندوستان اور یونان کا حال ہم دیکھ چکے ہیں یہودی تصوّر جس نے اصنام پرستی کی کوئی شکل بھی جائز نہیں رکھی تھی، وہ بھی اس طرح کے تشبّہ و تمثّل سے یکسر آلودہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کا خدا کو ممرے کے بلوطوں میں دیکھنا، خدا کا حضرت یعقوبؑ سے کشتی لڑنا، کوہ طور پر شعلوں کے اندر نمودار ہونا، حضرت موسیٰؑ کا خدا کو پیچھے سے دیکھنا، خدا کا جوشِ غضب میں آکر کوئی کام کر بیٹھنا اور پھر پچھتانا، بنی اسرائیل کو اپنی

ہم نے اگر اسے "الخیر" کہا، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم کوئی باقاعدہ تصدیق کسی خاص وصف کی کرنی چاہتے ہیں جو اس کے اندر موجود ہے۔ ہم اس تعبیر کے ذریعہ صرف یہ بات واضح کرنی چاہتے ہیں کہ وہ ایک مقصد اور منتہیٰ ہے جس پر تمام سلسلے جا کر ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ گویا ایک اصطلاح ہوئی جو ایک خاص غرض کے لیے کام میں لائی گئی ہے۔ اسی طرح اگر ہم اس کی نسبت وجود کا حکم لگاتے ہیں تو صرف اس لیے کہ عدم کے دائرے سے اسے باہر رکھیں۔ وہ تو ہر چیز سے ماورا رہی۔ حتیٰ کہ وجود کے اوصاف و خواص سے بھی۔"

اسکندریہ کے کلیمنٹ (CLEMENT) نے اس مسلک کا خلاصہ چند لفظوں میں کہہ دیا "اس کی شناخت اس سے نہیں کی جا سکتی کہ وہ کیا ہے؟ صرف اس سے کی جا سکتی ہے کہ وہ کیا کچھ نہیں ہے" یعنی یہاں صرف سلب و نفی کی راہ ملتی ہے ایجاب و اثبات کی راہیں بند ہیں۔

سِرٌ لسان النطق عنہ اخرس!

باب صفات میں یہ وہی بات ہوئی جو اوپانی شد کی "نیتی نیتی" میں ہم سن چکے ہیں، اور جس پر شنکر نے اپنے مذہب کی مبادیات کی عمارتیں استوار کی ہیں۔

ازمنۂ وسطیٰ کے یہودی فلاسفہ نے بھی یہی مسلک اختیار کیا تھا۔ موسیٰ بن میمون (المتوفی ۶۰۵ھ)

ل٥ ET. MERENNA جلد ۲، صفحہ ۱۸ ۔ مذہب افلاطون جدید۔ افلاطون کی طرف اس لیے منسوب ہوا کہ اس کی بنیاد بعض افلاطونی مبادیات پر رکھی گئی تھی۔ مگر پھر اپنی بحث و نظر میں اس نے جو راہ اختیار کی اور جن نتائج تک پہنچا، انھیں افلاطون سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن عرب فلاسفہ کا ایک بڑا طبقہ اس غلط فہمی میں پڑ گیا کہ فی الحقیقت یہ افلاطون ہی کا مذہب ہے۔ اس مذہب کے بعض فلسفیوں مثلاً فورفوریوس نے ارسطو کی شرح کرتے ہوئے اس کے مذہب میں جو اضافے کیے تھے، اسے بھی عرب حکما اصل سے ممتاز نہ کر سکے۔ چنانچہ ابو نصر فارابی نے الجمع بین الرائیین میں ارسطو کا جو مذہب ظاہر کیا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ ابن رشد پہلا عرب فلسفی ہے جس نے یہ غلط فہمی محسوس کی اور ارسطو کے مذہب کو شارحوں کے اضافے سے خالص کر کے دیکھنا چاہا۔

۵۲۹ء میں جب شہنشاہ جسٹینین کے حکم سے اسکندریہ کے فلاسفہ جلا وطن کیے گئے تو ان میں سے بعض نے ایران میں پناہ لی چنانچہ سیمپلیس اور ڈیماسیس خسرو کے دربار میں معزز جگہ رکھتے تھے۔ ان فلاسفہ کی وجہ سے پہلوی زبان بھی مذہب افلاطون جدید سے آشنا ہوئی اور ایرانی حکما نے اسے قومی رنگ دینے کے لیے زردشت اور جاماسپ کی طرف منسوب کر دیا۔ عربی میں جب پہلوی ادبیات منتقل ہوئیں، تو یہ فلسفیانہ مقالات بھی ترجمہ ہوئے اور عام طور پر یہ خیال پیدا ہو گیا کہ یہ زردشت اور جاماسپ کا ایک پر اسرار فلسفہ ہے چنانچہ شیخ شہاب الدین نے حکمۃ الاشراق میں اور شیرازی نے اس کی شرح میں دونوں غلطیاں جمع کر دی ہیں۔ وہ مذہب افلاطون

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (۱۱۲ : ۱ - ۴)	اللہ کی ذات یگانہ ہے، بے نیاز ہے، اسے کسی کی احتیاج نہیں نہ تو اس سے کوئی پیدا ہوا نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ کوئی ہستی اس کے درجہ اور برابری کی ہوئی۔

تورات اور قرآن کے جو مقامات مشترک ہیں، دقّت نظر کے ساتھ ان کا مطالعہ کرو تورات میں جہاں کہیں خدا کی براہِ راست نمود کا ذکر کیا گیا ہے، قرآن وہاں خدا کی تجلّی کا ذکر کرتا ہے۔ تورات میں جہاں یہ پاؤ گے کہ خدا متشکل ہو کر اُترا، قرآن اس موقع کی یوں تعبیر کرے گا کہ خدا کا فرشتہ متشکل ہو کر نمودار ہوا۔ بطور مثال کے صرف ایک مقام پر نظر ڈال لی جائے۔ تورات میں ہے:

"خداوند نے کہا۔ اے موسیٰ دیکھ، یہ جگہ میرے پاس ہے، تو اس چٹان پر کھڑا رہ، اور یوں ہو گا کہ جب میرے جلال کا گذر ہو گا تو میں تجھے اس چٹان کی دراڑ میں رکھوں گا اور جب تک نہ گزر لوں گا تجھے اپنی ہتھیلی سے ڈھانپے رہوں گا۔ پھر ایسا ہو گا کہ میں ہتھیلی اٹھا لوں گا اور تو میرا پیچھا دیکھ لے گا، لیکن تو میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔ (خروج ۳۳ : ۲۰)

"تب خداوند بدلی کے ستون میں ہو کر اُترا اور خیمہ کے دروازے پر کھڑا رہا ..... اس نے کہا کہ میرا بندہ موسیٰ اپنے خداوند کی شبیہ دیکھے گا"۔ (گنتی ۱۲ : ۵)

اسی معاملہ کی تعبیر قرآن نے یوں کی ہے:

قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ (۷ : ۱۳۹)	موسیٰ نے کہا، اے پروردگار! مجھے اپنا جلوہ دکھا تاکہ میں تیری طرف نگاہ کر سکوں۔ فرمایا نہیں، تو کبھی مجھے نہیں دیکھے گا، لیکن ہاں اس پہاڑی کی طرف

چہیتی بیوی بنا لینا اور پھر اس کی بدچلنی پر ماتم کرنا، ہیکل کی تباہی پر اس کا نوحہ، اس کی انتڑیوں میں درد کا اٹھنا اور کلیجے میں سوراخ پڑ جانا، تورات کا عام اسلوب بیان ہے۔

اصل یہ ہے کہ قرآن سے پہلے فکرِ انسانی اس درجہ بلند نہیں ہوا تھا کہ تمثیل کا پردہ ہٹا کر صفاتِ الٰہی کا جلوہ دیکھ لیتا۔ اس لیے ہر تصوّر کی بنیاد تمام تر تمثیل و تشبیہ ہی پر رکھنی پڑی۔ مثلاً تورات میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف زبور کے ترانوں اور یسعیاہ کی کتاب میں خدا کے لیے شائستہ صفات کا تخیّل موجود ہے۔ لیکن دوسری طرف خدا کا کوئی مخاطبہ ایسا نہیں ہوتا جو سرتاسر انسانی اوصاف و جذبات کی تشبیہ سے ملوّن نہ ہو۔ حضرت مسیحؑ نے جب چاہا کہ رحمتِ الٰہی کا عالمگیر تصوّر پیدا کریں، تو وہ بھی مجبور ہوئے کہ خدا کے لیے باپ کی تشبیہ سے کام لیں۔ اسی تشبیہ سے ظاہر پرستوں نے ٹھوکر کھائی اور ابنیتِ مسیحؑ کا عقیدہ پیدا کر لیا۔

لیکن ان تمام تصوّرات کے بعد جب ہم قرآن کی طرف رُخ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اچانک فکر و تصوّر کی ایک نئی دنیا سامنے آ گئی۔ یہاں تمثیل و تشبیہ کے تمام پردے یک دفعہ اٹھ جاتے ہیں۔ انسانی اوصاف و جذبات کی مشابہت مفقود ہو جاتی ہے۔ ہر گوشہ میں مجاز کی جگہ حقیقت کا جلوہ نمایاں ہو جاتا ہے اور تجسّم کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا۔ تنزیہہ اس مرتبہ کمال تک پہنچ جاتی ہے کہ

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (۴۲ : ۱۱)	اس کے مثل کوئی شے نہیں کسی چیز سے بھی تم اسے مشابہ نہیں ٹھہرا سکتے۔
لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (۶ : ۱۰۳)	انسان کی نگاہیں اسے نہیں پا سکتیں لیکن وہ انسان کی نگاہوں کو دیکھ رہا ہے۔

یعنی اگر کہا جائے کہ ہم خدا کے لیے کوئی ایجابی صفت قرار نہیں دے سکتے کیونکہ جو صفت بھی قرار دیں گے، اس میں مخلوق کے اوصاف سے مشابہت کی جھلک آ جائے گی، تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں فکر انسانی کے لیے کوئی سر رشتۂ تصوّر باقی نہیں رہے گا۔ اور وہ کسی ایسی ذات کا تصوّر ہی نہیں کر سکے گا۔ اور جب تصوّر نہیں کر سکے گا تو ایسا عقیدہ اس کے اندر کوئی پکڑ اور لگاؤ بھی پیدا نہیں کر سکے گا۔ ایسا تصوّر اگرچہ اثباتِ وجود کی کوشش کرے لیکن فی الحقیقت وہ نفیِ وجود کا تصوّر ہوگا۔ کیونکہ صرف سلبی تصوّر کے ذریعہ ہم ہستی کو نیستی سے جدا نہیں کر سکتے۔

خدا کی ہستی کا اعتقاد انسانی فطرت کے اندرونی تقاضوں کا جواب ہے۔ اسے حیوانی سطح سے بلند ہونے اور انسانیتِ اعلیٰ کے درجے تک پہنچنے کے لیے بلندی کے ایک نصب العین کی ضرورت ہے، اور اس نصب العین کی طلب بغیر کسی ایسے تصوّر کے پوری نہیں ہو سکتی جو کسی نہ کسی شکل میں اس کے سامنے آئے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ مطلق کا تصوّر سامنے آ نہیں سکتا۔ وہ جبھی آئے گا کہ ایجابی صفتوں کے تشخّص کا کوئی نہ کوئی نقاب چہرے پر ڈال لے۔ چنانچہ ہمیشہ اس نقاب ہی کے ذریعے جمالِ حقیقت کو دیکھنا پڑا۔ یہ کبھی بھاری ہوا کبھی ہلکا۔ کبھی پُرخوف رہا کبھی دلآویز، مگر اُترا کبھی نہیں۔

آہ از اں حوصلۂ تنگ و ازاں حسن بلند   کہ دلم را گلہ از حسرتِ دیدارِ تو نیست

جمالِ حقیقت بے نقاب ہے، مگر ہماری نگاہوں میں یارائے دید نہیں۔ ہم اپنی نگاہوں پر نقاب ڈال کر اسے دیکھنا چاہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کے چہرے پر نقاب پڑ گیا:

ہر چہ ہست از قامتِ ناساز و بے اندامِ ماست   ورنہ تشریفِ تو بر بالائے کس دشوار نیست

غیر صفاتی تصوّر کو انسان پکڑ نہیں سکتا۔ اور طلب اسے ایسے مطلوب کی ہوئی جو اس کی پکڑ میں آ سکے۔ وہ ایک ایسا جلوۂ محبوبی چاہتا ہے جس کے عشق میں اس کا دل اٹک سکے۔ جس کے حسن

تنزیہ اور تعطیل کا فرق البتہ یاد رہے کہ تنزیہ اور تعطیل میں فرق ہے۔ تنزیہ سے مقصود یہ ہے کہ جہاں تک عقل بشری کی پہنچ ہے صفاتِ الٰہی کو مخلوقات کی مشابہت سے پاک اور بلند رکھا جائے۔ تعطیل کے معنی یہ ہیں کہ تنزیہ کے منع و نفی کو اس حد تک پہنچا دیا جائے کہ فکرِ انسانی کے تصوّر کے لیے کوئی بات باقی ہی نہ رہے۔ قرآن کا تصوّر تنزیہ کی تکمیل ہے، تعطیل کی ابتدا نہیں ہے۔

بلاشبہ اوپانی شد تنزیہ کی "نیتی نیتی"[1] کو بہت دور تک لے گئے، لیکن عملاً نتیجہ کیا نکلا؟ یہی نہ کہ ذاتِ مطلق (برہمان) کو ذاتِ مشخّص (ایشور) میں اتارے بغیر کام نہ چل سکا۔

مستی نہیں ہے بادہ و ساغر کے بغیر!

جس طرح اثباتِ صفات میں غلو تشبیہ کی طرف لے جاتا ہے، اسی طرح نفی صفات میں غلو تعطیل تک پہنچا دیتا ہے، اور دونوں میں تصوّر انسانی کے لیے ٹھوکر ہوئی۔ اگر تشبیہ اسے حقیقت سے ناآشنا کر دیتا ہے، تو تعطّل اسے عقیدہ کی روح سے محروم کر دیتا ہے۔ پس یہاں ضروری ہوا کہ افراط اور تفریط دونوں سے قدم روکے جائیں اور تشبیہ اور تعطیل، دونوں کے درمیان راہ نکالی جائے۔ چنانچہ قرآن نے جو راہ اختیار کی ہے، وہ دونوں راہوں کے درمیان جاتی ہے اور دونوں انتہائی سمتوں کے میلان سے بچتی ہوئی نکل گئی ہے۔

اگر خدا کے تصوّر کے لیے صفات و افعال کی کوئی صورت ایسی باقی نہ رہے جو فکر انسانی کی پکڑ میں آسکتی ہے، تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ یہی نکلے گا کہ تنزیہ کے معنی نفی وجود کے ہو جائیں گے۔

---

[1] "نیتی" یعنی کلمہ نفی وہ ایسا بھی ہے ایسا بھی نہیں ہے۔ برہدریناک اوپانی شد میں یہ نفی دور تک چلی گئی ہے۔ وہ کثیف ہے؟ "نہیں" وہ لطیف ہے؟ "نہیں" وہ کوتاہ ہے؟ "نہیں" وہ دراز ہے؟ "نہیں" غرضیکہ ہر مشابہت کے جواب میں "نہیں" دہرایا جاتا ہے۔ نہ وہ ایسا ہے، نہ ویسا ہے۔ نہ یہ ہے نہ وہ ہے:

اے برون از وہم و قال و قیلِ من
خاک بر فرقِ من و تمثیلِ من!

ہے کہ اس سے مشابہہ کوئی چیز نہیں جو تمھارے تصوّر میں آسکتی۔ وہ عدیم المثال ہے لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (۴۲: ۱۱) تمھاری نگاہ اسے پا ہی نہیں سکتی: لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ (۶: ۱۰۳) تم اس کے لیے اپنے تخیّل سے مثالیں نہ گھڑو: فَلَا تَضْرِبُوا لِلّٰهِ الْأَمْثَالَ (۱۶: ۷۴)
پس ظاہر ہے کہ اس کا زندہ ہونا، ہمارے زندہ ہونے کی طرح نہیں ہوسکتا۔ اس کی پروردگاری ہماری پروردگاری کی طرح نہیں ہوسکتی۔ اس کا دیکھنا، سُننا اور جاننا ویسا نہیں ہوسکتا جس طرح کے دیکھنے، سننے اور جاننے کا ہم تصوّر کرسکتے ہیں۔ اس کی قدرت و بخشش کا ہاتھ اور جلال و احاطہ کا عرش ضرور ہے لیکن یقیناً اس کا مطلب وہ نہیں ہوسکتا جو ان الفاظ کے مدلولات سے ہمارے ذہن میں متشکل ہونے لگتا ہے

قرآن کے تصوّرِ الٰہی کا یہ پہلو فی الحقیقت اس راہ کی تمام درماندگیوں کا ایک ہی حل ہے، اور ساری عمر کی سرگردانیوں کے بعد بالآخر اسی منزل پر پہنچ کر دم لینا پڑتا ہے۔ انسانی فکر جتنی بھی کاوشیں کرے گا، اس کے سوا اور کوئی حل پیدا نہیں کرسکے گا۔ یہاں ایک طرف بامِ حقیقت کی بلندی اور فکر کوتاہ کی نارسائیاں ہوئیں، دوسری طرف ہماری فطرت کا اضطرابِ طلب اور ہمارے دل کا تقاضائے دید ہوا۔ بام اتنا بلند کہ نگاہِ تصوّر تھک تھک کے رہ جاتی ہے۔ تقاضائے دید اتنا سخت کہ بغیر کسی کا جلوہ سامنے لائے چین نہیں پا سکتا۔

نہ باندازۂ بازوست کمندم ہیہات وہ نہ باگوشۂ بامیم سروکارے ہست

ایک طرف راہ کی اتنی دشواریاں، دوسری طرف طلب کی اتنی سہل اندیشیاں ولنعم ماقیل:

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں!

اگر تنزیہہ کی طرف زیادہ جھکتے ہیں تو تعطیل میں جا گرتے ہیں۔ اگر اثباتِ صفات کی صورت آرائیوں میں دور نکل جاتے ہیں تو تشبیہ اور تجسّم میں کھوئے جاتے ہیں۔ پس نجات کی راہ

گریزاں کے پیچھے وہ والہانہ دوڑ سکے جس کا دامن کبریائی پکڑنے کے لیے ہمیشہ اپنا دستِ عجز و نیاز بڑھاتا رہے۔ جو اگرچہ زیادہ سے زیادہ بلندی پر ہو لیکن پھر بھی اسے ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہو کہ اِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَادِ (۸۹ : ۱۲) اور اذا سَئَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اجیب دعوة الداع اذا دَعانِ (۲: ۱۸۳)

در پردہ و بر ہمہ کس پردہ می دری   با ہر کسی و با تو کسے را وصال نیست

غیر صفاتی تصوّر محض نفی و سلب ہوتا ہے اور اس سے انسانی طلب کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔ ایسا تصوّر ایک فلسفیانہ تخیّل ضرور پیدا کر دے گا لیکن دلوں کا زندہ اور سرگرم عقیدہ نہیں بن سکے گا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جو راہ اختیار کی، وہ ایک طرف تو تنزیہہ کو اس کے کمال درجہ پر پہنچا دیتی ہے، دوسری طرف تعطیل سے بھی تصوّر کو بچا لے جاتی ہے۔ وہ فرداً فرداً تمام صفات و افعال کا اثبات کرتا ہے، مگر ساتھ ہی مشابہت کی قطعی نفی بھی کرتا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے، خدا حسن و خوبی کی ان تمام صفتوں سے جو انسانی فکر میں آسکتی ہیں، متصف ہے۔ وہ زندہ ہے، قدرت والا ہے، پالنے والا ہے، رحمت والا ہے، دیکھنے والا، سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے، اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ انسان کی بول چال میں قدرت و اختیار اور ارادہ و فعل کی جتنی شائستہ تعبیرات ہیں انھیں بھی بلا تامّل استعمال کرتا ہے۔ مثلاً خدا کے ہاتھ تنگ نہیں: بَلْ یَدٰہُ مَبْسُوْطَتَانِ (۵ : ۶۴) اس کے تختِ حکومت و کبریائی کے احاطہ سے کوئی گوشہ باہر نہیں: وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (۲ : ۲۲۵) لیکن یہ بھی صاف صاف اور بے لچک لفظوں میں کہہ دیتا

---

[1] یقیناً تمھارا پروردگار تمھیں گھات لگائے تاک رہا ہے!
[2] اور جب میرا بندہ مجھ سے میری نسبت سوال کرتا ہے تو اس سے کہہ دے، میں اس سے دور کب ہوں؟ میں تو اس کے بالکل پاس ہوں۔

علیلاً ولا تروی غلیلاً ورأیت	ان میں کسی بیمار کے لیے شفا ہی نہ کسی پیاسے
اقرب الطرق طریق القرآن اقرأ	کے لیے سیرابی۔ سب سے بہتر اور حقیقت سے نزدیک تر
فی الاثبات "الرحمن علی العرش	راہ وہی ہے جو قرآن کی راہ ہے۔ اثبات صفات
استوی" وفی النفی "لیس کمثله	میں پڑھو "الرحمن علی العرش استوی"
شیئ" ومن جرب مثل تجربتی	اور نفی تشبیہ میں پڑھو "لیس کمثله شیئ"
عرف مثل معرفتی (نقله ملا علی القاری	یعنی اثبات اور نفی دونوں کا تھامے رہو اور
فی شرح الفقه الاکبر)	جس کسی کو میری طرح اس معاملے کے تجربہ کا موقع
	ملا ہوگا اسے میری طرح یہ حقیقت معلوم ہو گئی ہوگی"

یہی وجہ ہے کہ اصحاب حدیث اور سلفیہ نے اس باب میں تفویض[1] کا مسلک اختیار کیا تھا اور تاویل صفات میں کاوشیں کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور اسی بنا پر انھوں نے جہمیہ کے انکارِ صفات کو تعطیل سے تعبیر کیا۔ اور معتزلہ و اشاعرہ کی تاویلوں میں بھی تعطّل کی بو سونگھنے لگے۔ متکلمین نے ان پر تجسیم اور تشبیہ کا الزام لگایا، لیکن وہ کہتے تھے کہ تمھارے تعطّل سے ہمارا نام نہاد تشبیہ ہی بہتر ہے کیونکہ یہاں عقیدہ کے لیے ایک تصور تو باقی رہ جاتا ہے۔ تمھارے سلب و نفی کی کاوشوں کے بعد تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ متاخرین اصحاب حدیث میں امام تیمیہ اور ان کے شاگرد امام ابن قیم نے اس مسئلہ کی گہرائیوں کو خوب سمجھا اور اسی لیے سلف کے مسلک سے ادھر ادھر ہونا گوارا نہیں کیا۔

آریائی اور سامی نقطۂ خیال کا اختلاف

آریائی اور سامی تعلیموں کے نقطۂ خیال

---

[1] تفویض کے مسلک سے مقصود یہ ہے کہ جو حقائق ہمارے دائرۂ علم و ادراک سے باہر ہیں، ان میں رد و کد اور باریک بینی نہ کرنا اور اپنے عجز و نارسائی کا اعتراف کر لینا ۱۲

صرف یہی ہوئی کہ دونوں کے درمیان قدم سنبھالے رکھیں۔ اثبات کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے، تنزیہہ کی باگ بھی ڈھیلی نہ پڑنے پائے۔ اثبات اس کی دلآویز صفتوں کا برقع کھینچیگا۔ تنزیہہ تشبیہ کی پرچھائیں بچاتی رہے گی۔ ایک کا ہاتھ حسنِ مطلق کو صورتِ صفات میں جلوہ آرا کر دیگا دوسرے کا ہاتھ اسے اتنی بلندی پر تھامے رہے گا کہ تشبیہ کا گرد و غبار اسے چھونے کی جرأت نہیں کر سکیگا

بر چہرۂ حقیقت اگر ماند پردۂ   جرمِ نگاہ دیدۂ صورت پرستِ ماست

اوپانی شد کے مصنفوں کا نفی صفات میں غلو معلوم ہے لیکن مسلمانوں میں جب علم کلام کے مختلف مذاہب و آرا پیدا ہوئے تو ان کی نظری کاوشیں اس میلان میں ان سے بھی آگے نکل گئیں اور صفات باری کا مسئلہ بحث و نظر کا ایک معرکتہ الآرا مسئلہ بن گیا۔ جہمیہ اور باطنیہ قطعی انکار کی طرف گئے۔ معتزلہ نے انکار نہیں کیا لیکن ان کا رخ رہا اسی طرف۔ امام ابوالحسن اشعری نے گو خود معتدل راہ اختیار کی تھی (جیسا کہ کتاب الابانہ سے ظاہر ہے) لیکن ان کے پیروؤں کی کاوشیں تاویل صفات میں دور تک چلی گئیں اور بحث و نزاع سے غلو کا رنگ پیدا ہو گیا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی معاملہ کی گتھی نہ سلجھا سکا۔ اگر گتھی سلجھی تو اسی طریقہ سے سلجھی جو قرآن نے اختیار کیا ہے۔ امام جوینی یہ اقرار کرتے ہوئے دنیا سے گئے کہ " وھا انا ذا اموت علی عقیدۃ امّی (میری ماں نے جو عقیدہ سکھلایا تھا اس پر دنیا سے جا رہا ہوں!)

اشاعرہ میں امام فخرالدین رازی سب سے زیادہ ان کاوشوں میں سرگرم رہے لیکن بالآخر اپنی زندگی کی آخری تصنیف میں انھیں بھی اقرار کرنا پڑا تھا کہ

لقد تاملت الطرق الکلامیہ	یعنی علم کلام اور فلسفہ کے تمام طریقوں کو
والمناھج الفلسفیۃ فما رأیتھا تشفی	خوب دیکھا بھالا لیکن بالآخر معلوم ہوا کہ نہ تو

اور اس کے سب سے بڑے شارح شنکر اچارجیا نے نفی صفات پر جتنا زور دیا ہے، وہ حقیقت کے اس مرتبۂ اطلاق سے تعلق رکھتا ہے جسے وہ "برہمن" سے تعبیر کرتے ہیں یعنی ذات مطلق سے لیکن اس سے انھیں بھی انکار نہیں کہ مرتبۂ اطلاق کے نیچے ایک اور مرتبہ بھی ہے جہاں تمام صفات ایجابی کی نقش آرائیاں ظہور میں آجاتی ہیں۔ اور انسان کے تمام عابدانہ تصوّرات کا معبود وہی ذات متصّف ہوتی ہے۔

اوپانی شد کے نزدیک ذات مطلق "نیرو پا دھیک ست" اور "نرگن" ہے یعنی تمام مظاہرات سے منزّہ اور عدیم التوصیف ہے۔ اگر کوئی ایجابی صفت اس کی نسبت سے کہی بھی جاسکتی ہے۔ تو وہ اسی سلب کا ایجاب ہے یعنی وہ "نرگنہ گنی" ہے۔ عدیم الوصفی صفت سے متصّف ہم اس کی نسبت کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ہم جو کچھ کہیں گے اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ لامحدود کو محدود بنادیں گے۔ اگر محدود لامحدود کا تصوّر کرسکتا ہے تو پھر یا تو محدود کو لامحدود ماننا پڑے گا یا لامحدود کو محدود بن جانا پڑے گا"۔ (شنکر ابھاشیا برہم سوتر۔ باب ۳) "ہم کسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو الفاظ بولتے ہیں، وہ یا تو اس چیز کا تعلق کسی خاص نوع سے ظاہر کرتے ہیں، یا اس کے فعلی خواص بتاتے ہیں، یا اس کی قسم کی خبر دیتے ہیں، یا کسی اور اضافی نوعیت کی وضاحت کرتے ہیں۔ لیکن برہمن کے لیے کوئی نوع نہیں ٹھہرائی جاسکتی۔ اس کی کوئی قسم نہیں اس کے فعلی خواص بتلائے نہیں جاسکتے۔ اس کے لیے کوئی اضافت نہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ ایسا ہے۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس طرح کا نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے لیے کوئی مشابہت نہیں، اور چونکہ مشابہت نہیں، اس لیے اس کی عدم مشابہت اور غیریت بھی انسانی تصوّر میں نہیں لائی جاسکتی۔ مشابہت کی طرح ہماری نفی مشابہت بھی اضافی رشتے رکھتی ہے۔ (ایضاً باب اول وثانی)

کا اختلاف ہم اس معاملہ میں پوری طرح دیکھ لے سکتے ہیں۔ آریائی حکمت نے فطرتِ انسانی کی جس صورت پرستی کے تقاضے کا جواب مورتی پوجا کا دروازہ کھول کر دیا۔ قرآن نے اسے صرف صفات کی صورت آرائی سے پورا کر دیا۔ اور پھر اس سے نیچے اترنے کی تمام راہیں بند کر دیں نتیجہ یہ نکلا کہ ان تمام مفاسد کے کھلنے کے دروازے بند ہو گئے جو بت پرستی کی غیر عقلی زندگی سے پیدا ہو سکتے تھے۔ اور ہندوستان میں پیدا ہوئے۔

محکمات اور متشابہات

قرآن نے اپنے مطالب کی دو بنیادی قسمیں قرار دیں، ایک کو "محکمات" سے تعبیر کیا ہے دوسری کو "متشابہات" سے۔ "محکمات" سے وہ باتیں مقصود ہیں جو صاف صاف انسان کی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ اور اس کی عملی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور اس لیے ایک سے زیادہ معانی کا ان میں احتمال نہیں۔ متشابہات وہ ہیں جن کی حقیقت وہ پا نہیں سکتا اور اس کے سوا چارہ نہیں کہ ایک خاص حد تک جا کر رک جائے اور بے نتیجہ باریک بینیاں نہ کرے: هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ج وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَ مَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۳:)

صفاتِ الٰہی کی حقیقت متشابہات میں داخل ہے۔ اس لیے قرآن کہتا ہے کہ اس باب میں فکری کاوشیں کچھ سود مند نہیں ہو سکتیں بلکہ طرح طرح کی کج اندیشیوں کا دروازہ کھول دیتی ہیں۔ یہاں بجز تفویض کے چارہ کار نہیں، پس وہ تمام فلسفیانہ کاوشیں جو ہمارے متکلمین نے کی ہیں، فی الحقیقت قرآن کے معیارِ تعلیم کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔

اوپانشد کا مرتبۂ اطلاق اور مرتبۂ تشخص

اس موقع پر یہ بات بھی صاف ہو جانی چاہیئے کہ ویدانت سوتر

تصوّر میں قہر و غضب کا عنصر غالب تھا۔ مجوسی تصوّر نے نور و ظلمت کی دو مساویانہ قوتیں الگ الگ بنا لی تھیں۔ مسیحی تصوّر نے رحم و محبت پر زور دیا تھا لیکن جزا کی حقیقت مستور ہو گئی تھی۔ اسی طرح پیروانِ بدھ نے بھی صرف رحم و محبت پر زور دیا۔ عدالت نمایاں نہیں ہوئی گویا جہاں تک رحمت و جمال کا تعلق ہے یا تو قہر و غضب کا عنصر غالب تھا، یا مساوی تھا، یا پھر رحمت و محبت آئی تھی تو اس طرح آئی تھی کہ عدالت کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی۔

لیکن قرآن نے ایک طرف تو رحمت و جمال کا ایک ایسا کامل تصوّر پیدا کر دیا کہ قہر و غضب کے لیے کوئی جگہ ہی نہ رہی۔ دوسری طرف جزاءِ عمل کا سر رشتہ بھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ کیونکہ جزا کا اعتقاد قہر و غضب کی بنا پر نہیں بلکہ عدالت کی بنا پر قائم کر دیا۔ چنانچہ صفاتِ الٰہی کے بارے میں اس کا عام اعلان یہ ہے:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ	اے پیغمبر، ان سے کہہ دو، تم خدا کو اللہ کے نام سے
اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۚ	پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو، جس صفت سے بھی پکارو، اس
(۱۷ : ۱۱۰)	کی ساری صفتیں حسن و خوبی کی صفتیں ہیں!

یعنی وہ خدا کی تمام صفتوں کو "اسماءِ حسنیٰ" قرار دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی کوئی صفت نہیں جو حسن و خوبی کی صفت نہ ہو۔ یہ صفتیں کیا کیا ہیں؟ قرآن نے پوری وسعت کے ساتھ انہیں جا بجا بیان کیا ہے۔ ان میں ایسی صفتیں بھی ہیں جو بظاہر قہر و جلال کی صفتیں ہیں، مثلاً جبّار، قہّار لیکن قرآن کہتا ہے وہ بھی "اسماءِ حسنیٰ ہیں" کیونکہ ان میں قدرت و عدالت کا ظہور ہوا ہے اور قدرت و عدالت حسن و خوبی ہے خونخواری و خوفناکی نہیں ہے۔ چنانچہ سورۂ حشر میں صفاتِ رحمت و جمال کے ساتھ قہر و جلال کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور پھر متصلاً ان سب کو "اسماءِ حسنیٰ" قرار دیا ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ	وہ اللہ ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

غرضیکہ حقیقت اپنے مرتبۂ اطلاق میں ناممکن التعریف ہی، اور منطقی ملورائیت سے بھی ماوراہی۔ اسی لیے ویدانت سوتر نے بنیادی طور پر ہستی کے دو دائرے ٹھہرا دیئے۔ ایک کو ممکن التصوّر کہا۔ دوسرے کو ناممکن التصوّر۔ ممکن التصوّر دائرہ پرکرتی، عناصر، ذہن، تعقّل اور خودی کا ہی۔ ناممکن التصوّر دائرہ برہمن (ذات مطلق) کا۔ یہی مذہب اسکندریہ کے افلاطونیۂ جدیدہ کا بھی تھا؛ اور حکمار اسلام اور صوفیا نے بھی یہی مسلک اختیار کیا۔ صوفیا مرتبۂ اطلاق کو مرتبۂ احدیت سے تعبیر کرتے ہیں؛ اور کہتے ہیں "احدیت" ناممکن التصوّر، ناممکن التعبیر اور تمام منطقی ماورائیوں سے بھی وراء الوراہی:

بنامِ آں کہ آں نامے نہ دارد به ہر نامے کہ خوانی سر بر آرد!

لیکن پھر مرتبۂ اطلاق ایک ایسے مرتبہ میں نزول کرتا ہی جس میں تمام ایجابی صفات کی صورت آرائی کا تشخّص نمودار ہو جاتا ہی۔ اوپانی شد نے اسے "ایشور" سے اور صوفیا نے "واحدیت" سے تعبیر کیا ہی۔ ویدانت سوتر کے شارحوں میں شنکر نے سب سے زیادہ اوپانی شد کے نفی صفات کے مسلک کو قائم رکھنا چاہا ہے اور اس باب میں بڑی کاوش کی۔ تاہم اسے بھی "سگن برہمن" یعنی ذاتِ متشخّص و متصف کے مرتبہ کا اعتراف کرنا پڑا، اور گو اس مرتبہ کے عرفان کو وہ "اپرم" یعنی فروتر مرتبہ کا عرفان قرار دیتا ہی مگر ساتھ ہی تسلیم کرتا ہی کہ ایک معبود ہستی کا تصوّر بغیر اس کے ممکن نہیں۔ اور انسانی ذہن و ادراک کے لیے زیادہ سے زیادہ بلند پروازی جو یہاں ہو سکتی ہی، وہ یہی ہی[1]۔

(۲) صفاتِ رحمت وجمال

ثانیاً تنزیہہ کی طرح صفاتِ رحمت وجمال کے لحاظ سے بھی قرآن کے تصوّر پر نظر ڈالی جائے تو اس کی شانِ تکمیل نمایاں ہی۔ نزولِ قرآن کے وقت یہودی

---

[1] شنکر بھاشیا ۱ : ۲ اور چندوگیا اوپانی شد قسم ۸

قرآن کا تصور اس درجہ کامل اور بے لچک ہے کہ اس کی کوئی نظیر پچھلے تصورات میں نہیں مل سکتی

اگر خدا اپنی ذات میں یگانہ ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنی صفات میں بھی یگانہ ہو کیونکہ اس کی یگانگت کی عظمت قائم نہیں رہ سکتی۔ اگر کوئی دوسری ہستی اس کی صفات میں شریک وسہیم مان لی جائے۔ قرآن سے پہلے توحید کے ایجابی پہلو پر تو تمام مذاہب نے زور دیا تھا، لیکن سلبی پہلو نمایاں نہیں ہوسکا تھا۔ ایجابی پہلو یہ ہے کہ خدا ایک ہے۔ سلبی یہ ہے کہ اس کی طرح کوئی نہیں۔ اور جب اس کی طرح کوئی نہیں، تو ضروری ہے کہ جو صفتیں اس کے لیے ٹھہرا دی گئی ہیں، ان میں کوئی دوسری ہستی شریک نہ ہو۔ پہلی بات توحید فی الذات سے اور دوسری توحید فی الصفات سے تعبیر کی گئی ہے۔ قرآن سے پہلے اقوام عالم کی استعداد اس درجہ بلند نہیں ہوئی تھی کہ توحید فی الصفات کی نزاکتوں اور بندشوں کی متحمل ہو سکتی اس لیے مذاہب نے تمام تر زور توحید فی الذات ہی پر دیا۔ توحید فی الصفات اپنی ابتدائی اور سادہ حالت میں چھوڑ دی گئی

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، باوجودیکہ تمام مذاہب قبل از قرآن میں عقیدۂ توحید کی تعلیم موجود تھی لیکن کسی نہ کسی صورت میں شخصیت پرستی، عظمت پرستی اور اصنام پرستی نمودار ہوتی رہی اور رہنمایان مذاہب اس کا دروازہ بند نہ کرسکے۔ ہندوستان میں تو غالباً اول روز ہی سے یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی کہ عوام کی تشفی کے لیے دیوتاؤں اور انسانی عظمت کی پرستاری ناگزیر ہے۔ اور اس لیے توحید کا مقام صرف خواص کے لیے مخصوص ہونا چاہیئے فلاسفۂ یونان کا بھی یہی خیال تھا۔ یقیناً وہ اس بات سے بے خبر نہ تھے کہ کوہ اولمپس کے دیوتاؤں کی کوئی اصلیت نہیں، تاہم سقراط کے علاوہ کسی نے بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ عوام کے اصنامی عقائد میں خلل انداز ہو۔ وہ کہتے تھے اگر دیوتاؤں کی پرستش کا

اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ	وہ الملک ہے، القدّوس ہے، السلام ہے، المؤمن
الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ	ہے، المہیمن ہے۔ العزیز الجبّار ہے، المتکبّر ہے اور
سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ہ هُوَ اللّٰهُ	اس ساجھے سے پاک ہے جو لوگوں نے اس کی معبودیت
الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ	میں بنا رکھے ہیں
الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ	وہ الخالق ہے البارئ ہے، المصوّر ہے، غرضکہ اس کے
وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ہ	لیے حسن و خوبی کی صفتیں ہیں۔ آسمان و زمین میں
(۵۹: ۲۴)	جتنی بھی مخلوقات ہیں سب اس کی پاکی اور عظمت

کی شہادت دے رہی ہیں۔ اور بلاشبہ وہی ہے جو حکمت کے ساتھ غلبہ و توانائی بھی رکھنے والا ہے۔

اسی طرح سورۂ اعراف میں ہے:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪	اور اللہ کے لیے حسن و خوبی کی صفتیں ہیں، سو
وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِىْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ	چاہیئے کہ ان صفتوں سے اسے پکارو اور جن

لوگوں کا شیوہ یہ ہے کہ اس کی صفتوں میں کج اندیشیاں کرتے ہیں، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔

چنانچہ اسی لیے سورۂ فاتحہ میں صرف تین صفتیں نمایاں ہوئیں۔ ربوبیت، رحمت اور عدالت اور قہر و غضب کی کسی صفت کو یہاں جگہ نہ دی گئی۔

(۳) اشراکی تصوّرات کا کلّی انسداد | **ثالثاً: جہاں تک توحید و اشراک کا تعلّق ہے**

لہ اس آیت میں "الحاد فی الاسماء" سے مقصود کیا ہے؟ "الحاد" "لحد" سے ہے۔ "لحد" کے معنی میلان عن الوسط کے ہیں یعنی درمیان سے کسی ایک طرف کو ہٹا ہوا ہونا۔ اسی لیے ایسی قبر کو جس میں نعش کی جگہ ایک طرف کو ہٹی ہوئی ہوتی ہے، لحد کہتے ہیں جب یہ لفظ انسانی افعال کے لیے بولا جاتا ہے تو اس کے معنی راہ حق سے ہٹ جانے کے ہوتے ہیں کیونکہ وسط حق ہے اور حواشی سے منحرف ہونا باطل ہے۔ "الحد فلانٌ" ای مال عن الحق۔ پس یہاں الحاد فی الاسماء، کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کی صفات کے بارے میں جو راہ حق ہے اس سے منحرف ہو جانا۔ امام راغب اصفہانی نے اس کی تشریح حسب ذیل لفظوں میں کی ہے:
"ان یوصف بما لا یصح وصفہ بہ' او ان یتاوّل اوصافہ علیٰ ما لا یلیق بہ (مفردات ۴۶۴) یعنی خدا کے لیے کوئی ایسا وصف قرار دینا جو اس کا وصف نہیں ہونا چاہیئے۔ یا اس کی صفتوں کا ایسا مطلب سمجھنا جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے!

لیکن ابھی اس کے ظہور پر پورے سو برس بھی نہیں گذرے تھے کہ الوہیت مسیح کا عقیدہ نشوو نما پاچکا تھا۔

توحید فی الصفات

لیکن قرآن نے توحید فی الصفات کا ایسا کامل نقشہ کھینچ دیا کہ اس طرح کی لغزشوں کے تمام دروازے بند ہو گئے۔ اس نے صرف توحید ہی پر زور نہیں دیا، بلکہ شرک کی راہیں بھی بند کر دیں اور یہی اس باب میں اس کی خصوصیت ہے۔

وہ کہتا ہے، ہر طرح کی عبادت اور نیاز کی مستحق صرف خدا ہی کی ذات ہے۔ پس اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے سامنے سر جھکایا تو توحید الٰہی کا اعتقاد باقی نہ رہا۔ وہ کہتا ہے، یہ اسی کی ذات ہے جو انسانوں کی پکار سنتی اور ان کی دعائیں قبول کرتی ہے۔ پس اگر تم نے اپنی دعاؤں اور طلبگاریوں میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا تو گویا تم نے اسے خدا کی خدائی میں شریک کر لیا۔ وہ کہتا ہے، دعا، استعانت، رکوع، سجود، عجز و نیاز، اعتماد و توکل اور اس طرح کے تمام عبادت گذارانہ اور نیازمندانہ اعمال وہ اعمال ہیں، جو خدا اور اس کے بندوں کا باہمی رشتہ قائم کرتے ہیں۔ پس اگر ان اعمال میں تم نے کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا، تو خدا کے رشتۂ معبودیت کی یگانگی باقی نہ رہی۔ اسی طرح عظمتوں، کبریائیوں، کارسازیوں اور بے نیازیوں کا جو اعتقاد تمہارے اندر خدا کی ہستی کا تصور پیدا کرتا ہے، وہ صرف خدا ہی کے لیے مخصوص ہونا چاہیئے۔ اگر تم نے ویسا ہی اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لیے بھی پیدا کر لیا تو تم نے اسے خدا کا نِد یعنی شریک ٹھہرالیا۔ اور توحید کا اعتقاد درہم برہم ہو گیا۔

یہی وجہ ہے کہ سورۂ فاتحہ میں اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ؕ کی تلقین کی گئی۔ اس میں اول تو عبادت کے ساتھ استعانت کا بھی ذکر کیا گیا، پھر دونوں جگہ مفعول کو مقدم کیا جو

نظام قائم نہ رہا تو عوام کی مذہبی زندگی درہم برہم ہو جائے گی۔ فیثا غورث کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ جب اس نے اپنا مشہور حسابی قاعدہ معلوم کیا تھا تو اس کے شکرانے میں سو بچھڑوں کی قربانی دیوتاؤں کی نذر کی تھی۔

اس بارے میں سب سے زیادہ نازک معاملہ معلّم و رہنما کی شخصیّت کا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی تعلیم عظمت و رفعت حاصل نہیں کر سکتی جب تک معلّم کی شخصیّت میں بھی عظمت کی شان پیدا نہ ہوئے۔ لیکن شخصیّت کی عظمت کی حدود کیا ہیں، یہیں آ کر سب کے قدموں نے ٹھوکر کھائی وہ اس کی ٹھیک ٹھیک حد بندی نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کبھی شخصیّت کو خدا کا اوتار بنا دیا، کبھی ابن اللہ سمجھ لیا، کبھی شریک و سہیم ٹھہرا دیا، اور اگر یہ نہیں کیا تو کم از کم اس کی تعظیم میں بندگی و نیاز کی سی شان پیدا کر دی۔ یہودیوں نے اپنے ابتدائی عہد کی گمراہیوں کے بعد کبھی ایسا نہیں کیا کہ پتھر کے بُت تراش کر ان کی پوجا کی ہو، لیکن اس بات سے وہ بھی نہ بچ سکے کہ اپنے نبیوں کی قبروں پر ہیکل تعمیر کر کے انھیں عبادت گاہوں کی سی شان و تقدیس دے دیتے تھے۔ گوتم بُدھ کی نسبت معلوم ہے کہ اس کی تعلیم میں اصنام پرستی کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس کی آخری وصیّت جو ہم تک پہنچی ہے یہ ہے کہ "ایسا نہ کرنا کہ میری نعش کی راکھ کی پوجا شروع کر دو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یقین کرو، نجات کی راہ تم پر بند ہو جائے گی"[۱]۔ لیکن اس وصیّت پر جیسا کچھ عمل کیا گیا، وہ دنیا کے سامنے ہے، نہ صرف بدھ کی خاک اور یادگاروں پر معبد تعمیر کیے گئے بلکہ مذہب کی اشاعت کا ذریعہ ہی یہ سمجھا گیا کہ اس کے مجسّموں سے زمین کا کوئی گوشہ خالی نہ رہے۔ یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں کسی معبود کے بھی اتنے مجسّمے نہیں بنائے گئے جتنے گوتم بدھ کے بنائے گئے ہیں، اسی طرح ہمیں معلوم ہے کہ مسیحیت کی حقیقی تعلیم سرتاسر توحید کی تعلیم تھی،

---

[۱] آر بی بُدھازم ۱۲

ابھی ان کی وفات پر چند گھنٹے بھی نہیں گذرے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ نے برسرِ منبر اعلان کر دیا تھا:

من کان منکم یعبد محمداً فان	جو کوئی تم میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پرستش کرتا
محمد اقد مات ومن کان	تھا، سو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ محمد (صلعم) نے
منکم یعبد اللہ فان اللہ	وفات پائی اور جو کوئی تم میں سے اللہ کی پرستش کرتا
حی لا یموت (بخاری)	تھا تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کی ذات ہمیشہ زندہ ہے، اس کے لیے موت نہیں!

(۴) عوام اور خواص دونوں کے لیے ایک تصور

رابعاً، قرآن سے پہلے علوم وفنون کی طرح مذہبی عقائد میں بھی خاص و عام کا امتیاز ملحوظ رکھا جاتا تھا، اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ خدا کا ایک تصور تو حقیقی ہے، اور خواص کے لیے ہے، ایک تصور مجازی ہے اور عوام کے لیے ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں خداشناسی کے تین درجے قرار دیے گئے۔

عوام کے لیے دیوتاؤں کی پرستش، خواص کے لیے براہ راست خدا کی پرستش، اخص الخواص کے لیے وحدۃ الوجود کا مشاہدہ۔ یہی حال فلاسفۂ یونان کا تھا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ ایک غیر مرئی اور غیر مجسّم خدا کا تصور صرف اہل علم و حکمت ہی کر سکتے ہیں۔ عوام کے لیے اسی میں امن ہے کہ دیوتاؤں کی پرستاری میں مشغول رہیں۔

لیکن قرآن نے حقیقت و مجاز یا خاص و عام کا کوئی امتیاز باقی نہ رکھا۔ اس نے سب کو خداپرستی کی ایک ہی راہ دکھائی، اور سب کے لیے صفاتِ الٰہی کا ایک ہی تصور پیش کر دیا۔ وہ حکماء و عرفاء سے لے کر جہّال و عوام تک، سب کو حقیقت کا ایک ہی جلوہ دکھاتا ہے، اور سب پر ایمان و اعتقاد کا ایک ہی دروازہ کھولتا ہے۔ اس کا تصور جس طرح ایک حکیم و عارف کے لیے سرمایۂ تفکر ہے، اسی طرح ایک چرواہے دہقان کے لیے سرمایۂ تسکین!

اس سلسلہ میں معاملہ کا ایک اور پہلو بھی قابلِ غور ہے۔ ہندوستان میں خواص اور

مفید حصر ہے۔ یعنی "صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں، اور صرف تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں" اس کے علاوہ تمام قرآن میں اس کثرت کے ساتھ توحید فی الصفات اور ردِّ اشراک پر زور دیا گیا ہے کہ شاید ہی کوئی سورت بلکہ کوئی صفحہ اس سے خالی ہو۔

مقامِ نبوت کی حد بندی

سب سے زیادہ اہم مسئلہ مقامِ نبوت کی حد بندی کا تھا۔ یعنی معلّم کی شخصیت کو اس کی اصلی جگہ میں محدود کر دینا، تاکہ شخصیت پرستی کا ہمیشہ کے لیے سدباب ہو جائے۔ اس بارے میں قرآن نے جس طرح صاف اور قطعی لفظوں میں جابجا پیغمبر اسلام کی بشریّت اور بندگی پر زور دیا ہے، محتاج بیان نہیں۔ ہم یہاں صرف ایک بات کی طرف توجہ دلائیں گے۔ اسلام نے اپنی تعلیم کا بنیادی کلمہ جو قرار دیا ہے، وہ سب کو معلوم ہے: اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ "یعنی میں اقرار کرتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، اور میں اقرار کرتا ہوں کہ محمد (صلعم) خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔" اس اقرار میں جس طرح خدا کی توحید کا اعتراف کیا گیا ہے، ٹھیک اسی طرح پیغمبر اسلامؐ کی بندگی اور درجۂ رسالت کا بھی اعتراف ہے۔ غور کرنا چاہیئے کہ ایسا کیوں کیا گیا؟ صرف اس لیے کہ پیغمبرِ اسلام کی بندگی اور درجۂ رسالت کا اعتقاد اسلام کی اصل و اساس بن جائے، اور اس کا کوئی موقع ہی باقی نہ رہے کہ عبدیت کی جگہ معبودیت کا، اور رسالت کی جگہ اوتار کا تخیل پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ اس معاملہ کا تحفظ کیا جا سکتا تھا؟ کوئی شخص دائرۂ اسلام میں داخل ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ خدا کی توحید کی طرح پیغمبر اسلامؐ کی بندگی کا بھی اقرار نہ کر لے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں پیغمبر اسلام (صلعم) کی وفات کے بعد مسلمانوں میں بہت سے اختلافات پیدا ہوئے، لیکن ان کی شخصیت کے بارے میں کبھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوا۔

اُبھرتی رہی ہے، ہمیں اعتراف کرنا چاہیئے، لیکن معاملہ صرف اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا زندگی کے حقائق کے تقاضوں کا یہاں کچھ عجیب حال ہے۔ یہاں ہم کسی ایک گوشے ہی کے ہو کر نہیں رہ جا سکتے دوسرے گوشوں کی بھی خبر رکھنی پڑتی ہے، اور فکر و عمل کی ہر راہ اتنی دور تک چلی گئی ہے کہ کہیں نہ کہیں جا کر حد بندی کی لکیریں کھینچنی پڑتی ہیں۔ اگر ایسا نہ کریں تو علم و اخلاق کے تمام احکام متزلزل ہو جائیں۔ اور اخلاقی اقدار کی کوئی مستقل حیثیت باقی نہ رہے۔ رواداری یقیناً ایک خوبی کی بات ہے، لیکن ساتھ ہی عقیدہ کی مضبوطی رائے کی پختگی، اور فکر کی استقامت کی خوبیوں سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پس یہاں کوئی نہ کوئی حد بندی کا خط ضرور ہونا چاہیئے، جو ان تمام خوبیوں کو اپنی اپنی جگہ قائم رکھے۔ اخلاق کے تمام احکام انہی حد بندیوں کے خطوط سے بنتے اور اُبھرتے ہیں جونہی یہ ہلنے لگتے ہیں، اخلاق کی پوری دیوار ہل جاتی ہے۔ عفو و درگذر بڑی ہی حسن و خوبی کی بات ہے، لیکن یہی عفو و درگذر جب اپنی حد بندی کے خط سے آگے بڑھ جاتا ہے تو عفو و درگذر نہیں رہتا، اسے بزدلی اور بے ہمتی کے نام سے پکارنے لگتے ہیں۔ شجاعت انسانی سیرت کا سب سے بڑا وصف ہے، لیکن یہی وصف جب اپنی حد سے گذر جائے گا تو نہ صرف اس کا حکم ہی بدل جائے گا بلکہ صورت بھی بدل جائے گی۔ اب اسے دیکھیئے تو وہ شجاعت نہیں ہے۔ قہر و غضب اور ظلم و تشدد ہو گیا ہے۔

دو حالتیں ہیں، اور دونوں کا حکم ایک نہیں ہو سکتا۔ ایک حالت یہ ہے اور عمل کی روشنی ہمارے سامنے آگئی ہے اور ہم ایک خاص نتیجہ تک پہنچ گئے ہیں۔ اب اس کی نسبت ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہیئے؟ ہم اس پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہیں یا متزلزل رہیں؟ دوسری حالت یہ ہے کہ جس طرح ہم کسی خاص نتیجے تک پہنچے ہیں، اسی

عوام کے خدا پرستانہ تصوّروں میں جو فرقِ مراتب ملحوظ رکھا گیا، وہ معاملہ کو اس رنگ میں بھی نمایاں کرتا ہے کہ یہاں کا مذہبی نقطۂ خیال ابتدا سے فکر و عمل کی رواداری پر مبنی رہا ہے۔ یعنی کسی دائرۂ فکر کو بھی اتنا تنگ اور بے لچک نہیں دکھایا گیا ہے کہ کسی دوسرے دائرے کی اس میں گنجائش ہی نہ نکل سکے۔ یہاں خواص توحید کی راہ پر گامزن ہوئے، لیکن عوام کے لیے دیوتاؤں کی پرستش اور مورتیوں کی معبودیت کی راہیں بھی کھلی چھوڑ دی گئیں۔ گویا ہر عقیدے کو جگہ دی گئی۔ ہر عمل کے لیے گنجائش نکالی گئی اور ہر طور طریقہ کو آزادانہ نشو و نما کا موقع مل گیا۔ مذہبی اختلاف جو دوسری قوموں میں باہمی جنگ و جدال کا ذریعہ رہا ہے، یہاں آپس کے سمجھوتوں کا ذریعہ بنا، اور ہمیشہ متعارض اصول باہم دگر ٹکرانے کی جگہ ایک دوسرے کے لیے جگہیں نکالتے رہے۔ تخالف کی حالت میں تفاہم اور تعارض کی حالت میں تطابق۔ گویا یہاں کے ذہنی مزاج کی عام خصوصیت تھی۔ ایک ویدانتی جانتا ہے کہ اصلِ حقیقت اشراک اور بت پرستی کے عقائد سے بالاتر ہے، تاہم یہ جاننے پر بھی وہ بت پرستی کا منکر و مخالف نہیں ہو جاتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ پسماندگانِ راہ کے لیے یہ بھی ایک ابتدائی منزل ہوئی اور رہرو کوئی راہ اختیار کرے، مگر مقصودِ اصلی ہر حال میں سب کا ایک ہی ہے:

خواہ از طریقِ میکدہ خواہ از رہِ حرم　　از ہر جہت کہ شاد شوی فتح باب گیر

چنانچہ چند سال ہوئے پروفیسر سی۔ ای۔ ایم۔ جوڈ (JOAD) نے ہندوستان کے تاریخی خصائص پر نظر ڈالتے ہوئے اس خصوصیت کو سب سے زیادہ نمایاں جگہ دی تھی۔ اور اس سے پہلے دوسرے اہلِ قلم بھی اس پہلو پر زور دے چکے ہیں۔

ہمیں چاہیئے، معاملے کے اس پہلو پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

بلاشبہ فکر و عمل کے اس روادارانہ اسلوب کا، جو ہندوستان کی [illegible] برابر

آئی تو اتنی دور چلی گئی کہ رواداری کے تمام تقاضے بھلا دیئے گئے اور دوسروں کے اعتقاد وعمل میں جبراً مداخلت کی جانے لگی۔ اگر رواداری آئی تو اس بے اعتدالی کے ساتھ آئی کہ استقامتِ فکر ورائے کے لیے کوئی جگہ نہ رہی، ہر عقیدہ لچک گیا، ہر یقین ہلنے لگا۔ پہلی بے اعتدالی کی مثالیں ہمیں ان مذہبی تنگ نظریوں اور سخت گیریوں میں ملتی ہیں جن کی خونچکاں داستانوں سے تاریخ کے اوراق رنگین ہو چکے ہیں۔ دوسری بے اعتدالی کے نتائج کی مثال ہمیں ہندوستان کی تاریخ مہیا کر دیتی ہے۔ یہاں فکر و عقیدہ کی کوئی بلندی بھی وہم وجہالت کی گراوٹ سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکی۔ اور علم و عقل اور وہم و جہل میں ہمیشہ سمجھوتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان سمجھوتوں نے ہندوستانی دماغ کی شکل وصورت بگاڑ دی۔ اس کی فکری ترقیوں کا تمام حسن اصنامی عقیدوں اور وہم پرستیوں کے گرد وغبار میں چھپ گیا۔

زمانۂ حال کے مؤرخوں نے اس صورتِ حال کا اعتراف کیا ہے۔ ہمارے زمانے کا ایک قابل ہندو مصنف اس عہد کی فکری حالت پر نظر ڈالتے ہوئے جب آریائی توہمات ہندوستان کے مقامی مذاہب سے مخلوط ہونے لگے تھے، تسلیم کرتا ہے کہ "ہندو مذہب کی مخلوط نوعیت کی توضیح ہمیں اس صورتِ حال میں مل جاتی ہے۔ صحرا نورد قبائل کے وحشیانہ توہمات سے لیکر اونچے سے اونچے درجہ کے نہ رس غور وخوض تک ہر درجہ اور ہر دائرۂ فکر کے خیالات یہاں باہم دگر ملتے اور مخلوط ہوتے رہے۔ آریائی مذہب اول روز سے کشادہ دل، خود رَو اور روادار تھا۔ وہ جب کبھی کسی نئے موثر سے دوچار ہوا تو خود سمٹتا گیا اور جگہیں نکالتا رہا۔ اس کی اس مزاجی حالت میں ہم ایک سچے انکسارِ طبع اور ہمدردانہ مفاہمت کا شائستہ رجحان محسوس کرتے ہیں۔ ہندو دماغ اس کے لیے تیار نہیں ہوا کہ نچلے درجے کے مذہبوں کو نظر انداز کر دے یا لڑ کر ان کی ہستی مٹا دے۔ اس کے اندر ایک مذہبی مجنوں کا غرور نہیں تھا کہ صرف اسی کا مذہب

طرح ایک دوسرا شخص بھی ایک دوسرے نتیجے تک پہنچ گیا ہے اور یہاں فکر و عمل کی ایک ہی راہ سب کے آگے نہیں کھلتی۔ اب ہمارا طرزِ عمل اس شخص کی نسبت کیا ہونا چاہیئے؟ ہماری طرح اُسے بھی اپنی راہ چلنے کا حق ہے یا نہیں؟ رواداری کا صحیح محل دوسری حالت ہے۔ پہلی نہیں ہے۔ اگر پہلی حالت میں وہ آئے گی، تو یہ رواداری نہ ہوگی۔ اعتقاد کی کمزوری اور یقین کا فقدان ہوگا۔

رواداری یہ ہے کہ اپنے حقِ اعتقاد و عمل کے ساتھ دوسرے حقِ اعتقاد و عمل کا بھی اعتراف کیجئے۔ اور اگر دوسرے کی راہ آپ کو صریح غلط دکھائی دے رہی ہے، جب بھی اس کے اس حق سے انکار نہ کیجئے۔ کہ وہ اپنی غلط پر بھی چل سکتا ہے۔ لیکن اگر رواداری کے حدود یہاں تک بڑھا دیئے گئے کہ وہ آپ کے عقیدوں میں بھی مداخلت کر سکتی ہے اور آپ کے فیصلوں کو بھی نرم کر دے سکتی ہے تو پھر یہ رواداری نہ ہوئی استقامتِ فکر کی نفی ہوگئی۔

مفاہمت زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے، اور ہماری زندگی ہی سرتاسر مفاہمت ہے، لیکن ہر راہ کی طرح یہاں بھی حدبندی کی کوئی لکیر کھینچنی پڑے گی۔ اور جس حد پر بھی جا کر لکیر کھینچی گئی، معاً عقیدہ پیدا ہوگیا۔ اب جب تک عقیدہ کی تبدیلی کی کوئی روشنی سامنے نہیں آتی آپ مجبور ہیں کہ اس پر جمے رہیں۔ اور اس میں کانٹ چھانٹ نہ کریں۔ آپ دوسروں کے عقائد کا احترام ضرور کریں گے، لیکن اپنے عقیدہ کو بھی کمزوری کے حوالے نہیں ہونے دیں گے۔

کتنی ہی مصیبتیں ہیں جو اعتقاد اور عمل کے تمام گوشوں میں اسی دروازے سے آئیں کہ ان دو مختلف حالتوں کا امتیازی خط اپنی جگہ سے ہل گیا۔ اگر اعتقاد کی مضبوطی

ہو۔ پس قرآن بھی اس بارے میں عام طور پر جو کچھ بتلاتا ہے، وہ اتنا ہی ہے۔ اس سے زیادہ جو کچھ ہے، وہ مذہبی عقیدے کا معاملہ نہیں ہے۔ انفرادی اور ذاتی تجربہ و احوال کا معاملہ ہے اس لیے وہ اس کا بوجھ جماعت کے افکار پر نہیں ڈالتا۔ اسے اصحابِ جہد و طلب کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (۲۹: ۶۹)
اور جو لوگ ہم تک پہنچنے کے لیے کوشش کریں گے تو ہم بھی ضرور ان پر راہ کھول دیں گے۔ اور اللہ نیک کرداروں سے الگ کب ہے؟ وہ تو ان کے ساتھ ہے۔

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ؟ (۵۱: ۲۱)
اور ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں، زمین میں کتنی ہی حقیقت کی نشانیاں ہیں، اور خود تمہارے اندر بھی، پھر کیا تم دیکھتے نہیں؟

سادساً، اسی مقام سے وہ فرقِ مراتب بھی نمایاں ہو جاتا ہے جو اسلام نے بالکل ایک دوسری شکل و نوعیت میں عوام و خواص کا ملحوظ رکھا ہے۔ ہندو مفکروں نے عوام اور خواص میں الگ الگ تصوّر اور عقیدے تقسیم کیے۔ اسلام نے تصوّر اور عقیدے کے اعتبار سے کوئی امتیاز جائز نہیں رکھا۔ وہ حقیقت کا ایک ہی عقیدہ ہر انسانی دل و دماغ کے آگے پیش کرتا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ طلب و جہد کے لحاظ سے سب کے مراتب یکساں نہیں ہو سکتے اور یہاں ایک ہی درجے کی پیاس لے کر ہر طالبِ حقیقت نہیں آتا۔ عامّۃ الناس بحیثیت جماعت کے اپنا ایک خاص مزاج اور اپنی خاص احتیاج رکھتے ہیں۔ خاص افراد بہ حیثیت فرد کے اپنی طلب و استعداد کا الگ الگ درجہ و مقام رکھتے ہیں۔ پس اس نے جس امتیاز سے پہلی صورت میں انکار کر دیا تھا، اس سے دوسری صورت میں انکار نہیں کیا اور مختلف مدارج طلب کے لیے عرفان و یقین کی مختلف راہیں کھلی چھوڑ دیں۔

صحیح بخاری اور مسلم کی ایک متفق علیہ روایت میں جو حدیثِ جبریل کے نام سے مشہور ہے،

سچّا مذہب ہی۔ اگر انسانوں کے ایک گروہ کو کسی ایک معبود کی پرستش اس کے طور طریقے پر تسکینِ قلب مہیا کر دیتی ہی، تو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ یہ بھی سچّائی کی ایک راہ ہی۔ مکمل سچائی پر کوئی بہ یک دفعہ قابض نہیں ہو جا سکتا۔ وہ صرف بتدریج اور بہ تفریق ہی حاصل کی جا سکتی ہی اور یہاں ابتدائی اور عارضی درجوں کو بھی ان کی ایک جگہ دینی پڑتی ہی۔ ہندو دماغ نے رواداری اور باہمی مفاہمتوں کی یہ راہ اختیار کر لی، لیکن وہ یہ بات بھول گیا کہ بعض حالات ایسے بھی ہوتے ہیں جب رواداری کی جگہ ناروا داری ایک فضیلت کا حکم پیدا کر لیتی ہی۔ اور مذہبی معاملات میں بھی گریشم[1] (GRESHAM) کے قانون کی طرح کا ایک قانون کام کرتا رہتا ہی جب آریائی اور غیر آریائی مذاہب باہم دگر ملے۔ ایک شائستہ اور دوسرا ناشائستہ، ایک اچھی قسم کا اور دوسرا نکما، تو غیر شائستہ اور نکمّے اجزا میں قدرتی طور پر یہ میلان پیدا ہو گیا کہ شائستہ اور اچھے اجزا کو دبا کر معطّل کر دے[2]۔"

بہرحال قرآن کے تصوّرِ الٰہی کی ایک بُنیادی خصوصیت یہ ہی کہ اس نے کسی طرح کی اعتقادی مفاہمت اس بارے میں جاری نہیں رکھی۔ وہ اپنے توحیدی اور تنزیہی تصوّر میں سرتاسر بے میل اور بے لچک رہا۔ اس کی یہ مضبوط جگہ کسی طرح بھی ہمیں روادارانہ طرزِ عمل سے روکنا نہیں چاہتی البتہ اعتقادی مفاہمتوں کے تمام دروازے بند کر دیتی ہی۔

خامسًا، قرآن نے تصوّرِ الٰہی کی بنیاد انسان کے عالمگیر وجدانی احساس پر رکھی ہے۔ یہ نہیں کیا ہی کہ اسے فکر و نظر کی کاوشوں کا ایک ایسا معمّہ بنا دیا ہو، جسے کسی خاص طبقے کا ذہن ہی حل کر سکے۔ انسان کا عالمگیر وجدانی احساس کیا ہی؟ یہ ہی کہ کائناتِ ہستی خود بخود پیدا نہیں ہو گئی، پیدا کی گئی ہی۔ اور اس لیے ضروری ہی کہ ایک صانع ہستی موجود

---

[1] گریشم کے قانون سے مقصود اقتصادیات کی یہ اصل ہی کہ اگر کھرے سکّوں کے ساتھ کھوٹے سکّے ملا دیئے جائیں گے تو کھرے سکّوں کی قیمت باقی نہیں رہے گی۔ [2] پروفیسر اس۔ رادھاکرشنان۔ انڈین فلاسفی۔ جلد اول صفحہ ۱۹۔ طبع ثانی۔

پرسید یکے عاشقی چیست ؟ گفتم کہ چو من شوی بدانی !

اسلام نے اس طرح طلب و جہد کی ہر پیاس کے لیے درجہ بدرجہ سیرابی کا سامان کر دیا۔ عوام کے لیے پہلا مرتبہ کافی ہے۔ خواص کے لیے دوسرا مرتبہ ضروری ہے اور اخصّ الخواص کی پیاس بغیر تیسرے جام کے تسکین پانے والی نہیں۔ اس کے تصورِ الٰہی اور عقیدے کا میخانہ ایک ہی، لیکن جام الگ الگ ہوئے۔ ہر طالب کے حصّے میں اس کے ظرف کے مطابق ایک جام آجاتا ہے اور اس کی سرشاری کیفیتیں مہیّا کر دیتا ہے۔ ولِلّٰہ درّ من قال:

ساقی بہ ہمہ بادہ زیک خم دہد، امّا در مجلس او مستی ہر کس ز شرابے ست!

یہاں یہ امر بھی واضح کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ قرآن کی متعدد تصریحات ہیں جنھیں اگر وحدۃ الوجودی تصوّر کی طرف لیجایا جائے تو بلا تکلف دور تک جا سکتی ہیں۔ مثلاً "ھُوَ الاوّل وَالاخر والظاھر والباطن" اور "اینما تولّوا فثمّ وجہُ اللّٰہ" اور "ونحن اقرب الیہ من حبل الورید" اور "کُلّ یومٍ ھُوَ فی شان" یا تمام اس طرح کی تصریحات جن میں تمام موجودات کا بالآخر اللّٰہ کی طرف لوٹنا بیان کیا گیا ہے۔ توحیدِ وجودی کے قائل ان تمام آیات سے مسئلۂ وحدۃ الوجود پر استدلال کرتے ہیں۔ اور شاہ ولی اللّٰہ نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "اگر میں مسئلۂ وحدۃ الوجود کو ثابت کرنا چاہوں تو قرآن و حدیث کے تمام نصوص و ظواہر سے اس کا اثبات کر سکتا ہوں"۔ لیکن صاف بات جو اس بارے میں معلوم ہوتی ہے، وہ یہی ہے کہ ان تمام تصریحات کو ان کے قریبی محامل سے دور نہیں لے جانا چاہیئے۔ اور ان معانی سے آگے نہیں بڑھنا چاہیئے جو صدرِ اول کے مخاطبوں نے سمجھے تھے۔

باقی رہا حقیقت کے کشف و عرفان کا وہ مقام جو عرفا طریق کو پیش آتا ہے، تو وہ کسی طرح بھی قرآن کے تصورِ الٰہی کے عقیدے کے خلاف نہیں۔ اس کا تصوّر ایک جامع تصوّر ہے اور ہر توحیدی

نہایت جامع و مانع لفظوں میں یہ فرقِ مراتب واضح کر دیا گیا ہے۔ یہ حدیث تین مرتبوں کا ذکر کرتی ہے: اسلام، ایمان اور احسان۔ اسلام یہ ہے کہ اسلامی عقیدے کا اقرار کرنا اور عمل کے چاروں رکن یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ انجام دینا۔ ایمان یہ ہے کہ اقرار کے مرتبہ سے آگے بڑھنا اور اسلام کے بنیادی عقائد کے حق الیقین کا مرتبہ حاصل کرنا۔ احسان یہ ہے:

ان تعبد اللہ کانک تراہ وان	تو اللہ کی اس طرح عبادت کرے، گویا اسے اپنے سامنے
لم تکن تراہ فانہ یراک (صحیحین)	دیکھ رہا ہے اور اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے

پس گویا عرفانِ حقیقت کے لحاظ سے یہاں تین مرتبے ہوئے۔ پہلا مرتبہ اسلامی دائرہ کے عام اعتقاد و عمل کا ہے۔ یہ اسلام ہے۔ یعنی جس نے اسلامی عقیدہ کا اقرار کر لیا اور اس کے اعمال کی زندگی اختیار کر لی، وہ اس دائرہ میں آ گیا۔ لیکن دائرے میں داخل ہو جانے سے یہ لازم نہیں آ جاتا کہ علم و یقین کے جو مقامات ہیں، وہ بھی ہر وارد و داخل کو حاصل ہو گئے۔ پس اب دوسرا مرتبہ نمایاں ہوا جسے ایمان سے تعبیر کیا ہے۔ اسلام ظاہر کا اقرار و عمل تھا، ایمان دل و دماغ کا یقین و اذعان ہے۔ یہ مرتبہ جس نے حاصل کر لیا، وہ عوام سے نکل کر خواص کے زمرہ میں داخل ہو گیا۔ لیکن معاملہ اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ عرفانِ حقیقت اور عین الیقینی ایقان کا ایک اور مرتبہ بھی باقی رہ جاتا ہے۔ اسے احسان سے تعبیر کیا گیا لیکن یہ مقام محض اعتقاد اور یقین پیدا کر لینے کا نہیں ہے جو ایک گروہ کو بہ حیثیت گروہ کے حاصل ہو جا سکتا ہے۔ یہ ذاتی تجربہ کا مقام ہے جو یہاں تک پہنچتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی تجربہ و کشف سے یہ مرتبہ حاصل کر لیتا ہے تعلیمی اور احکامی عقائد کو اس میں دخل نہیں۔ بحث و نظر کی اس میں گنجائش نہیں۔ یہ خود کرنے اور پانے کا معاملہ ہے۔ بتلانے اور سمجھانے کا معاملہ نہیں۔ جو یہاں تک پہنچ گیا وہ اگر کچھ بتلائیگا بھی تو یہی بتلائے گا کہ میری طرح بن جاؤ پھر جو کچھ دکھائی دیتا ہے، دیکھ لو۔

(۶)

اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۙ

ہدایت

ہدایت کے معنی رہنمائی کرنے، راہ دکھانے، راہ پر لگا دینے کے ہیں۔ اجمالاً اس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ یہاں ہم چاہتے ہیں کہ ہدایت کے مختلف مراتب و اقسام پر نظر ڈالیں جن کا قرآن حکیم نے ذکر کیا ہے اور جن میں سے ایک خاص مرتبہ وحی و نبوت کی ہدایت کا ہے۔

تکوینِ وجود کے مراتبِ اربعہ

تم ابھی پڑھ چکے ہو کہ خدا کی ربوبیت نے جس طرح مخلوقات کو ان کے مناسبِ حال جسم و قویٰ دیئے ہیں، اسی طرح ان کی ہدایتِ فطری کا سامان بھی مہیا کر دیا ہے۔ فطرت کی یہی ہدایت ہے جو ہر وجود کو زندگی و معیشت کی راہ پر لگاتی اور ضروریاتِ زندگی کی جستجو میں رہنما ہوتی ہے۔ اگر فطرت کی یہ ہدایت موجود نہ ہوتی، تو ممکن نہ تھا کہ کوئی مخلوق بھی زندگی و بقا کا سامان بہم پہنچا سکتی۔ چنانچہ قرآن نے جا بجا اس حقیقت پر توجہ دلائی ہے۔ وہ کہتا ہے، ہر وجود کے بننے اور درجۂ تکمیل تک پہنچنے کے مختلف مراتب ہیں۔ اور ان میں آخری مرتبہ ہدایت مرتبہ ہے۔ سورۂ اعلیٰ میں بالترتیب چار مرتبوں کا ذکر کیا ہے:

اَلَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ۪ۙ وَ الَّذِیۡ	وہ پروردگار جس نے ہر چیز پیدا کی۔ پھر اسے درست کیا
قَدَّرَ فَهَدٰی ۪ۙ (۸۷ : ۲)	پھر ایک اندازہ ٹھہرا دیا پھر اس پر راہ (عمل) کھول دی۔

یعنی تکوینِ وجود کے چار مرتبے ہوئے: تخلیق، تسویہ، تقدیر، ہدایت۔

تخلیق کے معنی پیدا کرنے کے ہیں۔ یہ بات کہ کائناتِ خلقت اور اس کے ہر وجود کا مواد عدم سے وجود میں آگیا، تخلیق ہے۔

تصوّر کی اس میں گنجائش موجود ہے۔ جو افراد خاصّہ مقام احسان تک رسائی حاصل کرتے ہیں، وہ حقیقت کو اس کی پس پردہ جلوہ طرازیوں میں بھی دیکھ لیتے ہیں، اور عرفان کا وہ منتہیٰ مرتبہ جو فکر انسانی کی دسترس میں ہے، انھیں حاصل ہوجاتا ہے۔ وَمن لم یذق لم یدرِ

تو نظر باز نۂ ورنہ تغافل نگہ ست   تو زبان فہم نۂ ورنہ خموشی سخن است

سابعًا: جس ترتیب کے ساتھ سورۂ فاتحہ میں یہ تینوں صفتیں بیان کی گئی ہیں، دراصل فکر انسانی کی طلب و معرفت کی قدرتی منزلیں ہیں۔ اور اگر غور کیا جائے تو اسی ترتیب سے پیش آتی ہیں۔ سب سے پہلے ربوبیت کا ذکر کیا گیا کیونکہ کائنات ہستی میں سب سے زیادہ ظاہر نمود اسی صفت کی ہے، اور ہر وجود کو سب سے زیادہ اسی کی احتیاج ہے۔ ربوبیت کے بعد رحمت کا ذکر کیا گیا، کیونکہ اس کی حقیقت بمقابلہ ربوبیت کے مطالعہ و تفکر کی محتاج تھی، اور ربوبیت کے مشاہدات سے جب نظر آگے بڑھتی ہے، تب رحمت کا جلوہ نمودار ہوتا ہے۔ پھر رحمت کے بعد عدالت کی صفت جلوہ افروز ہوئی، کیونکہ یہ سفر کی آخری منزل ہے۔ رحمت کے مشاہدات کی منزل سے جب قدم آگے بڑھتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے، یہاں عدالت کی نمود بھی ہر جگہ موجود ہے، اور اس لیے موجود ہے کہ ربوبیت اور رحمت کا مقتضا یہی ہے۔

قرآن نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور ان کی قوم کا جو مکالمہ جا بجا نقل کیا ہے، اس میں حضرت ابراہیمؑ اپنے عقیدے کا اعلان کرتے ہوئے کہتے ہیں

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖۤ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَۙ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ۝ (۴۳ : ۲۶-۲۷)	اور جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور قوم سے کہا تھا تم جن (دیوتاؤں) کی پرستش کرتے ہو، مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں۔ میرا اگر رشتہ ہے تو اس ذات سے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ اور وہی میری رہنمائی کرے گی۔

الَّذِیْ فَطَرَنِیْ فَاِنَّهٗ سَیَهْدِیْنِ یعنی جس خالق نے مجھے جسم و وجود عطا فرمایا ہے، ضروری ہے کہ اس نے میری ہدایت کا بھی سامان کر دیا ہو۔ سورۂ شعرا میں یہی بات زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے:

الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِۙ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِۙ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ۝ (۲۶ : ۸۰)	جس پروردگار نے مجھے پیدا کیا ہے وہی میری ہدایت کرے گا، اور پھر وہی ہے جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو شفا بخشتا ہے۔

یعنی جس پروردگار کی پروردگاری نے میری تمام ضروریات زندگی کا سامان کر دیا ہے جو مجھے بھوک کے لیے غذا، پیاس کے لیے پانی اور بیماری میں شفا عطا فرماتا ہے، کیونکر ممکن ہے کہ اس نے مجھے پیدا تو کر دیا ہو لیکن میری ہدایت کا سامان نہ کیا ہو؟ اگر اس نے مجھے پیدا کیا ہے تو یقیناً وہی ہے جو طلب و سعی میں میری رہنمائی بھی کرے۔ سورۂ صافات میں یہی مطلب ان لفظوں میں ادا کیا گیا ہے:

اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ۝ (۳۷ : ۹۹)	میں (ہر طرف سے کٹ کر) اپنے پروردگار کا رُخ کرتا ہوں، وہ میری ہدایت کرے گا۔

تسویہ کے معنی یہ ہیں کہ ایک چیز کو جس طرح ہونا چاہیئے ٹھیک ٹھیک اسی طرح درست اور آراستہ کر دینا۔

تقدیر کے معنی اندازہ ٹھہرا دینے کے ہیں، اور اس کی تشریح اوپر گذر چکی ہے۔

ہدایت سے مقصود یہ ہے کہ ہر وجود پر اس کی زندگی و معیشت کی راہ کھول دی جائے اور اس کی تشریح بھی ربوبیت کے مبحث میں گذر چکی ہے۔

مثلاً مخلوقات میں ایک خاص قسم پرند کی ہے۔

(۱) یہ بات کہ اُن کا مادۂ خلقت ظہور میں آ گیا تخلیق ہے۔

(۲) یہ بات کہ ان کے ظاہری و باطنی قویٰ اس طرح بنا دیئے گئے کہ ٹھیک ٹھیک قوام و اعتدال کی حالت پیدا ہو گئی، تسویہ ہے۔

(۳) یہ بات کہ ان کے ظاہری و باطنی قویٰ کے اعمال کے لیے ایک خاص طرح کا اندازہ ٹھہرا دیا گیا ہے جس سے وہ باہر نہیں جا سکتے، تقدیر ہے۔ مثلاً یہ کہ ہوا میں اُڑیں گے مچھلیوں کی طرح پانی میں تیریں گے نہیں۔

(۴) یہ بات کہ ان کے اندر وجدان و حواس کی روشنی پیدا ہو گئی جو انھیں زندگی و بقا کی راہیں دکھاتی، اور سامان حیات کے طلب و حصول میں رہنمائی کرتی ہے، ہدایت ہے۔

قرآن کہتا ہے خدا کی ربوبیت کا مقتضا یہی تھا کہ جس طرح اس نے ہر وجود کو اس کا جامۂ ہستی عطا فرمایا، اور اس کے ظاہری و باطنی قویٰ درست کر دیئے، اور اس کے اعمال کے لیے ایک مناسب حال اندازہ ٹھہرا دیا، اسی طرح اس کی ہدایت کا بھی سر و سامان کر دیتا۔

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (۲۰: ۵۰)

ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ عطا کی پھر اس پر راہِ عمل کھول دی۔

طرح اس کی معنوی قوت بھی تمام معنوی قوتوں کا برترین جوہر ہے۔ روح حیوانی کا وہ جوہر ادراک جو نباتات میں مخفی، اور حیوانات کے وجدان و مشاعر میں نمایاں تھا، انسان کے مرتبے میں پہنچ کر درجۂ کمال تک پہنچ گیا۔ اور جوہر عقل کے نام سے پکارا گیا۔

> ہر مرتبۂ ہدایت ایک خاص حد سے آگے رہنمائی نہیں کرسکتا۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ہدایت فطرت کے ان تینوں مرتبوں میں سے ہر مرتبہ اپنی قوت وعمل کا ایک خاص دائرہ رکھتا ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور اگر اس مرتبہ سے ایک دوسرا بلند تر مرتبہ موجود نہ ہوتا، تو ہماری معنوی قوتیں اس حد تک ترقی نہ کرسکتیں جس حد تک فطرت کی رہنمائی سے ترقی کر رہی ہیں۔

وجدان کی ہدایت ہم میں طلب وسعی کا جوش پیدا کرتی ہے اور مطلوبات زندگی کی راہ پر لگاتی ہے۔ لیکن ہمارے وجود سے باہر جو کچھ موجود ہے، اس کا ادراک حاصل نہیں کرسکتی۔ یہ کام مرتبۂ حواس کی ہدایت کا ہے۔ وجدان کی رہنمائی جب درماندہ ہوجاتی ہے، تو حواس کی دستگیری نمایاں ہوتی ہے۔ آنکھ دیکھتی ہے، کان سنتا ہے، زبان چکھتی ہے۔ ہاتھ چھوتا ہے، ناک سونگھتی ہے اور اس طرح ہم اپنے وجود سے باہر کی تمام محسوس اشیا کا ادراک حاصل کرلیتے ہیں۔

لیکن حواس کی ہدایت بھی ایک خاص حد تک ہی کام دے سکتی ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آنکھ دیکھتی ہے مگر صرف اسی حالت میں جب کہ دیکھنے کی تمام شرطیں موجود ہوں۔ اگر کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے، مثلاً روشنی نہ ہو، یا فاصلہ زیادہ ہو، تو ہم آنکھ رکھتے ہوئے بھی ایک موجود چیز کو براہ راست نہیں دیکھ سکتے۔ علاوہ بریں حواس کی ہدایت صرف اتنا ہی کرسکتی ہے کہ اشیا کا احساس پیدا کردے، لیکن مجرد احساس کافی نہیں ہے۔ ہمیں استنباط و استنتاج کی ضرورت ہے، احکام کی ضرورت ہے، کلیات کی ضرورت ہے، اور یہ کام عقل کی ہدایت کا ہے۔ وہ ان تمام مدرکات کو جو حواس کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں، ترتیب دیتی ہے اور ان سے

"رَبِّیْ" کے لفظ پر غور کرو، وہ میرا "رب" ہے اور جب وہ رب ہے تو ضروری ہے کہ وہی مجھ پر راہ عمل بھی کھول دے۔

ہدایت کے ابتدائی تین مرتبے پھر ہدایت کے بھی مختلف مراتب ہیں جو ہم حیوانات میں محسوس کرتے ہیں۔

سب سے پہلا مرتبہ وجدان کی ہدایت کا ہے۔ وجدان طبیعتِ حیوانی کا فطری اور اندرونی الہام ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بچہ پیدا ہوتے ہی غذا کے لیے رونے لگتا ہے، اور پھر بغیر اس کے کہ خارج کی کوئی رہنمائی اسے ملی ہو، ماں کی چھاتی منہ میں لیتے ہی اسے چوستا اور اپنی غذا حاصل کر لیتا ہے۔ وجدان کے بعد حواس کی ہدایت کا مرتبہ ہے، اور وہ اس سے بلند تر ہے۔ یہ ہمیں دیکھنے سننے، چکھنے چھونے اور سونگھنے کی قوتیں بخشتی ہے اور انہی کے ذریعے ہم خارج کا علم حاصل کرتے ہیں۔ ہدایتِ فطرت کے یہ دونوں مرتبے انسان اور حیوان، سب کے لیے ہیں، لیکن جہاں تک انسان کا تعلق ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک تیسرا مرتبۂ ہدایت بھی موجود ہے اور وہ عقل کی ہدایت ہے۔ فطرت کی یہی ہدایت ہے جس نے انسان کے آگے غیر محدود ترقیات کا دروازہ کھول دیا ہے، اور اسے کائناتِ ارضی کی تمام مخلوقات کا حاصل و خلاصہ بنا دیا ہے۔

وجدان کی ہدایت اس میں سعی و طلب کا ولولہ پیدا کرتی ہے، حواس اس کے لیے معلومات بہم پہنچاتے ہیں، اور عقل نتائج و احکام مرتب کرتی ہے۔ حیوانات کو اس آخری مرتبے کی ضرورت نہ تھی، اس لیے ان کا قدم وجدان اور حواس سے آگے نہیں بڑھا۔ لیکن انسان میں یہ تینوں مرتبے جمع ہو گئے۔

جوہرِ عقل کیا ہے؟ دراصل اسی قوت کی ایک ترقی یافتہ حالت ہے جس نے حیوانات میں وجدان اور حواس کی روشنی پیدا کر دی ہے۔ جس طرح انسان کا جسم، اجسامِ ارضی کی سب سے اعلیٰ کڑی ہے، اسی

کرتے ہیں کہ عقل کی ہدایت کے بعد بھی ہدایت کا کوئی مزید مرتبہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ عقل کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی، اور اس کے دائرۂ عمل کے بعد بھی ایک دائرہ باقی رہ جاتا عقل کی کارفرمائی جیسی کچھ اور جتنی کچھ بھی ہو، محسوسات کے دائرے میں محدود ہے، یعنی وہ صرف اسی حد تک کام دے سکتی ہے جس حد تک ہمارے حواس خمسہ معلومات بہم پہنچاتے رہتے ہیں، لیکن محسوسات کی سرحد سے آگے کیا ہے؟ اس پردے کے پیچھے کیا ہے جس سے آگے ہماری چشم حواس نہیں بڑھ سکتی؟ یہاں پہنچ کر عقل یک قلم درماندہ ہو جاتی ہے۔ اس کی ہدایت ہمیں کوئی روشنی نہیں دے سکتی۔

علاوہ بریں جہاں تک انسان کی عملی زندگی کا تعلق ہے، عقل کی ہدایت نہ تو ہر حال میں کافی ہے، نہ ہر حال میں موثر۔ نفس انسانی طرح طرح کی خواہشوں اور جذبوں سے کچھ اس طرح مقہور واقع ہوا ہے کہ جب کبھی عقل اور جذبات میں کشمکش ہوتی ہے، تو اکثر حالتوں میں فتح جذبات ہی کے لیے ہوتی ہے۔ بسا اوقات عقل ہمیں یقین دلاتی ہے کہ فلاں فعل مضر اور مہلک ہے۔ لیکن جذبات ہمیں ترغیب دیتے ہیں، اور ہم اس کے ارتکاب سے اپنے آپ کو نہیں روک سکتے۔ عقل کی بڑی سے بڑی دلیل بھی ہمیں ایسا نہیں بنا دے سکتی کہ غصے کی حالت میں بے قابو نہ ہو جائیں اور بھوک کی حالت میں مضر غذا کی طرف ہاتھ نہ بڑھائیں۔

اچھا، اگر خدا کی ربوبیت کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہمیں وجدان کے ساتھ حواس بھی دے۔ کیونکہ وجدان کی ہدایت ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اور اگر ضروری تھا کہ حواس کے ساتھ عقل بھی دے، کیونکہ حواس کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی، تو کیا یہ ضروری نہ تھا کہ عقل کے ساتھ کچھ اور بھی دے۔ کیونکہ عقل کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی اور اعمال کی درستگی اور انضباط کے لیے کافی نہیں؟ اگر اس نے وجدان کے ساتھ حواس بھی دیئے تاکہ وجدان کی لغزشوں میں نگرانی کریں، اور اگر حواس کے ساتھ عقل بھی دی تاکہ حواس کی

احکام و کلیات کا استنباط کرتی ہے۔

> ہر مرتبۂ ہدایت اپنی تصحیح و نگرانی میں بالاتر مرتبۂ ہدایت کا محتاج ہے

علاوہ بریں جس طرح وجدان کی نگرانی کے لیے حواس و مشاعر کی ضرورت تھی، اسی طرح حواس کی تصحیح و نگرانی کے لیے عقل کی ضرورت ہوئی۔ حواس کا ذریعۂ ادراک نہ صرف محدود ہی ہے، بلکہ بسا اوقات غلطی و گمراہی سے بھی محفوظ نہیں۔ ہم دُور سے ایک چیز دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ ایک سیاہ نقطے سے زیادہ حجم نہیں رکھتی، حالانکہ وہ ایک عظیم الشان گنبد ہوتا ہے۔ ہم بیماری کی حالت میں شہد جیسی میٹھی چیز چکھتے ہیں، لیکن ہمارا احاسّہ ذوق یقین دلاتا ہے کہ مزا کڑوا ہے۔ ہم تالاب میں ایک لکڑی کا عکس دیکھتے ہیں۔ لکڑی مستقیم ہوتی ہے، لیکن عکس میں ٹیڑھی دکھائی دیتی ہے۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی عارضے کی وجہ سے کان بجنے لگتے ہیں، اور ہمیں ایسی صدائیں سنائی دیتی ہیں جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں۔ اگر مرتبۂ حواس سے ایک بلند تر مرتبۂ ہدایت کا وجود نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ ہم حواس کی درماندگیوں میں حقیقت کا سُراغ پا سکتے، لیکن ان تمام حالتوں میں عقل کی ہدایت نمودار ہوتی ہے۔ وہ حواس کی درماندگیوں میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ وہ ہمیں بتاتی ہے کہ سورج ایک عظیم الشان کرّہ ہے۔ اگرچہ ہماری آنکھ اسے ایک سنہری تھال سے زیادہ محسوس نہیں کرتی۔ وہ ہمیں بتاتی ہے کہ شہد کا مزہ ہر حال میں میٹھا ہے، اور اگر ہمیں کڑوا محسوس ہوا ہے تو یہ اس لیے ہے کہ ہمارے منہ کا مزا بگڑ گیا ہے۔ اسی طرح وہ ہمیں بتلاتی ہے کہ بعض اوقات خشکی بڑھ جانے سے کان بجنے لگتے ہیں، اور اس حالت میں جو صدائیں سنائی دیتی ہیں، وہ خارج کی صدائیں نہیں ہوتیں، خود ہمارے ہی دماغ کی گونج ہوتی ہے۔

> ہدایتِ فطرت کا چوتھا مرتبہ

لیکن جس طرح وجدان کے بعد حواس کی ہدایت نمودار ہوئی کیونکہ وجدان کی ہدایت ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی اور جس طرح حواس کے بعد عقل کی ہدایت نمودار ہوئی۔ کیونکہ حواس کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی ٹھیک اسی طرح ہم محسوس

ان آیات اور ان کے ہم معنی آیات میں حواس اور مشاعر اور عقل و فکر کی ہدایت کی طرف اشارات کیے گئے ہیں، لیکن وہ تمام مقامات جہاں انسان کی روحانی سعادت و شقاوت کا ذکر کیا گیا ہے، وحی و نبوت کی ہدایت سے متعلق ہیں۔ مثلاً

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى (۹۲:۱۳)	بلاشبہ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم رہنمائی کریں، اور یقیناً آخرت اور دنیا، دونوں ہمارے ہی لیے ہیں)
وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (۴۱:۱۶)	اور باقی رہی قوم ثمود، تو اسے بھی ہم نے راہ (حق) دکھلا دی تھی، لیکن اس نے ہدایت کی راہ چھوڑ کر اندھے پن کا شیوہ پسند کیا۔
وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ (۲۹:۶۹)	اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں جانفشانی کی تو ضروری ہے کہ ہم بھی ان پر اپنی راہیں کھول دیں اور بلاشبہ اللہ ان لوگوں کا ساتھی ہے جو نیک عمل ہیں۔

اَلْهُدٰى

چنانچہ اس سلسلہ میں وہ اللہ کی ایک خاص ہدایت کا ذکر کرتا ہے اور اسے "الہدیٰ" کے نام سے پکارتا ہے یعنی الف لام تعریف کے ساتھ:

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۶:۷۱)	(اے پیغمبر! ان سے کہہ دو، یقیناً اللہ کی ہدایت تو "الہدیٰ" ہے اور ہم سب کو اسی بات کا حکم دیا گیا ہے کہ تمام جہانوں کے پروردگار کے آگے سر عبودیت جھکا دیں!

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) دل کہتے ہیں، بلکہ اس کا اطلاق عقل و فکر پر بھی ہوتا ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں سمع و بصر وغیرہ کے ساتھ قلب اور فواد کہا گیا ہے، اس سے مقصود جوہرِ عقل ہے ۱۲

غلطیوں میں قاضی و حاکم ہو، تو کیا ضروری نہ تھا کہ عقل کے ساتھ کچھ اور بھی دیتا، تاکہ عقل کی درماندگیوں میں رہنما اور فیصلہ کُن ہوتا۔

قرآن کہتا ہے کہ ضروری تھا، اور اسی لیے اللہ کی ربوبیت نے انسان کے لیے ایک چوتھے مرتبۂ ہدایت کا بھی سامان کر دیا۔ یہی مرتبۂ ہدایت ہے جسے وہ وحی و نبوت کی ہدایت سے تعبیر کرتا ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے جابجا ان مراتبِ ہدایت کا ذکر کیا ہے، اور انھیں ربوبیت الٰہی کی سب سے بڑی بخشش و رحمت قرار دیا ہے۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ	ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے پیدا کیا جسے
نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ	ایک کے بعد ایک مختلف حالتوں میں پلٹتے ہیں۔
فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا	پھر اسے ایسا بنا دیا کہ سننے والا دیکھنے والا وجود ہو گیا
اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا (۷۶:۳)	ہم نے اس پر راہِ عمل کھول دی۔ اب یہ اس کا کام ہے
شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝	کہ یا تو شکر کرنے والا ہو یا ناشکرا۔ یعنی یا تو خدا کی دی

ہوئی قوتیں ٹھیک ٹھیک کام میں لائے اور فلاح و سعادت کی راہ اختیار کرے، یا ان سے کام نہ لے

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝ وَ	کیا ہم نے اسے ایک چھوڑ دو دو آنکھیں نہیں دیدی
لِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۝ وَهَدَيْنٰهُ	ہیں، جن سے وہ دیکھتا ہے) اور زبان اور ہونٹ نہیں
النَّجْدَيْنِ ۝ (۹۰:۹)	دیئے ہیں (جو گویائی کا ذریعہ ہیں)؟ اور کیا اس کو ہم نے
	(سعادت و شقاوت کی) دونوں راہیں نہیں دکھا دیں؟
وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ	اور اللہ نے تمھارے لیے سننے اور دیکھنے کے حواس پیدا
وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝	کر دیئے اور سوچنے کے لیے دل (یعنی عقل)[1] تاکہ تم شکر گزار

[1] یاد رہے کہ عربی میں قلب اور فواد کے معنی محض اس عضو ہی کے نہیں جیسے اردو میں دل (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

وحدت دین کی اصلِ عظیم اور قرآنِ حکیم

یہ اصلِ عظیم قرآن کی دعوت کی سب سے پہلی بنیاد ہے، وہ جو کچھ بھی بتانا چاہتا ہے، تمام تر اسی اصل پر مبنی ہے۔ اگر اس اصل سے قطع نظر کر لی جائے تو اس کا تمام کارخانہ دعوت درہم برہم ہو جائے لیکن تاریخ عالم کے عجائب تصرفات میں سے یہ واقعہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ جس درجہ قرآن نے اس اصل پر زور دیا تھا، اتنا ہی یادِ دنیا کی نگاہوں نے اس سے اعراض کیا حتی کہ کہا جا سکتا ہے آج قرآن کی کوئی بھی بات دنیا کی نظروں سے اس درجہ پوشیدہ نہیں ہے جس قدر کہ یہ اصلِ عظیم۔ اگر ایک شخص ہر طرح کے خارجی اثرات سے خالی الذہن ہو کر قرآن کا مطالعہ کرے اور اس کے صفحات میں جا بجا اس اصلِ عظیم کے قطعی اور واضح اعلانات پڑھے اور پھر دنیا کی طرف نظر اٹھائے جو قرآن کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں سمجھتی کہ بہت سی مذہبی گروہ بندیوں کی طرح وہ بھی ایک مذہبی گروہ بندی ہے، تو یقیناً وہ حیران ہو کر پکار اٹھیگا، یا تو اس کی نگاہیں اسے دھوکہ دے رہی ہیں، یا دنیا ہمیشہ آنکھیں کھولے بغیر ہی اپنے فیصلے صادر کر دیا کرتی ہے۔

دین کی حقیقت اور قرآن کی تصریحات

اس حقیقت کی توضیح کے لیے ضروری ہے کہ ایک مرتبہ تفصیل کے ساتھ یہ بات واضح کر دی جائے کہ جہاں تک حق و نبوت کا یعنی دین کا تعلق ہے، قرآن کی دعوت کیا ہے اور کس راہ کی طرف نوعِ انسانی کو لے جانا چاہتی ہے۔؟

جمعیتِ بشری کی ابتدائی وحدت پھر اختلاف اور ہدایتِ وحی کا ظہور

اس باب میں قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے، اس کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

وہ کہتا ہے، ابتدا میں انسانی جمعیت کا یہ حال تھا کہ لوگ قدرتی زندگی بسر کرتے تھے اور ان میں نہ تو کسی طرح کا باہمی اختلاف تھا نہ کسی طرح کی مخاصمت، سب کی زندگی ایک ہی طرح کی تھی اور سب اپنی قدرتی یگانگت پر قانع تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ نسل انسانی کی کثرت اور ضروریات معیشت کی وسعت سے طرح طرح کے اختلافات پیدا ہو گئے۔ اور اختلافات لیے تفرقہ و انقطاع اور ظلم و فساد کی صورت

وَلَنْ تَرْضٰی عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَی اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰی ؕ (۲:۱۲۰)

اور (یاد رکھو) یہودی تم سے خوش ہونے والے نہیں جب تک کہ تم ان کی ملت کی پیروی نہ کرو اور یہی حال نصاریٰ کا ہے (اے پیغمبر) تم ان سے کہدو اللہ کی ہدایت کی راہ تو وہی ہے جو اَلْهُدٰی ہے (یعنی ہدایت کی حقیقی اور عالمگیر راہ)

یہ "اَلْهُدٰی" یعنی ہدایت کی ایک ہی اور حقیقی راہ کونسی ہے؟ قرآن کہتا ہے، وحی الٰہی کی عالمگیر ہدایت ہے جو اول دن سے دنیا میں موجود ہے، اور بلا تفریق و امتیاز تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ وہ کہتا ہے جس طرح خدا نے وجدان، حواس اور عقل کی ہدایتیں بخشیں تو نسل و قوم کا امتیاز رکھا نہ زمان و مکان کا۔ اسی طرح اس کی ہدایتِ وحی بھی ہر طرح کے تفرقہ و امتیاز سے پاک ہے۔ وہ سب کے لیے ہے اور سب کو دی گئی ہے۔ اور اس ایک ہدایت کے سوا اور جتنی ہدایتیں بھی انسانوں نے سمجھ رکھی ہیں، سب انسانی بناوٹ کی راہیں ہیں۔ خدا کی ٹھہرائی ہوئی راہ صرف یہی ایک راہ ہے۔

اسی لیے وہ ہدایت کی ان تمام صورتوں سے یک قلم انکار کرتا ہے جو اس اصل سے منحرف ہو کر طرح طرح کی مذہبی گروہ بندیوں اور متخالف ٹولیوں میں بٹ گئی ہیں۔ اور سعادت و نجات کی عالمگیر حقیقت خاص خاص گروہوں اور حلقوں کی میراث بنالی گئی ہے۔ وہ کہتا ہے انسانی بناوٹ کی یہ الگ الگ راہیں ہدایت کی راہ نہیں ہوسکتیں۔ ہدایت کی راہ تو وہی عالمگیر ہدایت کی راہ ہے۔ اسی عالمگیر ہدایتِ وحی کو وہ "الدِّین" کے نام سے پکارتا ہے یعنی نوعِ انسانی کے لیے حقیقی دین اور اسی کا نام اس کی زبان میں "الاِسْلَام" ہے۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴿۳۵ : ۲۴﴾ — اور کوئی قوم دنیا کی ایسی نہیں جس میں (بدعملیوں کے نتائج سے) متنبہ کرنے والا خدا کا کوئی رسول نہ گذرا ہو۔

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴿۱۳ : ۷﴾ — (اے پیغمبر) بلاشبہ تم اس کے سوا اور کیا ہو کہ (بدعملیوں کے نتائج سے) متنبہ کرنے والے ہو، اور دنیا میں ہر قوم کے لیے ایک ہدایت کرنے والا ہوا ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۰ : ۴۷﴾ — اور ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔ پس جب رسول ظاہر ہوتا ہے تو تمام باتوں کا انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔

نسلِ انسانی کے ابتدائی عہد اور خدا کے رسول

وہ کہتا ہے، نسلِ انسانی کے ابتدائی عہدوں میں کتنے ہی پیغمبر گذرے ہیں، جو یکے بعد دیگرے مبعوث ہوئے اور قوموں کو پیغامِ حق پہنچایا۔

وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ﴿۴۳ : ۶﴾ — اور کتنے ہی نبی ہیں جو ہم نے پہلوں میں (یعنی ابتدائی عہد کی قوموں میں) مبعوث کیے۔

عدلِ الٰہی اور بعثتِ رسل

وہ کہتا ہے، یہ بات عدلِ الٰہی کے خلاف ہے کہ ایک گروہ اپنے اعمالِ بد کے لیے جوابدہ ٹھہرایا جائے۔ حالانکہ اس کی ہدایت کے لیے کوئی رسول نہ بھیجا گیا ہو۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۷ : ۱۵﴾ — اور (ہمارا قانون یہ ہے کہ) جب تک ہم ایک پیغمبر مبعوث کر کے راہِ ہدایت دکھا نہ دیں اس وقت تک (پاداشِ عمل میں) عذاب دینے والے نہیں۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰىٓ اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۲۸ : ۵۹﴾ — اور (یاد رکھو) تمہارے پروردگار کا قانون یہ ہے کہ وہ کبھی انسان کی بستیوں کو (پاداشِ عمل میں) ہلاک نہیں کرتا جب تک کہ ان میں ایک پیغمبر مبعوث نہ کر دے اور وہ خدا کی آیتیں پڑھ کر نہ سنا دے۔ اور ہم کبھی بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہیں، مگر صرف اسی حالت میں کہ ان کے باشندوں نے ظلم کا شیوہ اختیار کر لیا ہو۔

اختیار کرلی۔ ہر گروہ دوسرے گروہ سے نفرت کرنے لگا۔ اور ہر زبردست زیر دست کے حقوق پامال کرنے لگا۔ جب یہ صورتِ حال پیدا ہوئی، تو ضروری ہوا کہ نوعِ انسانی کی ہدایت اور عقل وصداقت کے قیام کے لیے وحیِ الٰہی کی روشنی نمودار ہو۔ چنانچہ یہ روشنی نمودار ہوئی اور خدا کے رسولوں کی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ وہ ان تمام رہنماؤں کو جن کے ذریعے اس ہدایت کا سلسلہ قائم ہوا "رسول" کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ کیونکہ وہ خدا کی سچائی کا پیغام پہنچانے والے تھے۔ اور "رسول" کے معنی پیغام پہنچانے والے کے ہیں۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝ (۱۰: ۱۹)

اور ابتدا میں تمام انسانوں کا ایک ہی گروہ تھا (الگ الگ گروہوں میں متفرق نہ تھے) پھر ایسا ہوا کہ وہ باہم دگر مختلف ہو گئے اور اگر اس بارے میں تمہارے پروردگار نے پہلے سے فیصلہ نہ کر دیا ہوتا (یعنی یہ کہ انسانوں میں اختلاف ہوگا، اور مختلف راہیں لوگ اختیار کریں گے) تو جن باتوں میں لوگ اختلاف کرتے ہیں ان کا (یہیں دنیا میں) فیصلہ کر دیا جاتا

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ (۲: ۲۱۳)

ابتدا میں تمام انسان ایک ہی گروہ تھے۔ (پھر ان میں اختلاف پیدا ہوا) پس اللہ نے (یکے بعد دیگرے) نبیوں کو مبعوث کیا۔ وہ (نیک عملی کے نتائج کی) بشارت دیتے اور (بد عملی کے نتائج سے) متنبہ کرتے۔ نیز ان کے ساتھ الکتاب (یعنی وحیِ الٰہی سے لکھی جانے والی تعلیم) نازل کی تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے تھے، ان میں وہ فیصلہ کر دینے والی ہو۔

عمومِ ہدایت یہ ہدایت کسی خاص ملک، قوم یا عہد کے لیے مخصوص نہ تھی بلکہ تمام نوعِ انسانی کے لیے تھی، چنانچہ ہر زمانے اور ہر ملک میں، یکساں طور پر، اس کا ظہور ہوا۔ قرآن کہتا ہے، دنیا کا کوئی گوشہ نہیں جہاں نسلِ انسانی آباد ہوئی ہو اور خدا کا کوئی رسول مبعوث نہ ہوا ہو۔

کی پرستش کرنی، اور نیک عملی کی زندگی بسر کرنی۔ اس کے علاوہ اور اس کے خلاف جو کچھ بھی دین کے نام سے کہا جاتا ہے، دینِ حقیقی کی تعلیم نہیں ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ج (۱۶: ۳۸)	اور بلاشبہ ہم نے دنیا کی ہر قوم میں ایک پیغمبر مبعوث کیا (جس کی تعلیم یہ تھی) کہ اللہ کی عبادت کرو، اور طاغوت سے یعنی سرکش اور شریر قوتوں کے اغوا سے) اجتناب کرو
وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْہِ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنَ (۲۱: ۲۴)	اور (اے پیغمبر) ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول دنیا میں نہیں بھیجا، مگر اس وحی کے ساتھ، کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری ہی عبادت کرو!

سب نے ایک ہی دین پر اکٹھے رہنے اور تفرقہ و اختلاف سے بچنے کی تعلیم دی

وہ کہتا ہے، دنیا میں کوئی بانیٔ مذہب بھی ایسا نہیں ہوا ہے جس نے ایک ہی دین پر اکٹھے رہنے اور تفرقہ و اختلاف سے بچنے کی تعلیم نہ دی ہو۔ سب کی تعلیم یہی تھی کہ خدا کا دین بچھڑے ہوئے انسانوں کو جمع کر دینے کے لیے ہے۔ الگ الگ کر دینے کے لیے نہیں ہے۔ پس ایک پروردگارِ عالم کی بندگی و نیاز میں سب متحد ہو جاؤ اور تفرقہ و مخاصمت کی جگہ باہمی محبت و یک جہتی کی راہ اختیار کرو۔

وَاِنَّ ھٰذِہٖٓ اُمَّتُکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّاَنَا رَبُّکُمْ فَاتَّقُوْنِ (۲۳: ۵۲)	اور (دیکھو) یہ تمھاری امت فی الحقیقت ایک ہی امت ہے اور میں تم سب کا پروردگار ہوں، پس (میری عبودیت و نیاز کی راہ میں تم سب ایک ہو جاؤ اور) نافرمانی سے بچو۔

وہ کہتا ہے خدا نے تمھیں ایک ہی جامۂ انسانیت دیا تھا، لیکن تم نے طرح طرح کے بھیس اور نام اختیار کر لیے۔ اور رشتۂ انسانیت کی وحدت سینکڑوں ٹکڑوں میں بکھر گئی۔ تمھاری نسلیں بہت سی ہیں، اس لیے تم نسل کے نام پر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے ہو۔ تمھارے وطن بہت سے بن گئے ہیں۔ اسلیے اختلافِ وطن کے نام پر ایک دوسرے سے لڑ رہے ہو۔ تمھاری قومیتیں بےشمار ہیں اسلیے

بعض رسولوں کا ذکر کیا گیا بعض کا نہیں کیا گیا

خدا کے ان رسولوں اور دین الٰہی کے داعیوں میں سے بعض کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے، بعض کا نہیں کیا گیا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ اور (اے پیغمبر) ہم نے تم سے پہلے کتنے ہی پیغمبر مبعوث کئے

مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن کے حالات تمھیں سنائے ہیں کچھ ایسے ہیں

مَنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (۴۰: ۷۸) جن کے حالات نہیں سنائے (یعنی قرآن میں ان کا ذکر نہیں کیا گیا)

بے شمار قومیں اور بے شمار رسول

قوم نوح اور عاد و ثمود کے بعد کتنی ہی قومیں گذر چکی ہیں، اور ان میں کتنے ہی رسول مبعوث ہو چکے ہیں جن کا ٹھیک ٹھیک حال اللہ ہی کو معلوم ہے۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ تم سے پہلے جو قومیں گذر چکی ہیں، کیا تم تک ان

قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۛ وَالَّذِيْنَ کی خبر نہیں پہنچی ہے؟ قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود،

مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ اور وہ قومیں جو ان کے بعد ہوئیں جن کی ٹھیک

جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا ٹھیک ٹھیک تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے۔ ان سب

اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ (۱۴: ۱۹) میں ان کے پیغمبر سچائی کی روشنیوں کے ساتھ

مبعوث ہوئے مگر انھوں نے جہل و سرکشی سے ان کی تعلیم انھی پر لوٹا دی اور کان دھرنے سے انکار کر دیا۔

ہدایت ہمیشہ ایک ہی رہی اور وہ ایمان اور عمل صالح کی دعوت کے سوا کچھ نہ تھی

فطرتِ الٰہی کی راہ کائناتِ ہستی کے ہر گوشے میں ایک ہی ہے وہ نہ تو ایک سے زیادہ ہو سکتی ہے، نہ باہم دگر مختلف۔ پس ضروری تھا کہ یہ ہدایت بھی اول دن سے ایک ہی ہوتی، اور ایک ہی طرح پر تمام انسانوں کو مخاطب کرتی چنانچہ قرآن کہتا ہے، خدا کے جتنے پیغامبر پیدا ہوئے، خواہ وہ کسی زمانے اور کسی گوشے میں ہوئے ہوں، سب کی راہ ایک ہی تھی، اور سب خدا کے ایک ہی عالمگیر قانونِ سعادت کی تعلیم دینے والے تھے۔ یہ عالمگیر قانونِ سعادت کیا ہے؟ ایمان اور عملِ صالح کا قانون ہے، یعنی ایک پروردگارِ عالم

نُوحًا وَّالَّذِیٓ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡكَ وَمَا وَصَّیۡنَا بِهٖۤ اِبۡرٰهِیۡمَ وَمُوۡسٰی وَعِیۡسٰۤی اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡهِ (۴۲ : ۱۳)

راہ قرار دی ہے جس کی وصیت نوح کو کی گئی تھی، اور جس پر چلنے کا حکم ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا تھا۔ (ان سب کی تعلیم یہی تھی کہ) کہ الدّین (یعنی خدا کا ایک ہی دین) قائم رکھو اور اس راہ میں الگ الگ نہ ہو جاؤ۔

قرآن کی تحدّی کہ اس حقیقت کے خلاف کوئی مذہبی تعلیم اور روایت نہیں پیش کی جا سکتی ہے

اسی بنا پر وہ بطور ایک دلیل کے اس بات پر زور دیتا ہے کہ اگر تمہیں میری تعلیم کی سچائی سے انکار ہے تو کسی مذہب کی الہامی کتاب سے بھی ثابت کر دکھاؤ کہ دینِ حقیقی کی راہ اس کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتی ہے۔ تم جس مذہب کی بھی حقیقی تعلیم دیکھو گے، اصل و بنیاد یہی ملے گی۔

قُلۡ هَاتُوۡا بُرۡهَانَكُمۡ ۚ هٰذَا ذِكۡرُ مَنۡ مَّعِیَ وَذِكۡرُ مَنۡ قَبۡلِیۡ ؕ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ الۡحَقَّ فَهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ۝ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِیۡۤ اِلَیۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ (۲۱ : ۲۴ : ۲۵)

(اے پیغمبر! ان سے) کہہ دو (اگر تمہیں میری تعلیم سے انکار ہے تو) اپنی دلیل پیش کرو۔ یہ تعلیم موجود ہے جن پر میرے ساتھی یقین رکھتے ہیں۔ اور اسی طرح وہ تمام تعلیمیں بھی موجود ہیں جو مجھ سے پہلے قوموں کو دی گئیں۔ (تم ثابت کر دکھاؤ کسی نے بھی میری تعلیم کے خلاف تعلیم دی ہو؟ اصل یہ ہے کہ ان (منکرین حق) میں اکثر آدمی ایسے ہیں جنہیں سرے سے امرِ حق کی خبر ہی نہیں، اور اس لیے حقیقت کی طرف سے گردن موڑے ہوئے ہیں۔ (اے پیغمبر! یقین کر) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر بھی ایسا نہیں بھیجا جسے اس بات کے سوا کوئی دوسری بات بتلائی گئی ہو کہ "میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری ہی عبادت کرو۔"

اتنا ہی نہیں، بلکہ وہ کہتا ہے، علم و بصیرت کے کسی قول اور روایت سے تم ثابت کر دکھاؤ کہ جو کچھ میں بتلا رہا ہوں، یہی تمام پچھلی دعوتوں کی تعلیم نہیں رہی ہے:

ہر قوم دوسری قوم سے دست وگریبان ہو رہی ہے۔ تمھارے رنگ یکساں نہیں، اور یہ بھی باہمی نفرت وعناد کا ایک بڑا ذریعہ بن گیا ہے، تمھاری بولیاں مختلف ہیں اور یہ بھی ایک دوسرے سے جدا رہنے کی بہت بڑی حجت بن گئی ہے۔ پھر ان کے علاوہ امیر و فقیر، نوکر و آقا، وضیع و شریف، ضعیف و قوی، ادنیٰ و اعلیٰ بے شمار اختلاف پیدا کر لیے گئے ہیں، اور سب کا منشاء یہی ہے کہ ایک دوسرے سے جدا ہو جاؤ، اور ایک دوسرے سے نفرت کرتے رہو۔ ایسی حالت میں بتلاؤ، وہ رشتہ کونسا رشتہ ہے جو اتنے اختلافات رکھنے پر بھی انسانوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دے، اور انسانیت کا بچھڑا ہوا گھرانا پھر از سر نو آباد ہو جائے؟ وہ کہتا ہے، صرف ایک ہی رشتہ باقی رہ گیا ہے، اور وہ خدا پرستی کا مقدس رشتہ ہے۔ تم کتنے ہی الگ الگ ہو گئے ہو، لیکن تمھارے خدا الگ الگ نہیں ہو جا سکتے۔ تم سب ایک ہی پروردگار کے بندے ہو، تم سب کی بندگی و نیاز کے لیے ایک ہی معبود کی چوکھٹ ہے، تم بے شمار اختلافات رکھنے پر بھی ایک ہی رشتۂ عبودیت میں جکڑے ہوئے ہو، تمھاری کوئی نسل ہو، تمھارا کوئی وطن ہو، تمھاری کوئی قومیت ہو، تم کسی درجے میں اور کسی حلقے کے انسان ہو لیکن جب ایک ہی پروردگار کے آگے سرِ نیاز جھکا دوگے، تو یہ آسمانی رشتہ تمھارے تمام ارضی اختلافات مٹا دے گا، تم سب کے بچھڑے ہوئے دل ایک دوسرے سے جڑ جائیں گے۔ تم محسوس کروگے کہ دنیا تمھارا وطن ہے، تمام نسلِ انسانی تمھارا گھرانا اور تم سب ایک ہی ربّ العٰلمین کی عیال ہو۔

چنانچہ وہ کہتا ہے، خدا کے جتنے رسول بھی پیدا ہوئے، سب کی تعلیم یہی تھی کہ "الدّین" یعنی بنی نوعِ انسانی کے ایک ہی عالمگیر دین پر قائم رہو، اور اس راہ میں ایک دوسرے سے الگ الگ نہ ہو جاؤ!

شَرَعَ لَكُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا وَصّٰى بِهٖ — اور (دیکھو) اس نے تمھارے لیے دین کی وہی

عہدوں کی ہدایتوں اور رسالتوں کا تذکرہ ہے۔ وہ ان کی یکسانی، ہم آہنگی، اور وحدتِ تعلیم سے مذہبی صداقت کے تمام مقاصد پر استشہاد کرتا ہے۔

"الدّین" اور "الشّرع"

ادیان کا اختلاف اچھا، اگر تمام نوع انسانی کے لیے دین ایک ہی ہے، اور تمام بانیانِ مذاہب نے ایک ہی اصل و قانون کی تعلیم دی ہے، تو پھر مذاہب میں اختلاف کیوں ہوا؟ کیوں تمام مذاہب ہی طرح کے احکام، ایک ہی طرح کے اعمال، ایک ہی طرح کے رسوم و ظواہر نہ ہوئے؟ کسی مذہب میں عبادت کی ایک خاص شکل اختیار کی گئی ہے، کسی میں دوسری۔ کسی مذہب کے ماننے والے ایک طرف منہ کر کے عبادت کرتے ہیں، کسی مذہب کے ماننے والے دوسری طرف۔ کسی کے ہاں احکام و قوانین ایک خاص طرح کی نوعیت کے ہیں، کسی کے ہاں دوسری طرح کے۔

اختلاف دین میں نہیں ہوا، شرع و منہاج میں ہوا اور یہ ناگزیر تھا قرآن کہتا ہے، مذاہب کا اختلاف دو طرح کا ہے۔ ایک اختلاف تو وہ ہے جو پیروان مذاہب نے مذہب کی حقیقی تعلیم سے منحرف ہو کر پیدا کر لیا ہے۔ یہ اختلاف مذہب کا اختلاف نہیں ہے۔ پیروان مذہب کی گمراہی کا نتیجہ ہے۔ دوسرا اختلاف وہ ہے جو فی الحقیقت مذاہب کے احکام و اعمال میں پایا جاتا ہے مثلاً ایک مذہب میں عبادت کی کوئی خاص شکل اختیار کی گئی ہے، دوسرے میں کوئی دوسری شکل تو یہ اختلاف اصل و حقیقت کا اختلاف نہیں ہے۔ محض فروع و ظواہر کا اختلاف ہے، اور ضروری تھا کہ ظہور میں آتا۔

وہ کہتا ہے، مذاہب کی تعلیم دو قسم کی باتوں سے مرکب ہے۔ ایک قسم تو وہ ہے جو ان کی روح و حقیقت ہے، دوسری وہ ہے جن سے ان کی ظاہری شکل و صورت آراستہ کی گئی ہے۔ پہلی چیز اصل ہے، دوسری

اِئْتُوْنِیْ بِکِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ ھٰذَآ اَوْ اَثٰرَۃٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۴۶: ۴﴾ اگر تم اپنے انکار میں سچے ہو، تو ثبوت میں کوئی کتاب پیش کرو جو اس سے پہلے نازل ہوئی ہو، یا کم از کم علم و بصیرت کی کوئی پچھلی روایت ہی لا دکھاؤ جو تمہارے پاس موجود ہو!

تمام مقدس کتابوں کی باہم دگر تصدیق اور اس سے قرآن کا استدلال

اسی بنا پر، وہ تمام مذاہب عالم کی باہم دگر تصدیق کو بھی بطور ایک دلیل کے پیش کرتا ہے، یعنی وہ کہتا ہے ان میں سے ہر تعلیم دوسری تعلیم کی تصدیق کرتی ہے، جھٹلاتی نہیں، اور جب ہر تعلیم دوسری تعلیم کی تصدیق کرتی ہے، تو اس سے معلوم ہوا، ان تمام تعلیمات کے اندر کوئی ایک ہی ثابت و قائم حقیقت ضرور کام کر رہی ہے، کیونکہ اگر مختلف وقتوں، مختلف گوشوں، مختلف قوموں، مختلف ناموں، مختلف پیرایوں اور مختلف زبانوں سے کوئی بات کہی گئی ہو، اور باوجود ان تمام اختلافات کے بات ہمیشہ ایک ہی ہو، اور ایک ہی مقصد پر زور دیتی ہو، تو قدرتی طور پر تمہیں ماننا پڑیگا کہ ایسی بات اصلیت سے خالی نہیں ہو سکتی!

نَزَّلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىۃَ وَالْاِنْجِیْلَ ﴿ مِنْ قَبْلُ ھُدًى لِّلنَّاسِ ﴿۳: ۲﴾ (اے پیغمبر!) اللہ نے تم پر یہ کتاب سچائی کے ساتھ نازل کی ہے، جو ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں، اور اسی طرح لوگوں کی ہدایت کیلئے اُس نے تورات اور انجیل نازل کی تھی

وَاٰتَیْنٰہُ الْاِنْجِیْلَ فِیْہِ ھُدًى وَّنُوْرٌ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ مِنَ التَّوْرٰىۃِ ﴿۵: ۴۷﴾ اور ہم نے عیسیٰ کو انجیل عطا کی۔ اس میں انسان کے لیے ہدایت اور روشنی ہے، اور اس سے پہلے جو تورات نازل ہو چکی تھی، وہ اس کی تصدیق کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، اس کے بیان و موعظت کا ایک بڑا موضوع پچھلے

تحویلِ قبلہ کا معاملہ اور قرآن کا اعلانِ حنیفت

جب تحویلِ قبلہ کا معاملہ پیش آیا۔ یعنی پیغمبر اسلام (صلعم) بیت المقدس کی جگہ خانۂ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے لگے، تو یہ بات یہودیوں اور عیسائیوں پر بہت شاق گذری۔ ان کے نزدیک مذہب کا تمام دار و مدار اسی طرح کی ظاہری اور فرعی باتوں پر تھا۔ اور انہی کو وہ حق و باطل کا معیار سمجھتے تھے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں، قرآن نے اس معاملہ کو بالکل دوسری ہی نظر سے دیکھا ہے۔ وہ کہتا ہے، تم اس طرح کی باتوں کو اس قدر اہمیت کیوں دیتے ہو؟ یہ نہ تو حق و باطل کا معیار ہیں، نہ مذہب کی اصل و حقیقت میں انھیں کوئی دخل ہے۔ ہر مذہب نے اپنے اپنے حالات و مقتضیات کے مطابق کوئی ایک طریقۂ عبادت کا اختیار کر لیا تھا، اور اس پر لوگ کاربند ہو گئے۔ مقصودِ اصلی سب کا ایک ہی ہے، اور وہ خدا پرستی اور نیک عملی ہے۔ پس جو شخص سچائی کا طلبگار ہے، اسے چاہیئے کہ اصل مقصود پر نظر رکھے، اور اسی کے لحاظ سے ہر بات کو جانچے پرکھے۔ ان باتوں کو حق و باطل کا معیار نہ بنا لے۔

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا		اور (دیکھو) ہر گروہ کے لیے کوئی نہ کوئی سمت ہے جس کی طرف
فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ أَيْنَ مَا		عبادت کرتے ہوئے، وہ اپنا منہ کر لیتا ہے۔ پس (اس معاملہ کو
تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيعًا	(۲: ۱۴۸)	اس قدر طول نہ دو) نیکی کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے
إِنَّ اللّٰهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ		بڑھ جانے کی کوشش کرو (کہ اصلی کام یہی ہے)، تم کسی جگہ بھی

ہو، اللہ تم سب کو پا لے گا۔ یقیناً اللہ کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں!

قرآن کے نزدیک دین کے اعتقاد و عمل کی اصلی باتیں کیا کیا ہیں؟

پھر اسی صورت میں آگے چل کر صاف صاف لفظوں میں واضح کر دیا ہے کہ اصلِ دین کیا ہے؟ اور کن باتوں سے ایک انسان دین کی سعادت و فلاح حاصل کر سکتا ہے؟ وہ کہتا ہے، دین محض اس طرح کی باتوں میں نہیں دھرا ہے کہ ایک شخص نے عبادت کے وقت پچھم کی طرف منہ کر لیا، یا پورب کی طرف۔ اصل دین تو یہ ہے

فرع ہے۔ پہلی چیز کو وہ "دین" سے تعبیر کرتا ہے۔ دوسری کو "شرع" اور "نسک" سے اور اس کے لیے "منہاج" کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ "شرع" اور "منہاج" کے معنی راہ کے ہیں، اور "نسک" سے مقصود عبادت کا طور طریقہ ہے۔ پھر اصطلاح میں "شرع" قانونِ مذہب کو کہنے لگے۔ اور "نسک" عبادت کو۔ وہ کہتا ہے، مذاہب میں جس قدر بھی اختلاف ان کا اصلی اختلاف ہے، وہ "دین" کا اختلاف نہیں محض شرع و منہاج کا اختلاف ہے، یعنی اصل کا نہیں ہے، فرع کا ہے، حقیقت کا نہیں ہے، ظواہر کا ہے۔ روح کا نہیں ہے، صورت کا ہے، اور ضروری تھا کہ یہ اختلاف ظہور میں آتا۔ مذہب کا مقصود انسانی جمعیت کی سعادت و اصلاح ہے، لیکن انسانی جمعیت کے احوال و ظروف ہر عہد اور ہر ملک میں یکساں نہیں رہے ہیں، اور نہ یکساں رہ سکتے تھے۔ کسی زمانے کی معاشرتی اور ذہنی استعداد ایک خاص طرح کی نوعیت رکھتی تھی۔ کسی زمانے ایک خاص طرح کی۔ کسی ملک کے حالات ایک خاص طرح کی معیشت چاہتے تھے، کسی دوسرے ملک کے حالات دوسری طرح کی۔ پس جس مذہب کا ظہور جیسے زمانے میں اور جیسی استعداد و طبیعت کے لوگوں میں ہوا، اسی کے مطابق شرع و منہاج کی صورت بھی اختیار کی گئی۔ جس عہد اور جس ملک میں جو صورت اختیار کی گئی، وہی اس کے لیے موزوں تھی۔ اس لیے ہر صورت اپنی جگہ بہتر اور حق ہے، اور یہ اختلاف اس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، جتنی اہمیت نوعِ بشری کے تمام معاشرتی اور طبیعی اختلافات کو دی جا سکتی ہے۔

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ	(اے پیغمبر!) ہم نے ہر گروہ کے لیے عبادت
نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ	کا ایک خاص طور طریقہ ٹھہرا دیا ہے، جس راہ پر وہ
وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ إِنَّكَ لَعَلَىٰ	چلتا ہے پس لوگوں کو چاہیے، اس معاملے میں تم
هُدًى مُّسْتَقِيمٍ (۲۲ : ۶۷)	سے جھگڑا نہ کریں۔ تم لوگوں کو اپنے پروردگار کی

طرف دعوت دو۔ یقیناً تم ہدایت کے سیدھے راستے پر گامزن ہو۔

ہے: اِنَّا اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ۔ پھر حضرت مسیح کے ظہور کا ذکر کیا جاتا ہے:
ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ۔ حضرت مسیحؑ کے بعد پیغمبر اسلام کا ظہور ہوا:
وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ پھر ان مختلف دعوتوں کے ذکر کے بعد وہ لوگوں کو مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ (۵ : ۴۸)	ہم نے تم میں سے ہر ایک لیے (یعنی ہر دعوت کے پیروؤں کے لیے) ایک خاص شریعت اور راہ ٹھہرا دی۔ اگر اللہ چاہتا، تو (شریعتوں کا کوئی اختلاف نہ ہوتا) تم سب کو ایک امت بنا دیتا، لیکن یہ اختلاف اس لیے ہوا کہ (ہر وقت و حالت کے مطابق) تمھیں جو احکام دیئے گئے ہیں، ان میں تمھاری آزمائش کرے۔ پس (اس اختلاف کے پیچھے نہ پڑو) نیکی کی راہوں میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرو۔

پیروانِ مذاہب نے دین کی وحدت بھلا دی اور شرع کے اختلاف کو بناءِ نزاع بنا لیا

اس آیت پر سرسری نظر ڈال کر آگے نہ بڑھ جاؤ۔ بلکہ اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرو۔ قرآن کا جب ظہور ہوا تو دنیا کا یہ حال تھا کہ تمام پیروانِ مذاہب مذہب کو صرف اس کے ظواہر و رسوم ہی میں دیکھتے تھے۔ اور مذہبی اعتقاد کا تمام جوش و خروش اسی طرح کی باتوں میں سمٹ آیا تھا۔ ہر گروہ یقین کرتا تھا کہ دوسرا گروہ نجات سے محروم ہے۔ کیونکہ وہ دیکھتا تھا، دوسرے کے اعمال و رسوم ویسے نہیں ہیں جیسے خود اس نے اختیار کر رکھے ہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ نہیں، یہ اعمال و رسوم نہ تو دین کی اصل و حقیقت ہیں، نہ ان کا اختلاف حق و باطل

کہ دیکھا جائے، خدا پرستی اور نیک عملی کے لحاظ سے ایک انسان کا کیا حال ہے۔ پھر تفصیل کے ساتھ بتلایا ہے کہ خدا پرستی اور نیک عملی کی باتیں کیا کیا ہیں؟

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ	اور (دیکھو) نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے (عبادت کے
قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ	وقت) اپنا منہ پورب کی طرف اور پچھم کی طرف کر لیا
الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ	یا اسی طرح کی کوئی دوسری بات ظاہری رسم اور ڈھنگ کی
وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ	کر لی) نیکی کی راہ تو اس کی راہ ہے جو اللہ پر، آخرت کے
وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي	دن پر، ملائکہ پر، تمام کتابوں پر، اور تمام نبیوں پر ایمان
الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ	لاتا ہے۔ اپنا مال خدا کی محبت کی راہ میں، رشتہ داروں
وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَ	یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سائلوں کو دیتا ہے
فِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ	اور غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کرتا ہے۔ نماز قائم
وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ	کرتا ہے، زکوٰۃ ادا کرتا ہے، قول و قرار کا پکا ہوتا
اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ	ہے تنگی اور مصیبت کی گھڑی ہو، یا خوف و ہراس کا
فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ	وقت، ہر حال میں ثابت قدم رہتا ہے (سو یاد رکھو)
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۚ وَاُولٰٓئِكَ	ایسے ہی لوگ ہیں (جو اپنی دینداری میں) سچے ہیں،
هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (۲ : ۱۷۷)	اور یہی ہیں جو برائیوں سے بچنے والے ہیں۔

جس کتاب میں تیرہ سو برس سے یہ آیت موجود ہے، اگر دنیا اس کی دعوت کا مقصد اصلی نہیں سمجھ سکتی، تو پھر کون سی بات ہے جسے دنیا سمجھ سکتی ہے؟

خدا کی حکمت اسی کی مقتضی ہوئی کہ اختلاف شرائع ظہور میں آئے

سورۂ مائدہ میں ہم دیکھتے ہیں، ایک خاص ترتیب کے ساتھ مختلف دعوتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ذکر حضرت موسیٰ اور تورات سے شروع ہوتا

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جہاں کہیں قرآن نے اس بات پر زور دیا ہو کہ اگر خدا چاہتا تو تمام انسان ایک ہی راہ پر جمع ہو جاتے" یا ایک ہی قوم بن جاتے" جیسا کہ آیت مندرجہ صدر میں ہے، تو ان سب سے مقصود اسی حقیقت کا اظہار ہے۔ وہ چاہتا ہے، یہ بات لوگوں کے دلوں میں اُتار دے کہ فکر و عمل کا اختلاف طبیعتِ بشری کا قدرتی خاصہ ہے۔ اور جس طرح ہر گوشے میں موجود ہے، اسی طرح مذہب کے معاملے میں بھی موجود ہے۔ پس اس اختلاف کو حق و باطل کا معیار نہیں سمجھنا چاہیئے۔ وہ کہتا ہے، جب خدا نے انسان کی طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ ہر انسان ہر قوم ہر عہد، اپنی اپنی سمجھ، اپنی اپنی پسند اور اپنا طور طریقہ رکھتا ہے، اور ممکن نہیں کسی ایک چھوٹی سے چھوٹی بات میں بھی تمام انسانوں کی طبیعت ایک طرح کی ہو جائے۔ تو پھر کیونکر ممکن تھا کہ مذہبی اعمال و رسوم کی راہیں مختلف نہ ہوتیں۔ اور سب ایک ہی طرح کی وضع و حالت اختیار کر لیتے؟ یہاں بھی اختلاف ہونا تھا۔ اور اختلاف ہوا کسی نے ایک طریقے سے اصل مقصود حاصل کرنا چاہا، کسی نے دوسرے طریقے سے، لیکن اصل مقصود یعنی خدا پرستی اور نیک عملی کی تعلیم تو اس میں سب متفق رہے پس جب اصل مقصود سب کا ایک ہے تو محض ظواہر و اعمال کے اختلاف سے کیوں ایک دوسرے کے مخالف و معاند نہ ہو جائیں؟ کیوں ہر گروہ دوسرے گروہ کو جھٹلائے؟ کیوں مذہبی سچائی کسی ایک ہی نسل و گروہ کی میراث سمجھ لی جائے؟

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ شریعتوں کے اس اختلاف ہی کے لیے نہیں، بلکہ فکر و عمل کے ہر اختلاف کے لیے رواداری اور وسعت نظر کی تعلیم دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جو لوگ اس کی دعوت کے خلاف جبر و تشدد کام میں لا رہے تھے، ان کی طرف سے بھی اسے معذرت کرنے میں تامّل نہیں ایک موقع پر خود پیغمبر اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے، تم جوشِ دعوت میں چاہتے ہو کہ ہر انسان کو راہِ حقیقت دکھا دو، لیکن تمھیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے کہ اختلاف فکر و عمل طبیعت انسانی کا قدرتی خاصہ ہے۔ تم بہ جبر کسی کے اندر ایک بات نہیں اتار دے سکتے:

کا اختلاف ہی۔ یہ محض مذہب کی عملی زندگی کا ظاہری ڈھانچا ہے، مگر روح و حقیقت ان سے بالاتر ہے اور وہی اصل دین ہے۔ یہ اصل دین کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی یہ کسی ایک گروہ ہی کی میراث نہیں ہے کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے، اور چونکہ یہ اصل دین ہے، اس لیے نہ تو اس میں تغیر ہوا، نہ کسی کا اختلاف رونما ہوا۔ اعمال و رسوم فرع ہیں، اس لیے ہر زمانے اور ہر ملک کی حالت کے مطابق بدلتے رہے، اور جس قدر بھی اختلاف ہوا، انھیں میں ہوا

پھر وہ کہتا ہے، اعمال و رسوم کے اس اختلاف کو تم اس قدر اہمیت کیوں دے رہے ہو؟ خدا نے ہر زمانے اور ہر ملک کے لیے ایک خاص طرح کا طور طریقہ ٹھہرا دیا تھا جو اس کی حالت اور ضرورت کے مطابق مناسب تھا اور وہ اس پر کاربند ہو گیا۔ اگر خدا چاہتا تو تمام نوع انسانی کو ایک ہی قوم و جماعت بنا دیتا، اور فکر و عمل کا کوئی اختلاف وجود میں ہی نہ آتا، لیکن معلوم ہے کہ خدا نے ایسا نہیں چاہا۔ اس کی حکمت کا مقتضا یہی ہوا کہ فکر و عمل کی مختلف حالتیں پیدا ہوں۔ پس اس اختلاف کو حق و باطل کا اختلاف کیوں بنا لیا جائے؟ کیوں اس اختلاف بنا پر ایک جماعت دوسری جماعت سے برسرِ پیکار رہے؟ اصل چیز جس پر تمام تر توجہ مبذول کرنی چاہیے "خیرات" ہے۔ یعنی نیکی کے کام ہیں۔ اور تمام اعمال و رسوم بھی انہی کے لیے ہیں۔

غور کرو۔ اس آیت میں لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا کہا یعنی تم میں سے ہر جماعت کے لیے ہم نے ایک "شرع" اور "منہاج" ٹھہرا دی۔ یہ نہیں کہا کہ ایک "دین" ٹھہرا دیا کیونکہ دین تو سب کے لیے ایک ہی ہے۔ اس میں تعدّد اور تنوّع نہیں ہو سکتا۔ البتہ شرع و منہاج سب کے لیے یکساں نہیں ہو سکتے۔ ضروری تھا کہ ہر عہد اور ہر ملک کے احوال و ظروف کے مطابق مختلف ہوں۔ پس مذاہب کا اختلاف اصل کا اختلاف نہیں ہوا، محض فرع کا اختلاف ہوا۔

وہ کہتا ہے، اس لیے کہ اگرچہ تمام مذاہب سچے ہیں، لیکن تمام مذاہب کے پیرو سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ سب کو ان کی گم شدہ سچائی پر از سرِ نو جمع کر دیا جائے اس سلسلہ میں اس نے پیروانِ مذاہب کی تمام گمراہیاں ایک ایک کر کے گنائی ہیں وہ اعتقادی اور عملی دونوں طرح کی ہیں۔ من جملہ ان کے ایک سب سے بڑی گمراہی جس پر جا بجا زور دیتا ہے، وہ ہے جسے اس نے "تشیّع" اور "تحزّب" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ عربی میں "تشیّع" اور "تحزّب" کے معنی یہ ہیں کہ الگ الگ جتھے بنا لینا، اور ان میں ایسی روح کا پیدا ہو جانا جسے اردو میں گروہ پرستی کی روح سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ٥ (۶: ۱۶۰)	جن لوگوں نے اپنے ایک ہی دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور الگ الگ گروہ بندیوں میں بٹ گئے، تمہیں ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کا معاملہ خدا کے حوالے ہے۔ جیسے کچھ ان کے عمل رہے ہیں
فَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ٥ (۲۳: ۵۳)	پھر لوگوں نے ایک دوسرے سے کٹ کر جدا جدا دین بنا لیے۔ ہر ٹولی کے پلّے جو کچھ پڑ گیا ہے، اسی میں مگن ہے۔

تشیّع اور تحزّب کی حقیقت

"تشیّع" اور "تحزّب" کی گمراہی سے کیا مقصود ہے، اسے پوری وضاحت کے ساتھ سمجھ لینا چاہیئے۔ وہ کہتا ہے، خدا کے ٹھہرائے ہوئے دین کی حقیقت تو یہ تھی کہ نوعِ انسانی پر خدا پرستی اور نیک عملی کی راہ کھولتا تھا۔ یعنی خدا کے اس قانون کا اعلان کرتا تھا کہ دنیا کی ہر چیز کی طرح انسانی افکار و اعمال کے بھی خواص و نتائج ہیں۔ اچھے فکر و عمل کا بدلہ اچھا ہے برے فکر و عمل کا بدلہ برا ہے، لیکن لوگوں نے یہ حقیقت فراموش کر دی اور دین و مذہب کو نسلو

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا ۚ أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (١٠ : ٩٩)

اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو زمین میں جتنے انسان ہیں، سب ایمان لے آتے (لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ اس کی حکمت کا فیصلہ یہی ہوا کہ ہر انسان اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی راہ رکھے) پھر کیا تم چاہتے

وہ کہتا ہے، انسان کی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ ہر جماعت کو اپنا ہی طور طریقہ اچھا دکھائی دیتا ہے، وہ اپنی باتوں کو دوسروں کی مخالفانہ نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ جس طرح تمہاری نظر میں سب سے بہتر راہ تمہاری ہے، ٹھیک اسی طرح دوسروں کی نظر میں سب سے بہتر راہ ان کی ہے، پس اس کے سوا چارہ نہیں کہ اس بارے میں تحمّل اور رواداری اپنے اندر پیدا کرو۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ مَرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (٦ : ١٠٨)

اور (دیکھو) جو لوگ خدا کو چھوڑ کر دوسرے معبودوں کو پکارتے ہیں، تم ان پر سبّ و شتم نہ کرو۔ کیونکہ نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ لوگ بھی از راہ جہل و نادانی خدا کو برا بھلا کہنے لگیں گے۔ (یاد رکھو) ہم نے انسان کی طبیعت ہی ایسی بنا دی ہے کہ ہر گروہ کو اپنا ہی عمل اچھا دکھائی دیتا ہے

"تشیّع" اور "تحزّب" کی گمراہی اور تجدید دعوت کی ضرورت

اچھا، جب تمام مذاہب کا اصل مقصد ایک ہی، اور سب کی بنیاد سچائی پر ہے تو پھر قرآن کے ظہور کی ضرورت کیا تھی؟

گئے ہیں، اصلیت سے انحراف کا نتیجہ ہیں۔

یہودیت اور نصرانیت کی گروہ بندی اور اس کا رد

چنانچہ آیاتِ مندرجۂ صدر کے علاوہ حسب ذیل آیات میں بھی اسی حقیقت پر زور دیا گیا ہے:

وَقَالُوا لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا	اور یہود اور نصاریٰ نے کہا "جنت میں کوئی انسان
مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ	داخل نہیں ہو سکتا، جب تک یہود اور نصاریٰ نہ
تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوا	ہو (یعنی جب تک یہودیت اور نصرانیت کی
بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ	گروہ بندیوں میں داخل نہ ہو) یہ ان لوگوں کی
بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ	(جاہلانہ) امنگیں ہیں۔ (اے پیغمبر!) ان سے کہہ
وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ	دو اگر تم (اس زعم باطل میں) سچے ہو تو بتاؤ
عِندَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ	تمہاری دلیل کیا ہے؟ (ہاں بلاشبہ نجات کی راہ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○ (۲: ۱۱۲)	کھلی ہوئی ہے، مگر وہ کسی خاص گروہ بندی کی راہ

نہیں ہو سکتی۔ وہ تو ایمان و عمل کی راہ ہے) جس کسی نے بھی خدا کے آگے سر جھکا دیا، اور وہ نیک عمل بھی ہوا تو (خواہ یہودی اور نصرانی ہو، خواہ کوئی ہو) وہ اپنے پروردگار سے اپنا اجر ... پائے گا۔ اس کے لئے نہ تو کسی طرح کا کھٹکا ہے، نہ کسی طرح کی غمگینی:

دوسری جگہ یہی حقیقت زیادہ واضح لفظوں میں بیان کی گئی ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ	جو لوگ (پیغمبر اسلام پر) ایمان لائے ہیں وہ
هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ	ہوں، یا وہ لوگ ہوں جو یہودی کہلاتے ہیں یا نصاریٰ
مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ	اور صابی ہوں (کوئی بھی ہو) لیکن جو کوئی بھی اللہ
وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ	پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا، اور اس کے کام
عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ	بھی اچھے ہوئے تو وہ اپنے ایمان و عمل کا اجر
وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○ ۲: ۵۹	

قوموں، ملکوں اور طرح طرح کی رسموں اور رواجوں کا ایک جتھہ بنا لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب انسان کی نجات و سعادت کی راہ یہ نہیں سمجھی جاتی کہ کس کا اعتقاد اور عمل کیسا ہے، بلکہ سارا دارومدار اس پر آکے ٹھہر گیا ہے کہ کون کس جتھے اور گروہ بندی میں داخل ہے؟ اگر ایک آدمی کسی خاص مذہبی گروہ بندی میں داخل ہے، تو یقین کیا جاتا ہے کہ وہ نجات یافتہ ہے، اور دین کی سچائی اسے مل گئی۔ اگر داخل نہیں ہے تو یقین کیا جاتا ہے کہ نجات کا دروازہ اس پر بند ہو گیا، اور دین کی سچائی میں اس کا کوئی حصّہ نہیں۔ گویا دین کی سچائی، آخرت کی نجات، اور حق و باطل کا معیار تمام تر گروہ بندی اور گروہ پرستی ہو گئی۔ اعتقاد اور عمل کوئی چیز نہیں ہے، پھر باوجودیکہ تمام مذاہب کا مقصود اصلی ایک ہی ہے، اور سب ایک ہی پروردگار عالم کی پرستش کرنے کے مدّعی ہیں، لیکن ہر گروہ یقین کرتا ہے کہ دین کی سچائی صرف اسی کے حصّے میں آئی ہے۔ باقی تمام نوع انسانی اس سے محروم ہے۔ چنانچہ ہر مذہب کا پیرو دوسرے مذہب کے خلاف نفرت و تعصّب کی تعلیم دیتا ہے، اور دنیا میں خدا پرستی اور دین داری کی راہ، سرتاسر بغض و عداوت، نفرت و توحّش اور قتل و خونریزی کی راہ بن گئی ہے!

اس بارے میں دعوتِ قرآنی کی تین مہمات

اس سلسلہ میں قرآن نے جن مہمات پر زور دیا ہے، ان میں تین باتیں سب سے نمایاں ہیں:

(۱) انسان کی نجات و سعادت کا دارومدار اعتقاد و عمل پر ہے، نہ کہ کسی خاص گروہ بندی پر۔

(۲) نوعِ انسانی کے لیے دینِ الٰہی ایک ہی ہے، اور یکساں طور پر سب کو اسی کی تعلیم دی گئی ہے۔ پس یہ جو پیروانِ مذاہب نے دین کی وحدت اور عالمگیر حقیقت ضائع کر کے بہت سے متخالف اور متخاصم جتھے بنا لیے ہیں، یہ صریح گمراہی ہے۔

(۳) اصل دین توحید ہے یعنی ایک پروردگار عالم کی براہ راست پرستش کرنی، اور تمام بانیانِ مذاہب نے اسی کی تعلیم دی ہے۔ اس کے خلاف جس قدر عقائد اور اعمال اختیار کر لیے

پر غور کرو، کوئی انسان ہو، کسی نسل و قوم اور گروہ بندی کا ہو، لیکن جب کسی نے بھی اللہ کے آگے عبودیت کا سر جھکا دیا، اور نیک عملی کی زندگی اختیار کی، اس نے دین کی نجات و سعادت پالی اور اس کے لیے کوئی غم اور دھڑکا نہیں!

غور کرو، مذہبی صداقت کی عالمگیر وسعت کا اس سے زیادہ واضح اور ہمہ گیر اعلان اور کیا ہو سکتا ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى	اور یہودیوں نے کہا عیسائیوں کا دین کچھ نہیں
عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ	ہے، اسی طرح عیسائیوں نے کہا یہودیوں کے
الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُونَ	پاس کیا دھرا ہے۔ حالانکہ دونوں اللہ کی
الْكِتٰبَ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ	کتاب پڑھتے ہیں (اور دونوں کا سرچشمہ
لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَاللّٰهُ	دین ایک ہی ہے) ٹھیک ایسی ہی بات ان لوگوں
يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا	نے بھی کہی جو (مقدس نوشتوں کا) علم نہیں
كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۲: ۱۱۳)	رکھتے (یعنی مشرکین عرب) کہ وہ بھی صرف اپنے

ہی کو نجات کا وارث سمجھتے ہیں) اچھا جس بات میں باہم دگر جھگڑ رہے ہیں، قیامت کے دن اللہ اس کا فیصلہ کر دے گا (اور اس وقت حقیقت حال سب پر کھل جائے گی)

یعنی باوجودیکہ خدا کا دین ایک ہی ہے، اور کتاب الٰہی یعنی تورات دونوں کے سامنے ہے۔ بایں ہمہ مذہبی گروہ بندی کا نتیجہ یہ ہے کہ باہم دگر مخالف اور مکذب جتھے قائم ہو گئے ہیں۔ ہر جتھا دوسرے جتھے کو جھٹلاتا ہے، اور ہر جتھا صرف اپنے ہی کو نجات و سعادت کا مالک سمجھتا ہے!

سچائی اصلاً سب کے پاس ہے مگر عملاً سب نے کھو دی ہے

سوال یہ ہے کہ جب دین کی راہ ایک ہونے کی جگہ بیشمار جتھوں اور ٹولیوں میں بٹ گئی، اور ہر جتھا ایک ہی طرح تعصب اپنی

اپنے پروردگار سے ضرور پائے گا۔ اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا کھٹکا ہے، نہ کسی طرح کی غمگینی!

یعنی دین سے مقصود تو خداپرستی اور نیک عملی کی راہ تھی، وہ کسی خاص حلقہ بندی کا نام نہ تھا، کوئی انسان ہو، کسی نسل و قوم سے ہو، کسی نام سے پکارا جاتا ہو، لیکن اگر خدا پر سچا ایمان رکھتا ہے، اور اس کے اعمال بھی نیک ہیں، تو دینِ الٰہی پر چلنے والا ہے اور اس کے لیے نجات ہے، لیکن یہودیوں اور عیسائیوں نے ایک خاص طرح کی نسلی اور جماعتی گروہ بندی کا قانون بنا دیا۔ یہودیوں نے گروہ بندیوں کا ایک دائرہ کھینچا اور اس کا نام "یہودیت" رکھدیا جو اس دائرے کے اندر ہے، وہ سچائی پر ہے، اور اس کے لیے نجات ہے۔ جو اس سے باہر ہے وہ باطل پر ہے اور اس کے لیے نجات نہیں۔ اسی طرح عیسائیوں نے بھی ایک دائرہ کھینچ لیا۔ اور اس کا نام "مسیحیت" یا "کلیسا" رکھ دیا۔ جو اس میں داخل ہے، صرف وہی سچائی پر ہے، اور صرف اسی کے لیے نجات ہے۔ جو اس سے باہر ہے، اس کا سچائی میں کوئی حصہ نہیں، اور نجات سے قطعاً محروم۔ باقی رہا عمل و اعتقاد تو اس کا قانون یک قلم غیر موثر ہوگیا۔ ایک شخص کتنا ہی خدا پرست اور نیک عمل ہو، لیکن اگر "یہودیت" کی نسلی گروہ بندی یا "مسیحیت" کی جماعتی گروہ بندی میں داخل نہیں، تو اُسے کوئی یہودی اور عیسائی ہدایت یافتہ انسان تسلیم نہیں کرسکتا۔ لیکن ایک سخت سے سخت بدعمل اور بداعتقاد انسان بھی نجات یافتہ سمجھ لیا جائے گا، اگر ان گروہ بندیوں میں داخل ہوگا۔ قرآن ان کے اسی اعتقاد کو ان لفظوں میں نقل کرتا ہے: کُونُوا هُودًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوا یعنی ہدایت کی راہ اعتقاد اور عمل کی راہ نہیں ہے، بلکہ یہودیت اور نصرانیت کی گروہ بندی کی راہ ہے۔ جب تک کوئی یہودی یا نصرانی نہ ہو جائے، ہدایت یافتہ نہیں ہو سکتا۔ پھر اس کا رد کرتے ہوئے کہتا ہے، خدا کی ہدایت جو دنیا کا عالمگیر قانون ہے، وہ بھلا ان خود ساختہ گروہ بندیوں میں کیونکر محدود ہو جاسکتی ہے؟ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ کے نور اور عموم

کو خدا کی عبادت گاہ سمجھتا ہے۔ دوسرے گروہ کی عبادت گاہ اس کی نظروں میں کوئی احترام نہیں رکھتی حتیٰ کہ بسا اوقات وہ مذہب کے نام پر اٹھتا ہے اور دوسروں کی عبادت گاہیں منہدم کر ڈالتا ہے۔ قرآن کہتا ہے، اس سے بڑھکر انسان کا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ خدا کے بندوں کو خدا کی یاد سے روکا جائے اور صرف اس لیے روکا جائے کہ وہ ایک دوسرے مذہبی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں؟ یا ایک عبادت گاہ ڈھادی جائے' اور اس لیے ڈھادی جائے کہ وہ ہماری بنائی ہوئی نہیں ہے، دوسرے گروہ کی بنائی ہوئی ہے؟ کیا تمھارے بنائے ہوئے مذہبی جتھوں کے اختلاف سے خدا بھی مختلف ہو گئے؟ اور اس لیے ایک جتھے کی بنائی ہوئی عبادت گاہ تو خدا کی عبادت گاہ ہوئی، مگر دوسرے کی بنائی ہوئی عبادت گاہ خدا کی عبادت گاہ نہیں؟

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ	اور (یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے
قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ اَنْ	کہتے ہیں) یہ بات کبھی نہ مانو کہ دین کی جو سعادت
یُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ اَوْ	تمھیں دی گئی ہے (یعنی یہودیوں کو دی گئی
یُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ	ہے) ویسی اب کسی دوسرے انسان کو مل سکے
الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ ۚ یُؤْتِیْهِ مَنْ	یا اللہ کے حضور تمھارے خلاف کسی کی کوئی حجت
یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝ (۳: ۷۳)	چل سکے (اے پیغمبر) ان لوگوں سے کہہ دو

ہدایت تو وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہے (اور اس کی راہ سب کے لیے کھلی ہوئی ہے) اور فضل اور بخشش کا سررشتہ تمھارے ہاتھ نہیں ہے، اللہ کے ہاتھ ہے جسے چاہے دیدے۔ وہ (اپنے فضل میں) بڑی وسعت رکھنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

یعنی یہودیوں کا اعتقاد یہ ہے کہ وحی و نبوت کی ہدایت جو انھیں دی گئی ہے وہ صرف انہی کے لیے ہے، ممکن نہیں، کسی دوسرے انسان یا قوم کو یہ بات حاصل ہو سکے۔ چنانچہ اسی بنا پر وہ کہتے ہیں اپنے مذہب کے آدمیوں کے علاوہ اور کسی آدمی کی سچائی اور بزرگی تسلیم نہ کرو اور نہ بات مانو کہ تمھارے خلاف (یعنی یہودیوں کے خلاف) کسی آدمی کی کوئی دلیل خدا کے حضور مقبول ہو سکتی ہے۔ قرآن اس زعم باطل کو رد کرتا ہے اور کہتا ہے۔

سچائی کا مدعی ہے، اور ایک ہی طریقے پر دوسروں کو جھٹلا رہا ہے۔ تو اب اس بات کا فیصلہ کیونکر ہو کہ فی الحقیقت سچائی ہے کہاں؟ قرآن کہتا ہے، سچائی اصلاً سب کے پاس ہے مگر عملاً سب نے کھو دی ہے۔ سب کو ایک ہی دین کی تعلیم دی گئی تھی، اور سب کے لیے ایک ہی عالمگیر قانون ہدایت تھا۔ لیکن سب نے اصل حقیقت ضائع کر دی، اور "الدین" پر قائم رہنے کی جگہ الگ الگ گروہ بندیاں کر لیں۔ اب ہر گروہ دوسرے گروہ سے لڑ رہا ہے اور سمجھتا ہے دین کی سعادت اور نجات صرف اسی کے ورثہ میں آئی ہے۔ دوسروں کا اس میں کوئی حصہ نہیں

عبادت گاہوں میں تفرقہ سورۂ بقرہ میں مندرجہ صدر آیت کے بعد ہی حسب ذیل بیان شروع ہو جاتا ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِیْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓىٕكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَاۤ اِلَّا خَآىٕفِیْنَ ؕ۬ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (۲: ۱۱۴)

"اور غور کرو" اس سے بڑھ کر ظلم کرنے والا انسان کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی عبادت گاہوں میں اس کے نام کی یاد سے مانع آئے اور ان کی ویرانی میں کوشاں ہو؟ جن لوگوں کے ظلم و شرارت کا یہ حال ہے یقیناً وہ اس لائق نہیں کہ خدا کی عبادت گاہوں میں قدم رکھیں۔ بجز اس حالت کے کہ دوسروں کو اپنی طاقت سے ڈرانے کی جگہ خود دوسروں کی طاقت سے ڈرے سہمے ہوئے ہوں۔ یاد رکھو ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی سخت ترین عذاب!

یعنی مذہبی گروہ بندی کی گمراہی کا نتیجہ یہ ہے کہ خدا کی عبادت گاہیں تک الگ الگ ہو گئی ہیں اور باوجودیکہ تمام پیروان مذہب ایک ہی خدا کے نام لیوا ہیں، لیکن ممکن نہیں، ایک مذہب کا پیرو دوسرے مذہب کی بنائی ہوئی عبادت گاہ میں جا کر خدا کا نام لے سکے۔ اتنا ہی نہیں۔ بلکہ ہر گروہ صرف اپنی عبادت گاہ

مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ٥ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۠

اور اب وہ اپنے قول و قرار سے پھر نہیں سکتا؟ یا پھر تم خدا کے نام ایک ایسی (جھوٹی) بات کہہ رہے ہو جس کا تمھیں کوئی علم نہیں؟ نہیں! خدا کا قانون تو یہ ہے کہ کسی نسل اور کسی گروہ کا انسان ہو، لیکن جس کسی نے بھی برائی کمائی اور اپنے گناہوں میں گھر گیا تو وہ دوزخی گروہ میں سے ہے ہمیشہ دوزخ میں رہنے والا اور جس کسی نے بھی ایمان کی راہ اختیار کی [illegible]

قانونِ نجات کا اعلانِ عام

سورہ نساء میں نہ صرف یہودیوں اور عیسائیوں کو، بلکہ سب کو مخاطب کر کے صاف صاف اعلان کر دیا ہے۔ ایسا اعلان جس کے بعد کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ٥ (۴ : ۱۲۳)

(مسلمانو! یاد رکھو) نجات اور سعادت نہ تو تمھاری آرزوؤں پر موقوف ہے نہ اہلِ کتاب کی آرزوؤں پر (خدا کا قانون تو یہ ہے کہ) جو کوئی بھی برائی کرے گا نتیجہ اس کے سامنے آئے گا اور پھر نہ تو کسی [illegible]

یہودی سمجھتے تھے، غیر مذہب والوں کے ساتھ معاملت میں دیانتداری ضروری نہیں، قرآن کا اس پہ انکار!

اس مذہبی گروہ بندی کا نتیجہ یہ تھا کہ یہودی سمجھتے تھے سچائی اور دیانت داری کے جس قدر بھی احکام ہیں وہ اس لیے نہیں ہیں کہ تمام انسانوں کے ساتھ عمل میں لائے جائیں بلکہ محض اس لیے ہیں کہ ایک یہودی دوسرے یہودی کے ساتھ بد دیانتی نہ کرے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر ایک آدمی ہمارا ہم مذہب نہیں ہے تو ہمارے لیے جائز ہے کہ جس طرح بھی چاہیں اس کا مال کھا لیں، کچھ ضروری نہیں کہ راست بازی و دیانت کے اصول ملحوظ رکھے جائیں۔ چنانچہ لین دین میں سود لینے کی مخالفت کو انھوں نے صرف اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ مخصوص کر دیا تھا اور آج تک ان کا طرزِ عمل یہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک یہودی کو دوسرے یہودی سے ظالمانہ سود نہیں لینا چاہیے لیکن ایک یہودی غیر یہودی سے لے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ قرآن ان کے اس عقیدے کا ذکر کرتا اور اسے ان کی بہت

"اِنَّ الْھُدٰی ھُدَی اللّٰہِ" ہدایت کی راہ تو وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہے اور اللہ کا فضل کسی ایک انسان یا گروہ ہی کے لیے نہیں ہے، سب کے لیے ہے، پس جو انسان بھی ہدایت کی راہ چلے گا، ہدایت یافتہ ہوگا خواہ یہودی ہو یا کوئی ہو۔

یہودی اپنے آپ کو نجات یافتہ امت سمجھتے تھے اور کہتے تھے 'دوزخ کی آگ ہم پر حرام کر دی گئی ہے

یہودیوں کی گروہ بندی کا غرور یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ وہ کہتے تھے خدا نے دوزخ کی آگ ہم پر حرام کر دی ہے، اگر ہم میں سے کوئی آدمی جہنم میں ڈالا بھی جائے گا تو اس لیے نہیں کہ اسے عذاب میں ڈالا جائے بلکہ اس لیے کہ گناہ کے داغ دھبوں سے پاک صاف کر دیا جائے۔ اور پھر جنت میں جا داخل ہو۔ قرآن ان کا یہ زعم باطل جا بجا نقل کرتا ہے، اور پھر اس کا رد کرتے ہوئے پوچھتا ہے یہ بات تمھیں کہاں سے معلوم ہو گئی کہ یہودی گروہ بندی کا ہر فرد نجات یافتہ ہے؟ اور عذاب اخروی سے اُسے چھٹکارا مل چکا ہے؟ کیا تمھیں خدا نے غیر مشروط نجات کا کوئی پٹہ لکھ کر دے دیا ہے کہ جہاں ایک انسان یہودی ہوا اور آتش دوزخ اس پر حرام ہو گئی۔ اگر نہیں دیا ہے تو پھر بنا ڈالنا ایسا اعتقاد رکھنا خدا پر افترا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اس کے بعد صاف صاف لفظوں میں خدا کے قانونِ عمل کا اعلان کرتا ہے۔ "جس کسی نے بھی اپنے عمل سے بُرائی کمائی اس کے لیے بُرائی ہے جس کسی نے بھی بھلائی کمائی اس کے لیے بھلائی ہے۔" یعنی جس طرح سنکھیا کھانے سے ہر کھانے والا ہلاک ہو جاتا ہے خواہ یہودی ہو یا غیر یہودی اور دودھ پینے سے صحت و توانائی ملتی ہے خواہ پینے والا کسی نسل و قوم اور گروہ سے تعلق رکھتا ہو۔ اسی طرح عالم معنویات میں بھی ہر عمل کا ایک خاصّہ ہے اور وہ اس لیے بدل نہیں جا سکتا کہ عمل کرنے والے کی نسل یا گروہ بندی کیا ہے۔ چنانچہ سورۂ بقر میں ہے:

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا	اور ان لوگوں نے یعنی یہودیوں نے کہا ہمیں جہنم کی آگ
مَّعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ	کبھی چھونے والی نہیں۔ اور اگر چھوئے بھی تو اس سے زیادہ نہیں
عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ ۖ أَمْ	چند دنوں کے لیے چھولے۔ (اے پیغمبر) ان سے کہو یہ
تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ بَلَىٰ	جو تم کہتے ہو، تو کیا تم نے خدا سے قول و قرار کرا لیا ہے

گروہ بندی کی گمراہی واضح کرنے کے لیے ایک نہایت سیدھا سادہ سوال ان تینوں کے آگے پیش کرتا ہے اگر دین کی سچائی گروہ بندیوں کے ساتھ وابستہ ہے تو بتاؤ حضرت ابراہیمؑ کس گروہ بندی کے آدمی تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس وقت تک نہ تو یہودیت کا ظہور ہوا تھا نہ مسیحیت کا اور نہ کوئی دوسری گروہ بندی ہی موجود تھی پھر اگر ابراہیمؑ کسی گروہ بندی میں داخل نہ ہونے پر بھی دین حق کی راہ پر تھے تو بتاؤ وہ راہ کونسی تھی۔ قرآن کہتا ہے وہ اسی دین حنیفی کی راہ تھی جو تمہاری تمام بنائی ہوئی گروہ بندیوں سے بالاتر اور نوع انسانی کیلئے عالمگیر قانون نجات ہے یعنی خدا کی موحدانہ پرستش اور نیک عملی کی زندگی

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ	اور یہودی کہتے ہیں، یہودی ہو جاؤ ہدایت پاؤ گے
تَهْتَدُوا قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ	نصاریٰ کہتے ہیں نصرانی ہو جاؤ ہدایت پاؤ گے۔ اے
حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (۲: ۱۳۵)	پیغمبر! تم کہو نہیں، (اللہ کی عالمگیر ہدایت

تمہاری ان گروہ بندیوں کی پابند نہیں ہو جا سکتی) ہدایت کی راہ تو وہی حنیفی راہ ہے جو ابراہیمؑ کا ... (جو ایک خدا کا ہو رہا تھا اور مشرکوں میں سے نہ تھا)

سورۂ آل عمران میں یہی مضمون زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي	اے اہل کتاب! تم ابراہیمؑ کے بارے میں کیوں حجت
إِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنْزِلَتِ التَّوْرَاةُ	کرتے ہو۔ حالانکہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ تورات
وَالْإِنْجِيلُ إِلَّا مِنْ بَعْدِهِ أَفَلَا	اور انجیل نازل نہیں ہوئیں، مگر اس کے بعد۔ پھر کیا اتنی
تَعْقِلُونَ (۳: ۶۵)	صاف بات بھی نہیں سمجھ سکتے!

یعنی وہ یہودیوں اور عیسائیوں سے سوال کرتا ہے، تمہاری ان گروہ بندیوں کی تاریخ زیادہ سے زیادہ تورات اور انجیل کے ظہور تک جا سکتی ہے کیونکہ ان ہی کی نسبت سے گروہ بندیوں کے حلقے کھینچے گئے ہیں۔ اچھا بتاؤ تورات سے پہلے بھی ہدایت یافتہ انسان موجود تھے یا نہیں؟ اگر تھے تو ان کی راہ کیا تھی؟ خود تمہارے اسرائیلی گھرانے کے تمام نبیوں کی راہ کیا تھی؟ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹوں اور پوتوں کو جس دین کی تلقین کی وہ دین کون سا تھا؟ حضرت یعقوبؑ جب بستر مرگ پر تھے اور اپنے بیٹوں کو دین الٰہی پر قائم رہنے

بڑی گمراہی قرار دیتا ہے۔

وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ — اور ان کا سود کھانا، حالانکہ وہ اس سے روک دیے

وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (۴: ۵۹) — گئے تھے اور ان کی یہ بات کہ لوگوں کا مال ناجائز

اسی طرح جو یہودی عرب میں آباد تھے، وہ کہتے تھے عرب کے ان پڑھ باشندوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں راست بازی و دیانت داری کچھ ضروری نہیں۔ یہ لوگ بت پرست ہیں۔ ہم ان لوگوں کا مال جس طرح بھی کھالیں ہمارے لیے جائز ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۳: ۷۶)

(یہودیوں کی یہ بدمعاملگی) اس لیے ہے کہ وہ کہتے ہیں (عرب کے ان) ان پڑھ لوگوں سے بدمعاملگی کرنے میں) ہم سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی جس طرح بھی ہم چاہیں ان کا مال کھا لے سکتے ہیں حالانکہ ایسا کہنے ہوئے وہ صریح اللہ پر افترا کرتے ہیں، ہاں ان سے باز پرس ہوا ور ضرور ہوگی کیونکہ اللہ کا قانون تو یہ ہے کہ) جو کوئی اپنا قول سچائی کے ساتھ پورا کرتا ہے اور برائی

یعنی ایسا عقیدہ رکھنا خدا کے دین پر صریح افترا ہے۔ خدا کا دین تو یہ ہے کہ ہر انسان کے ساتھ نیکی کرنی چاہیے اور ہر حال میں راست بازی و دیانتداری کی راہ چلنی چاہیے، خواہ کوئی انسان ہو اور کسی عقیدہ اور گروہ کا ہو، کیونکہ سفید ہر حال میں سفید ہے اور سیاہ ہر حال میں سیاہ۔ کوئی سفید چیز اس لیے کالی نہیں ہو جا سکتی کہ کس آدمی کو دی گئی ہے اور کوئی کالی چیز اس لیے سفید نہیں ہو جا سکتی کہ کس نسل اور کس گروہ کے ہاتھوں نکلی ہے۔ پس دیانت داری ہر حال میں دیانت داری ہے اور بد دیانتی ہر حال میں بد دیانتی۔

حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت سے استشہاد نزول قرآن کے وقت بڑے مذہبی گروہ عرب میں تین تھے۔ یہودی، عیسائی اور مشرکین عرب اور یہ تینوں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی شخصیت کو یکساں طور پر عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے کیونکہ تینوں گروہوں کے مورث اعلیٰ وہی تھے۔ پس قرآن مذہبی

الگ بنا لیے اور ہر جتھا اپنے طور طریقے میں مگن ہو گیا۔

قرآن نے پچھلے رسولوں اور مذہب کے بانیوں میں سے جن جن رہنماؤں کے مواعظ نقل کیے ہیں، ان سب میں بھی اصل اصول یہی حقیقت ہے۔ اور عموماً اکثر مواعظ کا خاتمہ دین کی وحدت اور انسان کی عالمگیر اخوت کی تعلیم پر ہی ہوتا ہے۔ مثلاً سورۂ مومنون میں سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا ذکر کیا ہے: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ٥ (۲۳ : ۲۳) اس کے بعد ان دعوتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو حضرت نوحؑ کے بعد ہوتی رہیں: ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ٥ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۳۲)

پھر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا ذکر کیا ہے: ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ (۴۷) حضرت موسیٰ کے بعد حضرت مسیح (علیہ السلام) کی دعوت نمایاں ہوئی: وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗۤ اٰيَةً (۵۲) پھر ان تمام دعوتوں کے بعد یہ صدائے حق بلند ہوتی ہے:

يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ	اے ہم نے تمام رسولوں کو یہی حکم دیا تھا کہ پاک و
وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ	صاف چیزیں کھاؤ اور نیک عملی کی زندگی بسر کرو
عَلِيْمٌ ؕ وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً	تم جو کچھ کرتے ہو اس سے میں بے خبر نہیں ہوں
وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ٥	اور دیکھو، یہ تمھاری قوم در اصل ایک ہی قوم
فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ؕ (۵۴-۵۳)	ہے اور میں تم سب کا پروردگار ہوں۔ پس نافرمانی
كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ٥	سے بچو! لیکن پھر ایسا ہوا کہ لوگوں نے ایک دوسرے

سے کٹ کر جدا جدا دین بنا لیے۔ ہر ٹولی کے پلّے جو کچھ پڑ گیا ہے، اسی میں مگن ہے!

یعنی تمام رسولوں نے یکے بعد دیگرے یہی تعلیم دی تھی کہ خدا کی بندگی کرو اور نیک عملی کی

کی وصیت کر رہے تھے تو اس دین سے مقصود کون سا دین تھا؟ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ یہودیت یا مسیحیت کی گروہ بندی نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ دونوں گروہ بندیاں حضرت موسیٰؑ اور حضرت مسیحؑ کے نام پر کی گئی ہیں۔ اور وہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ وغیرہم سے کئی سو برس بعد پیدا ہوئے۔ پس معلوم ہوا، تمھارے ان خود ساختہ حلقہ ہائے نجات سے بھی کوئی بالاتر راہِ نجات موجود ہے جو اس وقت بھی بنی نوعِ انسانی کے سامنے موجود تھی، جب ان حلقہ بندیوں کا نام و نشان تک نہ تھا، قرآن کہتا ہے، یہی راہ نجات دین کی اصلی راہ ہے۔ اور اسے حاصل کرنے کے لیے کسی گروہ بندی کی نہیں، بلکہ اعتقاد اور عمل کی ضرورت ہے۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ	پھر کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کے
يَعْقُوْبَ الْمَوْتُۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا	سرہانے موت آ کھڑی ہوئی تھی اور اس نے اپنی اولاد
تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْؕ قَالُوْا نَعْبُدُ	سے پوچھا تھا، بتاؤ میرے بعد کس کی عبادت
اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهِيْمَ وَ	کرو گے؟ انھوں نے جواب میں کہا تھا "اسی
اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّ	ایک خدا کی عبادت کریں گے جس کی تو نے عبادت
نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۲: ۱۲۷)	کی ہے، اور تیرے بزرگوں، ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ نے کی ہے، اور ہم اسی کے حکم کے فرمانبردار ہیں۔"

اصلِ دین وحدت و اخوت ہے نہ کہ تفرقہ و منافرت

وہ کہتا ہے، دینِ الٰہی کی اصل، نوعِ انسانی کی اخوت و وحدت ہے نہ کہ تفرقہ و منافرت۔ خدا کے جتنے رسول بھی دنیا میں آئے، سب نے یہی تعلیم دی تھی کہ تم سب اصلاً ایک ہی اُمت ہو، اور تم سب کا پروردگار ایک ہی پروردگار ہے۔ پس چاہیے کہ سب اسی ایک پروردگار کی بندگی کریں۔ اور ایک گھرانے کے بھائیوں کی طرح مِل جُل کر رہیں۔ اگرچہ مذہب کے داعی نے اسی راہ کی تعلیم دی، لیکن ہر مذہب کے پیرووں نے اس سے انحراف کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ملک، ہر قوم، ہر نسل نے اپنے اپنے جتھے الگ

انسان ہو چکے ہیں، یا نیک انسانوں کی نسل میں سے ہے یا کسی پچھلی قوم سے رشتۂ قدامت رکھتا ہے، نجات وسعادت کے لیے کچھ سود مند نہیں:

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا	یہ ایک اُمت تھی جو گذر چکی، اور اس کے لیے وہ تھا
مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ	جو اس نے اپنے عمل سے کمایا، اور تمھارے لیے وہ ہے جو تم
وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ	اپنے عمل سے کماؤ، تم سے اس کی بازپرس نہیں ہوگی کہ
(۲: ۱۴۱)	ان کے عمل کیسے تھے؟

قرآن کی دعوت

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں، کوئی بات بھی قرآن کے صفحوں پر اس درجہ نمایاں نہیں ہے جس قدر یہ بات ہے۔ اس نے بار بار صاف اور قطعی لفظوں میں اس حقیقت کا اعلان کر دیا ہے کہ وہ کسی نئی مذہبی گروہ بندی کی دعوت لے کر نہیں آیا ہے، بلکہ چاہتا ہے تمام مذہبی گروہ بندیوں کی جنگ و نزاع سے دنیا کو نجات دلا دے، اور سب کو اسی ایک راہ پر جمع کر دے جو سب کی مشترک اور متفقہ راہ ہے۔

وہ بار بار کہتا ہے، جس راہ کی میں دعوت دیتا ہوں، وہ کوئی نئی راہ نہیں ہے، اور نہ سچائی کی راہ نئی ہو سکتی ہے۔ یہ وہی راہ ہے جو اول روز سے موجود ہے، اور تمام مذاہب کے داعیوں نے اسی کی طرف بلایا ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ	اور (دیکھو) اس نے تمہارے لیے دین کی وہی راہ
مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ	ٹھہرائی ہے جس کی وصیت نوحؑ کو کی گئی تھی۔ اور جس
اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا	پر چلنے کا ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو حکم دیا تھا۔
بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى	(ان سب کی تعلیم یہی تھی کہ الدین (یعنی خدا کا
اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا	ایک ہی دین) قائم رکھو اور اس راہ میں الگ الگ نہ
فِيْهِ ط (۴۲: ۱۳)	ہو جاؤ۔

زندگی اختیار کرو۔ تم سب خدا کے نزدیک ایک ہی اُمت ہو، اور تم سب کا پروردگار ایک ہی پروردگار ہے۔ تم میں سے کوئی گروہ دوسرے گروہ کو اپنے سے الگ نہ سمجھے، نہ کوئی گروہ دوسرے گروہ کا مخالف ہو جائے۔ فَتَقَطَّعُوٓا اَمْرَهُم بَیْنَهُمْ زُبُرًا۔ لیکن لوگوں نے یہ تعلیم فراموش کر دی اور اپنی الگ الگ ٹولیاں بنالیں۔ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ اب ہر ٹولی اسی میں مگن ہے جو اس کے پلّے پڑ گیا ہے۔

رسمِ اصطباغ مذہبی گروہ بندی کی رسموں میں سے ایک رسم وہ ہے جو عیسائی کلیسا نے اختیار کر رکھی ہے، اور جسے وہ اصطباغ (بپتسما) سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ دراصل ایک یہودی رسم تھی جو اس وقت ادا کی جاتی تھی جب لوگ گناہوں سے توبہ کیا کرتے تھے، اور اس لیے فی نفسہ ایک مقررہ رسم سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن عیسائیوں نے اسے انسانی نجات و سعادت کی بنیاد سمجھ لیا ہے۔ جب تک ایک شخص مسیح علیہ السّلام کے نام پر اصطباغ نہ لے، وہ نجات یافتہ انسان نہیں سمجھا جاتا۔ قرآن کہتا ہے، یہ کیسی گمراہی ہے کہ انسانی نجات و سعادت جس کا دارومدار عمل و اعتقاد پر ہے، محض ایک مقررہ رسم کے ساتھ وابستہ کر دی جائے؟ انسانوں کا یہ ٹھہرایا ہوا اصطباغ اللہ کا اصطباغ نہیں ہے، اللہ کا اصطباغ تو یہ ہے کہ تمہارے دل خدا پرستی کے رنگ میں رنگ جائیں۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ج وَمَنْ اَحْسَنُ	یہ اللہ کا رنگ ہے۔ (یعنی دینِ الٰہی کا قدرتی
مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ	اصطباغ ہے) اور اللہ سے بہتر رنگ دینے میں اور
عٰبِدُوْنَ ۔ ۲ : ۱۳۸)	کون ہو سکتا ہے؟ ہم تو اسی کی بندگی کرنے والے ہیں۔

قانونِ عمل اسی طرح سورۂ بقرہ میں بار بار کہتا ہے۔ دینِ الٰہی عمل کا قانون ہے اور ہر انسان کے لیے وہی ہونا ہے جو اس کے عمل کی کمائی ہے۔ یہ بات کہ ایک گروہ میں بہت سے نبی اور برگزیدہ

أُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝

اسحق، یعقوب اور اولاد یعقوب پر نازل ہوا ہے ان سب پر ایمان رکھتے ہیں، اسی طرح جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو اور دنیا کے تمام نبیوں کو ان کے پروردگار سے دیا گیا ہے، سب پر ہمارا ایمان ہے۔ ہم ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے سے جُدا نہیں کرتے (کہ اسے نہ مانیں، دوسروں کو مانیں) اور ہم اللہ کے فرماں بردار ہیں۔ (اس کی سچائی جہاں کہیں بھی اور جس کسی کی زبانی بھی آئی ہو، اس پر ہمارا ایمان ہے)

تفریق بین الرّسل قرآن نے اس آیت میں اور نیز متعدد موقعوں پر "تفریق بین الرسل" کو ایک بہت بڑی گمراہی قرار دیا ہے اور سچائی کی راہ یہ تبلائی ہے کہ "تفریق بین الرسل" سے انکار کیا جائے۔ "تفریق بین الرسل" کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے رسولوں میں باعتبارِ تصدیق، تفرقہ و امتیاز کرنا یعنی ایسا سمجھنا کہ ان میں سے فلاں سچا تھا فلاں سچا نہ تھا یا کسی ایک کی تصدیق کرنی اور باقی سب سے انکار کر دینا، یا سب کی تصدیق کرنی، کسی ایک سے انکار کر دینا۔ قرآن کہتا ہے، ہر راست باز انسان کا جو خدا کے سچے دین پر چلنا چاہتا ہے، فرض ہے کہ بلا کسی امتیاز کے تمام رسولوں، تمام کتابوں، تمام مذہبی دعوتوں پر ایمان لائے۔ اور کسی ایک کا بھی انکار نہ کرے۔ اس کا شیوہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ کہے، سچائی جہاں کہیں بھی ظاہر ہوئی ہے، اور جس کسی کی زبان پر بھی ظاہر ہوئی ہے، سچائی ہے، اور میرا اس پر ایمان ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ

اللہ کا رسول اُس (کلامِ حق) پر ایمان رکھتا ہے، جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر نازل ہوا ہے اور وہ لوگ بھی جو ایمان لائے ہیں، یہ سب اللہ پر، اس کے ملائکہ پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ (ان کے ایمان کا دستور العمل یہ ہے کہ وہ

سورۂ نساء میں ہے:

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ	(اے پیغمبر!) ہم نے تمھیں اسی طرح اپنی وحی سے مخاطب کیا
اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ	ہے جسطرح نوحؑ کو کیا تھا اور ان تمام نبیوں کو کیا تھا جو نوحؑ کے
وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ	بعد ہوئے نیز جسطرح ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ
وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ	اولادِ یعقوبؑ، یونس، ہارون، سلیمانؑ (وغیرہم)
وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَ	کو مخاطب کیا، اور داؤد کو زبور عطا کی، علاوہ بریں وہ
سُلَيْمٰنَ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا وَرُسُلًا	رسول جن میں سے بعض کا حال ہم تمھیں پہلے سنا چکے
قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا	ہیں، اور بعض ایسے ہیں جن کا حال تمھیں نہیں سنایا
لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ﴿۴: ۱۶۳﴾	

سورۂ انعام میں پچھلے رسولوں کا ذکر کرکے پیغمبر اسلام کو مخاطب کیا ہے، اور کہا ہے:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ	یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ نے راہ حق دکھائی پس
اقْتَدِهْ ﴿۶: ۹۰﴾	(اے پیغمبر!) تم بھی انہی کی ہدایت کی پیروی کرو۔

سب کی یکساں تصدیق اور سب کے متفقہ دین کی پیروی اس کی دعوت کا اصل اصول ہے۔

اسی لیے اس کی دعوت کی پہلی بنیاد ہی یہ ہے کہ تمام بانیان مذاہب کی یکساں طور پر تصدیق کی جائے یعنی یقین کیا جائے کہ سب حق پر تھے، سب خدا کی سچائی کے پیغامبر تھے، سب نے ایک ہی اصل و قانون کی تعلیم دی، اور سب کی اس متفقہ تعلیم پر کاربند ہونا ہی ہدایت و سعادت کی تنہا راہ ہے۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا	(اے پیغمبر!) کہدو، ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اللہ
وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ	پر ایمان لائے ہیں، اور جو کچھ اس نے ہم پر نازل کیا ہے
وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ	اس پر ایمان لائے ہیں، نیز جو کچھ ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ

تصدیق کی جائے۔ وہ کہتا ہے، یہاں راہیں صرف دو ہی ہیں، تیسری نہیں ہوسکتی۔ ایمان کی راہ یہ ہے کہ سب کو مانو۔ انکار کی راہ یہ ہے کہ سب کا، یا کسی ایک کا انکار کرو۔ یہاں کسی ایک کا انکار بھی وہی حکم رکھتا ہے جو سب کے انکار کا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَن يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَن يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝

جو لوگ اللہ اور اس کے پیغمبروں سے برگشتہ ہیں اور چاہتے ہیں اللہ اور اس کے رسولوں میں تفرقہ کریں (یعنی کسی کو خدا کا رسول مانیں کسی کو نہ مانیں) اور کہتے ہیں ان میں سے بعض کو ہم مانتے ہیں، بعض کا انکار کرتے ہیں، اور پھر اس طرح چاہتے ہیں، کفر اور ایمان کے درمیان کوئی تیسرا راستہ اختیار کرلیں، تو یقین کرو یہی لوگ ہیں کہ ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں، اور جن لوگوں کی راہ کفر کی راہ ہے، تو ان کے لیے رسوا کن عذاب تیار ہے لیکن ہاں، جو لوگ اللہ اور اس کے تمام پیغمبروں پر ایمان لائے، اور کسی ایک پیغمبر کو بھی دوسرے سے جدا نہیں کیا (یعنی کسی ایک کی سچائی سے بھی انکار نہیں کیا) تو بلاشبہ یہی لوگ ہیں جنھیں عنقریب اللہ ان کے اجر عطا فرمائیگا اور وہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے! (۴ : ۱۵۰)

سورۂ بقرہ میں جو سورۂ فاتحہ کے بعد قرآن کی پہلی سورۃ ہے۔ سچے مومنوں کی یہ راہ بتلائی ہے:

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ — اور وہ لوگ جو اس سچائی پر ایمان لائے جو پیغمبر اسلامؐ

رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ٥ (۲ : ۲۸۵)   کہتے ہیں، ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی کو
دوسرے سے جدا نہیں کرتے (کہ کسی کو مانیں، کسی کو نہ مانیں) انھوں نے کہا، خدایا! ہم نے
تیرا پیام سُنا اور تیری فرمانبرداری کی۔ ہمیں تیری مغفرت نصیب ہو، ہم سب کو بالآخر تیری ہی طرف

وہ کہتا ہے، خدا ایک ہے، اس کی سچائی ایک ہے، لیکن سچائی کا پیغام بہت سی زبانوں نے پہنچایا ہے۔ پھر اگر تم کسی ایک پیغامبر کی تصدیق کرتے ہو، دوسروں کا انکار کر دیتے ہو، تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ ایک ہی حقیقت کو ایک جگہ مان لیتے ہو، دوسری جگہ ٹھکرا دیتے ہو۔ یا ایک ہی بات کو مانتے بھی ہو اور دبھی کرتے ہو، ظاہر ہے کہ ایسا ماننا ماننا نہیں ہے، بلکہ ایک زیادہ بُری قسم کا انکار ہے۔

خدا کی سچائی اس کی عالمگیر بخشش ہے

وہ کہتا ہے، خدا کی سچائی، اس کی ساری باتوں کی طرح، اس کی عالمگیر بخشش ہے، وہ نہ تو کسی خاص زمانے سے وابستہ کی جا سکتی ہے، نہ کسی خاص نسل و قوم سے اور نہ کسی خاص مذہبی گروہ بندی سے۔ تم نے اپنے لیے طرح طرح کی قومیتیں اور جغرافیائی اور نسلی حد بندیاں بنالی ہیں، لیکن تم خدا کی سچائی کے لیے کوئی ایسا اننیا نہیں گھڑ سکتے۔ اس کی نہ تو کوئی قومیت ہے، نہ نسل ہے۔ نہ جغرافیائی حد بندی ہے۔ نہ جماعتی حلقہ بندی۔ وہ خدا کے سورج کی طرح ہر جگہ چمکتی اور نوعِ انسانی کے ہر فرد کو روشنی بخشتی ہے۔ اگر تم خدا کی سچائی کی ڈھونڈھ میں ہو، تو اسے کسی ایک ہی گوشے میں نہ ڈھونڈھو۔ وہ ہر جگہ نمودار ہوتی ہے، اور ہر عہد میں اپنا ظہور رکھتی ہے۔ تمھیں زمانوں کا، قوموں کا، وطنوں کا، زبانوں کا اور طرح طرح کی گروہ بندیوں کا پرستار نہیں ہونا چاہیے صرف خدا کا اور اس کی عالمگیر سچائی کا پرستار ہونا چاہیے۔ اس کی سچائی جہاں کہیں بھی آئی ہو اور جس بھیس میں بھی آئی ہو، تمھاری متاع ہے، اور تم اس کے وارث ہو۔

راہیں صرف دو ہیں: ایمان کی یہ ہے کہ سب کی مانو۔ انکار کی یہ ہے کہ سب کا یا کسی ایک کا انکار کر دو!

چنانچہ اس نے جا بجا "تفریق بین الرّسل" کی راہ کو انکار کی راہ قرار دیا ہے، اور ایمان کی راہ یہ بتائی ہے کہ بلا تفریق سب کی

وَاِنَّ اللّٰہَ رَبِّیۡ وَرَبُّکُمۡ فَاعۡبُدُوۡہُ	دیکھو، خدا تو میرا اور تمھارا، دونوں کا پروردگار
ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ ٥ (۱۹ : ۳۶)	ہے۔ پس اسی کی بندگی کرو۔ یہی دین کی سیدھی راہ ہو
قُلۡ اَتُحَآجُّوۡنَنَا فِی اللّٰہِ وَھُوَ رَبُّنَا	(اے پیغمبر!) ان سے کہو، کیا تم خدا کے بارے
وَرَبُّکُمۡ وَلَنَاۤ اَعۡمَالُنَا وَلَکُمۡ اَعۡمَالُکُمۡ	میں ہم سے جھگڑا کرتے ہو، حالانکہ ہمارا اور تمھارا،
وَنَحۡنُ لَہٗ مُخۡلِصُوۡنَ ٥ (۲ : ۱۳۹)	دونوں کا پروردگار وہی ہے، اور ہمارے لیے ہمارے

اعمال ہیں، تمہارے لیے تمہارے اعمال (یعنی ہر انسان کو اس کے عمل کے مطابق نتیجہ ملتا ہے۔ پھر... [illegible])

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ قرآن میں جہاں کہیں اس طرح کے مخاطبات ہیں، جیسا کہ آیات مندرجہ صدر میں ہے: اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیۡ وَرَبُّکُمۡ اللہ ہمارا اور تمہارا دونوں کا پروردگار ہے۔ یا اِلٰھُنَا وَاِلٰھُکُمۡ وَاحِدٌ ہمارا اور تمہارا دونوں کا خدا ایک ہی ہے۔ یا اَتُحَآجُّوۡنَنَا فِی اللّٰہِ وَھُوَ رَبُّنَا وَرَبُّکُمۡ ج وَلَنَاۤ اَعۡمَالُنَا وَلَکُمۡ اَعۡمَالُکُمۡ ج کیا تم خدا کے بارے میں ہم سے جھگڑا کرتے ہو؟ حالانکہ وہ ہمارا اور تمہارا دونوں کا پروردگار ہے۔ اور ہمارے لیے ہمارے عمل ہیں، تمہارے لیے تمہارے۔ تو ان تمام مخاطبات سے مقصود اسی حقیقت پر زور دینا ہے۔ یعنی جب سب کا پروردگار ایک ہے اور ہر انسان کے لیے ویسا ہی نتیجہ ہے جیسا اس کا عمل ہے، تو پھر خدا اور مذہب کے نام پر یہ عالمگیر جنگ و جدال کیوں برپا ہے۔

وہ بار بار کہتا ہے، میری تعلیم اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ خدا پرستی اور نیک عملی کی طرف بلاتا ہوں۔ میں کسی مذہب کو نہیں جھٹلاتا، میں کسی رہنما سے انکار نہیں کرتا، سب کی یکساں تصدیق اور "سب کی مشترکہ اور متفقہ تعلیم" میرا دستور العمل ہے۔ پھر میرے خلاف تمام پیروانِ مذہب نے کیوں اعلانِ جنگ کر دیا ہے۔

قرآن کا پیروانِ مذاہب سے مطالبہ اور یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، اس نے کسی مذہب کے پیرو سے بھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ کوئی نیا دین قبول کر لے، بلکہ ہر گروہ سے یہی مطالبہ کرتا ہے کہ اپنے اپنے

وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (۲: ۴: ۵)

پر نازل ہوئی ہے، اور ان تمام سچائیوں پر جو ان سے پہلے نازل ہو چکی ہیں، اور نیز آخرت کی زندگی پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ سو یہی لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی ٹھہرائی ہوئی ہدایت پر ہیں، اور یہی ہیں جنھوں نے فلاح پائی۔

جب سب ایک ہی خدا کے پرستار ہیں، اور سب کو اپنے اپنے عمل کے مطابق نتیجہ ملنا ہے تو پھر دین کے نام پر نزاع کیوں ہو؟

وہ کہتا ہے، اگر تمھیں اس بات سے انکار نہیں کہ تمام کارخانۂ ہستی کا خالق ایک ہی خالق ہے، اور اسی کی پروردگاری یکساں طور پر ہر مخلوق کو پرورش کر رہی ہے۔ تو پھر تمھیں اس بات سے کیوں انکار ہو کہ اس کی روحانی سچائی کا قانون بھی ایک ہی ہے، اور ایک ہی طرح پر تمام نوعِ انسانی کو دیا گیا ہے؟ وہ کہتا ہے، تم سب کا پروردگار ایک ہے، تم سب ایک ہی خدا کے نام لیوا ہو، تم سب کے رہنماؤں نے تمھیں ایک ہی راہ دکھلائی ہے، پھر یہ کیسی گمراہی کی انتہا اور عقل کی موت ہے کہ رشتہ ایک ہے، مقصد ایک ہے، راہ ایک ہے، لیکن ہر گروہ دوسرے گروہ کا دشمن ہے، اور ہر انسان دوسرے انسان سے متنفر۔ اور پھر یہ تمام جنگ و نزاع کس کے نام پر کیجا رہی ہے؟ اسی خدا کے نام پر، اور اُسی خدا کے دین کے نام پر، جس نے سب کو ایک ہی چوکھٹ پر جھکایا تھا، اور سب کو ایک ہی رشتۂ اخوت میں جکڑ دیا تھا:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ لا وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ (۵: ۵۹)

ان لوگوں سے کہو کہ اے اہل کتاب! تم جو ہماری مخالفت میں کمربستہ ہو گئے ہو، تو بتلاؤ، اس کے سوا ہمارا کیا جرم ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں، اور جو کچھ ہم پر نازل ہوا ہے، اور جو کچھ ہم سے پہلے نازل ہو چکا ہے، سب پر ایمان رکھتے ہیں؟ (پھر کیا خدا پرستی اور خدا کے تمام رسولوں کی تصدیق تمہارے نزدیک جرم اور عیب ہے؟ افسوس تم پر!) تم میں اکثر ایسے ہی ہیں، جو راہِ حق سے یکسر برگشتہ ہیں۔

اعتراف کیا ہی جو نزولِ قرآن کے وقت مختلف مذاہب میں موجود تھے۔ اور جنھوں نے اپنے مذہبوں کی حقیقی روح ضائع نہیں کی تھی۔ البتہ وہ کہتا ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ غالب تعداد انہی لوگوں کی ہو، جنھوں نے دین الہٰی کی اعتقادی اور عملی حقیقت یک قلم ضائع کر دی ہے۔

لَيْسُوا سَوَاءً ۗ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ۝ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ ۖ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ۝ وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَن يُكْفَرُوهُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ

(۳: ۱۱۳ - ۱۱۵)

یہ بات نہیں ہو کہ سب ایک ہی طرح کے ہوں انہی اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اصل دین پر قائم ہیں۔ وہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اللہ کے کلام کی تلاوت کرتے ہیں اور ان کے سر اس کے سامنے جھکے ہوتے ہیں۔ اور وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں، نیکی کی راہوں میں تیز گام ہیں۔ اور بلاشبہ یہی لوگ ہیں جو نیک انسانوں میں سے ہیں۔ اور (یاد رکھو) یہ لوگ جو کچھ بھی نیکی کرتے ہیں، تو ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ اس کی قدر نہ کی جائے۔ وہ جانتا ہے کہ (کس گروہ میں) کون پرہیزگار ہے۔

مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ ۝ (۵: ۶۶)

ان میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو میانہ رَو ہیں، لیکن بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو نہایت برے کام کر رہے ہیں۔

یہ جو قرآن جا بجا اس بات پر زور دیتا ہو کہ وہ پچھلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہو، جھٹلانے والا نہیں، اور اہلِ کتاب سے بار بار کہتا ہو: وَآمِنُوا بِمَا أَنزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ (۲: ۳۸) اس کتاب پر ایمان لاؤ جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرتی ہوئی نمایاں ہوئی ہو۔

مذاہب کی حقیقی تعلیم پر جسے تم نے طرح طرح کی تحریفوں اور اضافوں سے مسخ کر دیا ہے، سچائی کے ساتھ کاربند ہو جاؤ۔ وہ کہتا ہے، اگر تم نے ایسا کر لیا تو میرا کام پورا ہو گیا۔ کیونکہ جونہی تم اپنے مذہب کی حقیقی تعلیم کی طرف لوٹو گے، تمھارے سامنے وہی حقیقت آموجود ہو گی جس کی طرف میں تمھیں بلا رہا ہوں۔ میرا پیام کوئی نیا پیام نہیں ہے، وہی قدیم اور عالمگیر پیام ہے، جو تمام بانیانِ مذہب دے چکے ہیں:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى	اے اہل کتاب! جب تک تم تورات اور انجیل کی اور
شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ	تمام صحیفوں کی جو تم پر نازل ہوئے ہیں، حقیقت
وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ	قائم نہ کرو، اس وقت تک تمھارے پاس دین میں
وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ	سے کچھ بھی نہیں ہے اور (اے پیغمبر!) تمھارے
اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا	پروردگار کی طرف سے جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے بجائے
وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ	اس کے کہ یہ لوگ اس سے ہدایت حاصل کریں، تم
الْكٰفِرِيْنَ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ	دیکھو گے کہ ان میں سے بہتوں کا کفر و طغیان اس کی
الَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ	وجہ سے اور زیادہ بڑھ جائے گا۔ تو جن لوگوں نے
وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ	انکار حق کی راہ اختیار کر لی ہے، تم ان کی حالت پر
الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا	بے کار کو غم نہ کھاؤ
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ	جو لوگ تم پر ایمان لائے ہیں، جو یہودی ہیں، جو
(۵ : ۶۸ : ۶۹)	صابی ہیں، جو نصاریٰ ہیں، (یہ ہوں یا کوئی ہو)

جو کوئی بھی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس کے عمل بھی نیک ہوئے تو اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا خوف ہے نہ کسی طرح کی غمگینی۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ان راست باز انسانوں کے ایمان و عمل کا پوری فراخدلی کے ساتھ

پر تمام مذاہب متفق ہیں، دین الٰہی کے ممنوعہ اعمال ہیں۔ یہ بات چونکہ دین کی اصل حقیقت تھی، اس لیے اس میں اختلاف نہ ہو سکا، اور مذہبی گروہوں کی بے شمار گمراہیوں اور حقیقت فراموشیوں پر بھی ہمیشہ معلوم و مسلّم رہی۔ ان اعمال کی اچھائی اور برائی پر نوعِ انسانی کے تمام عہدوں، تمام مذہبوں اور تمام قوموں کا عالمگیر اتفاق، ان کی فطری اصلیت پر ایک بہت بڑی دلیل ہے، پس جہاں تک اعمال کا تعلق ہے، میں انہی باتوں کے کرنے کا حکم دیتا ہوں، جن کی اچھائی عام طور پر جانی بوجھی ہوئی ہے، اور انہی باتوں سے روکتا ہوں جن سے عام طور پر نوعِ انسانی نے انکار کیا ہے یعنی میں معروف کا حکم دیتا ہوں، منکر سے روکتا ہوں۔ پس جب میری دعوت کا یہ حال ہے تو پھر کسی انسان کو بھی جسے راست بازی سے اختلاف نہیں، کیوں مجھ سے اختلاف ہو؟

الدّین القیم اور "فطرت اللہ"

وہ کہتا ہے، یہی راہِ عمل، نوعِ انسانی کے لیے خدا کا ٹھہرایا ہوا فطری دین ہے، اور فطرت کے قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی الدین القیم ہے یعنی سیدھا اور درست دین جس میں کسی طرح کی کجی اور خامی نہیں۔ یہی دین حنیف ہے جس کی دعوت حضرت ابراہیمؑ نے دی تھی۔ اسی کا نام میری اصطلاح میں "الاسلام" ہے۔ یعنی خدا کے ٹھہرائے ہوئے قوانین کی فرمانبرداری :-

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ	تم ہر طرف سے منہ پھیر کر الدّین کی طرف رخ کرو
فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ	یہی خدا کی بناوٹ ہے، جس پر اس نے انسان کو پیدا
عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ	کیا ہے۔ اللہ کی بناوٹ میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی
ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ	"الدین القیم" (یعنی سیدھا اور سچا دین) ہے۔ لیکن
اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ	اکثر انسان ایسے ہیں جو نہیں جانتے (دیکھو) اسی ایک
مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَ	خدا کی طرف متوجہ رہو۔ اس کی نافرمانی سے بچو، نماز

تو اس سے مقصود بھی اسی حقیقت پر زور دینا ہے۔ یعنی جب میری تعلیم تمھارے مقدس نوشتوں کے خلاف کوئی بنیادی نہیں پیش کرتی، اور نہ ان سے تمھیں منحرف کرانا چاہتی ہے، بلکہ سرتاسر مقدس اور موئد ہے، تو پھر تم میں اور مجھ میں نزاع کیوں ہے۔ کیوں تم میرے خلاف اعلانِ جنگ کر دو؟

اصطلاحِ قرآنی میں "المعروف" اور "المنکر"

اور پھر یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، اس نے نیکی کے لیے "معروف" کا اور برائی کے لیے "منکر" کا لفظ اختیار کیا ہے۔ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳۱: ۱۷) معروف "عرف" سے ہے جس کے معنی پہچاننے کے ہیں۔ پس معروف وہ بات ہوئی جو جانی پہچانی بات ہو۔ "منکر" کے معنی انکار کرنے کے ہیں۔ یعنی ایسی بات جس سے عام طور سے انکار کیا گیا ہو۔ پس قرآن نے نیکی اور برائی کے یہ الفاظ اس لیے اختیار کیے کہ وہ کہتا ہے، دنیا میں عقائد و افکار کا کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں جن کے اچھے ہونے پر سب کا اتفاق ہے، اور کچھ باتیں ایسی ہیں جن کے بُرے ہونے پر سب متفق ہیں۔ مثلاً اس بات میں سب کا اتفاق ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے۔ جھوٹ بولنا بُرا ہے۔ اس میں سب کا اتفاق ہے کہ دیانت داری اچھی بات ہے، بد دیانتی برائی ہے۔ اس سے کسی کو اختلاف نہیں کہ ماں باپ کی خدمت، ہمسایہ سے سلوک، مسکینوں کی خبر گیری، مظلوم کی دادرسی انسان کے اچھے اعمال ہیں، اور ظلم اور بدسلوکی بُرے اعمال ہیں۔ گویا یہ وہ باتیں ہوئیں جن کی اچھائی عام طور پر جانی بوجھی ہوئی ہے اور جن کے خلاف جانا عام طور پر قابل انکار و اعتراض ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب، دنیا کے تمام اخلاق، دنیا کی تمام حکمتیں، دنیا کی تمام جماعتیں دوسری باتوں میں کتنا ہی اختلاف رکھتی ہوں، لیکن جہاں تک ان اعمال کا تعلق ہے، سب ہم آہنگ و ہم نوا ہیں۔

قرآن کہتا ہے، یہ اعمال جن کی اچھائی عام طور پر نوعِ انسانی نے جانی بوجھی ہوئی ہے دینِ الٰہی کے مطلوبہ اعمال ہیں۔ اسی طرح وہ اعمال جن سے عام طور پر انکار کیا گیا ہے، اور جن کی برائی

اس نے دین کے لیے الاسلام کا لفظ اسی لیے اختیار کیا ہے کہ "اسلام" کے معنی کسی بات کے مان لینے اور فرماں برداری کرنے کے ہیں۔ وہ کہتا ہے، دین کی حقیقت یہی ہے کہ خدا نے جو قانونِ سعادت انسان کے لیے ٹھہرا دیا ہے، اس کی ٹھیک ٹھیک اطاعت کی جائے۔ وہ کہتا ہے، یہ کچھ انسان ہی کے لیے نہیں ہے، بلکہ تمام کائناتِ ہستی اسی اصل پر قائم ہے۔ سب کے بقاو قیام کے لیے خدا نے کوئی نہ کوئی قانونِ عمل ٹھہرا دیا ہے اور سب اس کی اطاعت کر رہے ہیں۔ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی روگردانی کریں تو کارخانۂ ہستی درہم برہم ہو جائے۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ	پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں، اللہ کا ٹھہرایا ہوا دین چھوڑ کر
وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ	کوئی دوسرا دین ڈھونڈھ نکالیں۔ حالانکہ آسمان اور زمین
وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّ	میں جو کوئی بھی ہے۔ سب یا رونا چار اسی کے ٹھہرائے ہوئے
اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (۳: ۸۲)	(قانون عمل) کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔ اور (بالآخر) سب

اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

وہ جب کہتا ہے "الاسلام" کے سوا کوئی دین اللہ کے نزدیک مقبول نہیں، تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ دینِ حقیقی کے سوا، جو ایک ہی ہے، اور تمام رسولوں کی مشترک تعلیم ہے، انسانی ساخت کی کوئی گروہ بندی مقبول نہیں۔ سورۂ آل عمران میں جہاں یہ بات بیان کی ہے کہ دین کی حقیقی راہ تمام مذہبی رہنماؤں کی تصدیق اور پیروی کی راہ ہے وہیں متصلاً یہ بھی کہہ دیا ہے:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ	اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین چاہے گا
دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ	تو یاد رکھو اس کی راہ کبھی قبول نہ کی جائے گی۔ اور
فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝	وہ آخرت کے دن دیکھے گا کہ تباہ ہونے والوں
(۳: ۸۵)	میں سے ہے۔

اور اسی لیے وہ تمام پیروانِ دعوت کو بار بار متنبہ کرتا ہے کہ دین میں تفرقہ اور گروہ بندی

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ	قائم کرو، اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ، جنھوں نے اپنے
الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا	دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور گروہ بندیوں میں
دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا كُلُّ	بٹ گئے۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے، وہ اسی میں
حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ	مگن ہے۔

"الاسلام" وہ کہتا ہے، خدا کا ٹھہرایا ہوا دین جو کچھ ہے، یہی ہے۔ اس کے سوا جو کچھ بنا لیا گیا ہے، وہ انسانی گروہ بندیوں کی گمراہیاں ہیں۔ پس اگر تم خداپرستی اور عمل صالح کی اصل پر جو تم سب کے یہاں اصل دین ہے، جمع ہو جاؤ اور خود ساختہ گمراہیوں سے باز آجاؤ تو میرا مقصد پورا ہو گیا۔ میں اس سے زیادہ اور کیا چاہتا ہوں۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ	اللہ کے نزدیک دین ایک ہی ہے، اور وہ "الاسلام" ہے
وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ	اور یہ جو اہل کتاب نے اختلاف کیا اور ایک دین پر مجتمع
اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا	رہنے کی جگہ یہودیت اور نصرانیت کی گروہ بندیوں میں بٹ
بَيْنَهُمْ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ	گئے، تو یہ اس لیے ہوا کہ اگرچہ علم و حقیقت کی راہ
اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ فَاِنْ حَآجُّوْكَ	ان پر کھل چکی تھی لیکن آپس کی ضد اور سرکشی سے اختلاف
فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ	میں پڑ گئے اور (یاد رکھو) جو کوئی اللہ کی آیتوں سے
اتَّبَعَنِ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ	انکار کرتا ہے، تو اللہ کا قانونِ مکافات بھی حساب لینے
وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا	میں سست رفتار نہیں
فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا	پھر اگر یہ لوگ تم سے اس بارے میں جھگڑا کریں
عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ (۳: ۱۸)	تو تم کہو، میری اور میرے پیروؤں کی راہ تو یہ ہے کہ اللہ

کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینا۔ اور ہم نے سر جھکا دیا ہے۔ پھر اہل کتاب سے اور اَن پڑھ لوگوں سے (یعنی مشرکین عرب سے) پوچھو، تم بھی اللہ کے آگے جھکتے ہو یا نہیں؟ (یعنی ساری باتیں جھگڑے کی چھوڑ دو یہ بتاؤ تمھیں خداپرستی منظور ہے یا نہیں؟) اگر وہ جھک گئے تو سارا جھگڑا ختم ہو گیا اور انھوں نے راہ پالی، اگر رو گردانی کریں، تو تمھارے ذمہ جو کچھ ہے، وہ پیام حق پہنچا دینا ہے۔ اور اللہ کی نظروں سے بندوں کا حال پوشیدہ نہیں۔

وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۚ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ (۳ : ۱۰۵)

جو ایک دین پر قائم رہنے کی جگہ) جدا جدا ہو گئے اور اختلافات میں پڑ گئے، باوجودیکہ روشن دلیلیں ان کے سامنے آچکی تھیں (یاد رکھو) یہی لوگ ہیں جن کے لیے (کامیابی و فلاح کی جگہ) بڑا (بھاری) عذاب ہے۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (۶ : ۱۵۵)

اور (دیکھو) یہ میری راہ ہے، بالکل سیدھی سیدھی راہ، پس اسی ایک راہ پر چلو، طرح طرح کی راہوں کے پیچھے نہ پڑ جاؤ کہ وہ تمھیں خدا کی راہ سے ہٹا کر جدا جدا کر دیں گی۔ یہی بات ہے جس کا خدا تمھیں حکم دیتا ہے تا کہ تم (نافرمانی سے) بچو۔

قرآن اور اس کے مخالفوں میں بنائے نزاع

اب چند لمحوں کے لیے اس نزاع پر غور کرو جو قرآن اور اس کے مخالفوں میں پیدا ہو گئی تھی۔ یہ مخالف کون تھے؟ پچھلے مذاہب کے پیرو تھے جن میں بعض کے پاس کتاب تھی بعض کے پاس نہ تھی۔ اچھا بنائے نزاع کیا تھی؟

کیا یہ تھی کہ قرآن نے ان کے بانیوں اور رہنماؤں کو جھٹلایا تھا، یا ان کی مقدس کتابوں سے انکار کیا تھا اور اس لیے وہ اس کی مخالفت میں کمربستہ ہو گئے تھے؟

کیا یہ تھی کہ اس نے دعویٰ کیا تھا، خدا کی سچائی صرف میرے حصے میں آئی ہے، اور تمام پیروانِ مذاہب کو چاہیے، اپنے اپنے نبیوں سے برگشتہ ہو جائیں؟

سے بچیں، اور اسی گمراہی میں مبتلا نہ ہو جائیں جس سے قرآن نے نجات دلائی ہے۔ وہ کہتا ہے میری دعوت نے تمام انسانوں کو جو مذہب کے نام پر ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے، خدا پرستی کی راہ میں اس طرح جوڑ دیا کہ ایک دوسرے کے جان نثار بھائی بن گئے۔ ایک یہودی جو پہلے حضرت مسیحؑ کا نام سنتے ہی نفرت سے بھر جاتا تھا، ایک عیسائی جو ہر یہودی کے خون کا پیاسا تھا، ایک مجوسی جس کے نزدیک تمام غیر مجوسی ناپاک تھے، ایک عرب جو اپنے سوا سب کو انسانی شرف و محاسن سے تہی دست سمجھتا تھا، ایک صابی جو یقین کرتا تھا کہ دنیا کی قدیم سچائی صرف اسی کے حصے میں آئی ہے ان سب کو دعوت قرآنی نے ایک صف میں کھڑا کر دیا ہے، اور اب یہ سب ایک دوسرے سے نفرت کرنے کی جگہ، ایک دوسرے کے مذہبی رہنماؤں کی تصدیق کرتے، اور سب کی بتائی ہوئی متفقہ راہ ہدایت پر گامزن ہیں:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ	اور (دیکھو) سب مل جل کر اللہ کی رسی مضبوط پکڑ
جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا	لو اور جدا جدا نہ ہو، اللہ نے تم پر جو فضل و کرم کیا ہے
نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ	اسے یاد کرو۔ تمھارا حال یہ تھا کہ ایک دوسرے کے دشمن
اَعْدَاۤءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ	ہو رہے تھے۔ پھر اللہ نے تمھارے دلوں میں باہم
فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا	دگر الفت پیدا کر دی۔ پھر ایسا ہوا کہ انعام الہیٰ سے
وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ	بھائی بھائی ہو گئے۔ اور (دیکھو) تمھارا حال یہ تھا
مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا	گویا آگ سے بھرا ہوا گڑھا ہے، اور اس کے کنارے
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ	کھڑے ہو۔ لیکن اللہ نے تمھیں بچا لیا۔ اللہ اسی طرح
اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ	اپنی کارفرمائیوں کی نشانیاں تم پر واضح کرتا ہے تاکہ
وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا	اور (دیکھو) ان لوگوں کی سی چال اختیار نہ کر لینا

یہ بھی ہے، لیکن صرف یہی وجہ نزاع نہیں ہو سکتی۔ سوال یہ ہے کہ یہودیوں نے کیوں مخالفت کی جو بُت پرستی سے قطعاً کنارہ کش تھے؟ عیسائی کیوں برسرِ پیکار ہو گئے جنھوں نے کبھی بُت پرستی کی حمایت کا دعویٰ نہیں کیا؟

پیروانِ مذاہب کی مخالفت اس لیے نہ تھی کہ جھٹلاتا کیوں ہے؟ بلکہ اس لیے کہ جھٹلاتا کیوں نہیں؟

اصل یہ ہے کہ پیروانِ مذاہب کی مخالفت اس لیے نہ تھی کہ وہ انھیں جھٹلاتا کیوں ہے؟ بلکہ اس لیے تھی کہ جھٹلاتا کیوں نہیں؟ ہر مذہب کا پیرو چاہتا تھا کہ وہ صرف اسی کو سچّا کہے باقی سب کو جھٹلائے۔ اور چونکہ وہ یکساں طور پر سب کی تصدیق کرتا تھا، اس لیے کوئی بھی اس سے خوش نہیں ہو سکتا تھا۔ یہودی اس بات سے تو بہت خوش تھے کہ قرآن حضرت موسیٰؑ کی تصدیق کرتا ہے، لیکن صرف وہ اتنا ہی نہیں کرتا تھا۔ وہ حضرت مسیحؑ کی بھی تصدیق کرتا ہے، اور یہیں آکر اس میں اور یہودیوں میں نزاع شروع ہو جاتی تھی۔ عیسائیوں کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا کہ حضرت مسیحؑ اور حضرت مریمؑ کی پاکی و صداقت کا اعلان کیا جائے؟ لیکن قرآن صرف اتنا ہی نہیں کرتا تھا۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ نجات کا دار و مدار اعتقاد و عمل پر ہے۔ نہ کفارہ اور اصطباغ پر۔ اور قانونِ نجات کی یہ عالمگیر وسعت عیسائی کلیسا کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔

اسی طرح قریشِ مکہ کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی دل خوش کن صدا نہیں ہو سکتی تھی کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی بزرگی کا اعتراف کیا جائے لیکن جب وہ دیکھتے تھے کہ قرآن جس طرح ان دونوں کی بزرگی کا اعتراف کرتا ہے، اسی طرح یہودیوں کے پیغمبروں اور عیسائیوں کے داعی کا بھی معترف ہے، تو ان کے نسلی اور جماعتی غرور کو ٹھیس لگتی تھی۔ وہ کہتے تھے ایسے لوگ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیل کے پیرو کیونکر ہو سکتے ہیں، جو اُن کی بزرگی اور صداقت کی صف میں دوسروں کو بھی لا کھڑا کرتے ہیں۔

یا پھر اس نے دین کے نام سے کوئی ایسی بات کر دی تھی جو پیروانِ مذہب کے لیے بالکل نئی بات تھی اور اس لیے انھیں قدرتی طور پر ماننے میں تامّل تھا۔

قرآن کے صفحے کھُلے ہوئے ہیں اور اس کے نزول کی تاریخ بھی دنیا کے سامنے ہے۔ یہ دونوں ہمیں بتلاتے ہیں کہ ان تمام باتوں میں سے کوئی بات بھی نہ تھی، اور نہ ہو سکتی تھی۔ اس نے نہ صرف ان تمام رہنماؤں کی تصدیق کی جن کے نام لیوا اس کے سامنے تھے، بلکہ صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا، مجھ سے پہلے جتنے بھی پیغمبر آچکے ہیں، میں سب کی تصدیق کرتا ہوں اور ان میں سے کسی ایک کے انکار کو بھی خدا کی سچائی کا انکار سمجھتا ہوں۔ اس نے کسی مذہب کے ماننے والے سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ اپنے مذہب کی دعوت سے انکار کر دے۔ بلکہ جب کبھی مطالبہ کیا تو یہی کہا کہ اپنے اپنے مذہبوں کی حقیقی تعلیم پر کاربند ہو جاؤ، کیونکہ تمام مذہبوں کی اصلی تعلیم ایک ہی ہے۔ اس نے نہ تو کوئی نیا اصول پیش کیا، نہ کوئی نیا عمل بتایا۔ اس نے ہمیشہ ان ہی باتوں پر زور دیا جو دنیا کے تمام مذاہب کی سب سے زیادہ جانی بوجھی ہوئی باتیں رہی ہیں۔ یعنی ایمان اور عمل صالح۔ اس نے جب کبھی لوگوں کو اپنی طرف بلایا ہے تو یہی کہا ہے، اپنے اپنے مذہبوں کی حقیقت از سرِ نو تازہ کر لو۔ تمھارا ایسا کرنا ہی مجھے قبول کر لینا ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب قرآن کی دعوت کا یہ حال تھا تو پھر آخر اس میں اور اس کے مخالفوں میں وجہ نزاع کیا تھی؟ ایک شخص جو کسی کو برا نہیں کہتا، سب کو مانتا اور سب کی تعظیم کرتا ہے اور ہمیں ان باتوں کی تلقین کرتا ہے جو سب کے یہاں مانی ہوئی ہیں کوئی اس سے لڑے تو کیوں لڑے؟ اور کیوں کر اس کا ساتھ دینے سے انکار ہو۔

کہا جاتا ہے کہ قریش مکہ کی مخالفت اس بنا پر تھی کہ قرآن نے بُت پرستی سے انکار کر دیا تھا، اور وہ بُت پرستی کے طریقوں سے مالوف ہو چکے تھے۔ بلا شبہ ایک وجہ نزاع

گئی تھی۔ ہر گروہ بندی کا آدمی سمجھتا تھا، دین کی سچائی صرف اسی کے حصے میں آئی ہے۔ جو انسان اس کی مذہبی حد بندی میں داخل ہے، نجات یافتہ ہے، جو داخل نہیں ہے، نجات سے محروم ہے۔

(۲) ہر گروہ کے نزدیک مذہب کی اصل و حقیقت محض اس کے ظاہری اعمال و رسوم تھے۔ جونہی ایک انسان انھیں اختیار کر لیتا، یقین کیا جاتا کہ نجات و سعادت اسے حاصل ہو گئی۔ مثلاً عبادت کی شکل، قربانیوں کے رسوم، کسی خاص طعام کا کھانا یا نہ کھانا، کسی خاص وضع و قطع کا اختیار کرنا یا نہ کرنا۔

(۳) چونکہ یہ اعمال و رسوم ہر مذہب میں الگ الگ تھے، اور ہر گروہ کے اجتماعی مقتضیات یکساں نہیں ہو سکتے تھے: اس لیے ہر مذہب کا پیرو یقین کرتا تھا کہ دوسرا مذہب، مذہبی صداقت سے خالی ہے۔ کیونکہ اس کے اعمال و رسوم ویسے نہیں ہیں جیسے خود اس نے اختیار کر رکھے ہیں۔

(۴) ہر مذہبی گروہ کا دعویٰ صرف یہی نہ تھا کہ وہ سچا ہے، بلکہ یہ بھی تھا کہ دوسرا جھوٹا ہے۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہر گروہ صرف اتنے ہی پر قانع نہیں رہتا کہ اپنی سچائی کا اعلان کرے، بلکہ یہ بھی ضروری سمجھتا کہ دوسروں کے خلاف تعصب و نفرت پھیلائے۔ اس صورت حال نے نوع انسانی کو ایک دائمی جنگ و جدال کی حالت میں مبتلا کر دیا تھا۔ مذہب اور خدا کے نام پر ہر گروہ دوسرے گروہ سے نفرت کرتا اور اس کا خون بہانا جائز سمجھتا۔

(۵) لیکن قرآن نے نوع انسانی کے سامنے مذہب کی عالمگیر سچائی کا اصول پیش کیا۔ ا اس نے صرف یہی نہیں بتایا کہ ہر مذہب میں سچائی ہے، بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ اس نے کہا "دین خدا کی عام بخشش ہے اس لیے ممکن نہیں کہ کسی ایک جماعت ہی کو دیا گیا ہو۔ دوسروں کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو۔

تین اصول جو قرآن میں اور اس کے مخالفوں میں بناءِ نزاع ہوئے

مختصراً یوں سمجھنا چاہیئے کہ قرآن کے تین اصول ایسے تھے جو اس میں اور تمام پیروانِ مذاہب میں وجہ نزاع ہو گئے۔

(۱) وہ مذہبی گروہ بندی کی روح کا مخالف تھا، اور دین کی وحدت یعنی ایک ہونے کا اعلان کرتا تھا۔ اگر پیروانِ مذاہب یہ مان لیتے، تو انھیں یہ تسلیم کر لینا پڑتا کہ دین کی سچائی کسی ایک ہی گروہ کے حصے میں نہیں آئی ہو۔ سب کو یکساں طور پر ملی ہو۔ لیکن یہی ماننا ان کی گروہ پرستی پر شاق گذرتا تھا۔

(۲) قرآن کہتا تھا، نجات اور سعادت کا دار و مدار اعتقاد و عمل پر ہے۔ نسل، قوم، گروہ بندی اور ظاہری رسم ریت پر نہیں ہے۔ اگر یہ اصل وہ تسلیم کر لیتے تو پھر نجات کا دروازہ بلا امتیاز تمام نوعِ انسانی پر کھل جاتا۔ اور کسی ایک مذہبی حلقہ کی ٹھیکیداری باقی نہ رہتی۔ لیکن اس بات کے لیے ان میں سے کوئی بھی تیار نہ تھا

(۳) وہ کہتا تھا کہ اصل دین خدا پرستی ہے، اور خدا پرستی یہ ہے کہ ایک خدا کی براہ راست پرستش کی جائے۔ لیکن پیروان مذاہب نے کسی نہ کسی شکل میں شرک و بت پرستی کے طریقے اختیار کر لیے تھے۔ اور گو انھیں اس بات سے انکار نہ تھا کہ اصل دین خدا پرستی ہی ہے لیکن یہ بات شاق گذرتی تھی کہ اپنے مالوف و معتاد طریقوں سے دست بردار ہو جائیں۔

خلاصۂ بحث

متذکرۂ صدر تفصیلات کا ماحصل حسب ذیل دفعات میں بیان کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) نزولِ قرآن کے وقت دنیا کا مذہبی تخیل اس سے زیادہ وسعت نہیں رکھتا تھا کہ نسلوں، خاندانوں اور قبیلوں کی معاشرتی حد بندیوں کی طرح، مذہب کی بھی ایک خاص گروہ بندی کر لی

"الدین" اور "الاسلام" کے نام سے پکارتا ہے؟

ز وہ کہتا ہے خدا کا دین اس لیے نہیں ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے نفرت کرے بلکہ اس لیے ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان سے محبت کرے اور سب ایک ہی پروردگار کے رشتۂ عبودیت میں بندھ کر ایک ہو جائیں۔ وہ کہتا ہے، خدا کا دین جب سب کا پروردگار ایک ہے، جب سب کا مقصود اسی کی بندگی ہے، جب ہر انسان کے لیے وہی ہونا ہے، جیسا کچھ اس کا عمل ہے تو پھر خدا اور مذہب کے نام پر یہ تمام جنگ و نزاع کیوں ہے؟

(۶) مذاہبِ عالم کا اختلاف صرف اختلاف ہی کی حد تک نہیں رہا ہے بلکہ باہمی نفرت و مخاصمت کا ذریعہ بن گیا۔ سوال یہ ہے کہ یہ مخاصمت کیونکر دور ہو؟ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تمام پیروانِ مذہب اپنے دعوی میں سچے مان لیے جائیں، کیونکہ ہر مذہب کا پیرو صرف اسی بات کا مدعی نہیں ہے کہ وہ سچا ہے بلکہ اس کا بھی مدعی ہے کہ دوسرے جھوٹے ہیں۔ پس اگر ان کے دعاوی مان لیے جائیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر مذہب بیک وقت سچا بھی ہے اور جھوٹا بھی ہے۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ سب کو جھوٹا قرار دیا جائے کیونکہ اگر تمام مذاہب جھوٹے ہیں، تو پھر مذہب کی سچائی ہے کہاں؟ پس اگر کوئی صورت رفع نزاع کی ہو سکتی ہے، تو وہ وہی ہے جس کی دعوت لے کر قرآن نمودار ہوا ہے۔ تمام مذاہب سچے ہیں، کیونکہ اصل دین ایک ہی ہے۔ اور سب کو دیا گیا ہے، لیکن تمام پیروانِ مذہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں، کیونکہ دین کی حقیقت اور وحدت ضائع کر دی ہے، اور اپنی گمراہیوں کی الگ الگ ٹولیاں بنالی ہیں۔ اگر ان گمراہیوں سے لوگ باز آجائیں اور اپنے اپنے مذہب کی حقیقی تعلیم پر کاربند ہو جائیں تو مذاہب کی تمام تنازعات ختم ہو جائیں گی۔ ہر گروہ دیکھ لے گا کہ اس کی راہ بھی اصلاً وہی ہے جو اور تمام

ب۔ اس نے کہا خدا کے تمام قوانینِ فطرت کی طرح انسان کی روحانی سعادت کا قانون بھی ایک ہی ہے اور سب کے لیے ہے۔ پس پیروانِ مذہب کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ انھوں نے دینِ الٰہی کی وحدت فراموش کر کے الگ الگ گروہ بندیاں کر لی ہیں۔ اور ہر گروہ بندی دوسری گروہ بندی سے لڑ رہی ہے۔

ج اس نے بتایا کہ خدا کا دین اس لیے تھا کہ نوعِ انسانی کا تفرقہ و اختلاف دور ہو۔ اس لیے نہ تھا کہ تفرقہ و نزاع کی علت بن جائے۔ پس اس سے بڑھ کر گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو چیز تفرقہ دور کرنے کے لیے آئی تھی اسی کو تفرقہ کی بنیاد بنا لیا ہے۔

د اس نے بتایا کہ ایک چیز دین ہے، ایک شرع و منہاج ہے۔ دین ایک ہی ہے، اور ایک ہی طرح پر سب کو دیا گیا ہے۔ البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہوا اور یہ اختلاف ناگزیر تھا۔ کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی۔ اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو، ویسے ہی احکام و اعمال بھی اس کے لیے اختیار کیے جائیں۔ پس شرع و منہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہو جا سکتے۔ تم نے دین کی حقیقت تو فراموش کر دی ہے۔ محض شرع و منہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہو۔

ہ اس نے بتلایا کہ تمھاری مذہبی گروہ بندیاں اور ان کے ظواہر و رسوم کو انسانی نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں۔ یہ گروہ بندیاں تمھاری بنائی ہوئی ہیں۔ ورنہ خدا کا ٹھہرایا ہوا دین تو ایک ہی ہے۔ وہ دین حقیقی کیا ہے؟ وہ کہتا ہے ایمان اور عملِ صالح کا قانون

و اس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اس کی دعوت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمام مذاہب سچے ہیں لیکن پیروانِ مذاہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سرِ نو اختیار کر لیں تو میرا کام پورا ہو گیا اور انھوں نے مجھے قبول کر لیا۔ تمام مذاہب کی یہی مشترک اور متفقہ سچائی ہے جسے وہ

یہ انعام یافتہ انسان کون ہیں، جن کی راہ سیدھی راہ ہوئی۔ قرآن نے جا بجا واضح کیا ہے کہ خدا کے تمام رسول اور راست باز انسان جو دنیا کے مختلف عہدوں اور گوشوں میں گذر چکے ہیں، انعام یافتہ انسان ہیں اور انہیں کی راہ صراطِ مستقیم ہے۔

وَمَن يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُولَ	اور جس کسی نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی تو بلاشبہ
فَأُولٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ	وہ ان لوگوں کا ساتھی ہوا جن پر اللہ نے انعام کیا ہے
اللّٰهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ	یہ انعام یافتہ جماعت نبیوں کی ہے، صدیقوں کی ہے
وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ	شہدا کی ہے، نیک عمل انسانوں کی ہے اور جس کے
وَالصَّالِحِينَ ۚ وَحَسُنَ	ساتھی ایسے لوگ ہوں، تو کیا ہی اچھی اس کی
أُولٰئِكَ رَفِيقًا ٥ (۴:۶۹)	رفاقت ہے۔

اس آیت میں بالترتیب چار جماعتوں کا ذکر کیا گیا ہے، اور انھیں انعام یافتہ قرار دیا ہے: انبیار، صدیقین، شہدا، صالحین۔

"انبیار" سے مقصود خدا کی سچائی کے تمام پیغامبر ہیں جو نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے پیدا ہوئے۔

"صدیق" سے مقصود ایسے انسان ہیں جو کامل معنوں میں سچے ہوں۔ یعنی سچائی کے سانچے میں کچھ اس طرح ڈھلے ہوئے ہوں کہ سچائی کے خلاف کوئی بات ان کے دماغ میں اتر ہی نہ سکے۔

"شہید" کے معنی گواہ کے ہیں یعنی ایسے انسان جو اپنے قول و فعل سے حق و صداقت کی شہادت بلند کرنے والے ہوں

"صالحین" سے مقصود وہ تمام انسان ہیں جو نیک عملی کی راہ میں استقامت رکھیں

گروہوں کی راہ ہے۔ قرآن کہتا ہے تمام مذاہب کی یہی مشترک اور متفقہ حقیقت "الدین" ہے۔ یعنی نوعِ انسانی کے لیے حقیقی دین اور اسی کو وہ "الاسلام" کے نام سے پکارتا ہے۔

(۷) نوعِ انسانی کی باہمی یگانگت اور اتحاد کے جتنے رشتے بھی ہو سکتے تھے، سب انسان کے ہاتھوں ٹوٹ چکے۔ سب کی نسل ایک تھی، مگر ہزاروں نسلیں ہو گئیں۔ سب کی قومیت ایک تھی، مگر بے شمار قومیتیں بن گئیں۔ سب کی وطنیت ایک تھی، لیکن سینکڑوں وطنیتوں میں بٹ گئے۔ سب کا درجہ ایک تھا، لیکن امیر و فقیر، شریف و وضیع اور ادنیٰ و اعلیٰ کے بہت سے درجے ٹھہرا لیے گئے۔ ایسی حالت میں کون سا رشتہ ہے جو ان تمام فرقوں پر غالب آ سکتا ہے اور تمام انسان ایک ہی صف میں کھڑے ہو جا سکتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا پرستی کا رشتہ۔ یہی ایک رشتہ ہے جو انسانیت کا بچھڑا ہوا گھرانا پھر آباد کر دے سکتا ہے۔ یہ اعتقاد کہ ہم سب کا پروردگار ایک ہی پروردگار ہے، اور ہم سب کے سر اسی ایک چوکھٹ پر جھکے ہوئے ہیں، یک جہتی اور یگانگت کا ایسا جذبہ پیدا کر دیتا ہے کہ ممکن نہیں، انسان کے بنائے ہوئے تفرقے اس پر غالب آ سکیں

صراطِ مستقیم

اسی بنا پر سورۂ فاتحہ میں جس دعا کی تلقین کی گئی، وہ "صراطِ مستقیم" پر چلنے کی طلبگاری ہے۔ صراط کے معنی راہ کے ہیں، اور "مستقیم" کے معنی سیدھا ہونے کے۔ پس صراطِ مستقیم" ایسی راہ ہوئی جو سیدھی ہو۔ کسی طرح کا پیچ و خم نہ ہو۔ پھر اس راہ کی پہچان یہ بتلائی کہ "صراطَ الَّذِینَ اَنعَمتَ عَلَیھِم ۵ غَیرِ المَغضُوبِ عَلَیھِم وَلَا الضَّآلِّینَ ۵ یعنی ان لوگوں کی راہ جن پر خدا کا انعام ہوا۔ ان کی راہ نہیں جو مغضوب ہوئے، نہ ان کی جو گمراہ ہیں۔

سورۂ نحل میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی نسبت ہے: وَهَدٰهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۲۱:۱۶) خدا نے اُسے صراطِ مستقیم دکھادی۔ سورہ زخرف میں حضرت مسیح (علیہ السلام) کی زبانی سنتے ہیں: اِنَّ اللّٰهَ رَبِّىْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (۶۴:۴۳) اللہ میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے۔ پس اسی کی بندگی کرو۔ یہی صراطِ مستقیم ہے! سورۂ انعام میں پہلے حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کا ذکر کیا ہے، پھر سلسلۂ ابراہیمی کے متعدد نبیوں کا جو تورات کی مشہور شخصیتیں ہیں۔ اس کے بعد کہا ہے: وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۸۷:۶) ان سب کو ہم نے صراطِ مستقیم دکھادی۔

اصل یہ ہے کہ خدا کے عالمگیر دین کی حقیقت ظاہر کرنے کے لیے صراطِ مستقیم سے بہتر تعبیر نہیں ہوسکتی تھی۔ تم کسی خاص مقام تک پہنچنے کے لیے کتنی ہی راہیں نکال لو، لیکن سیدھی راہ ہمیشہ ایک ہی ہوگی اور اسی پر چل کر ہر مسافر منزلِ مقصود تک بحفاظت پہنچ سکیگا۔ علاوہ بریں سیدھی راہ ہی ہمیشہ شاہراہِ عام کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ تمام مسافر خواہ کسی گوشے کے رہنے والے ہوں لیکن سب مل جل کر وہی راہ اختیار کریں گے، اور کبھی یہ نہ کریں گے کہ الگ الگ ٹولیاں بناکر ٹیڑھی ترچھی راہوں میں متفرق ہوجائیں۔ قرآن کہتا ہے، ٹھیک اسی طرح دین کی سیدھی راہ بھی ایک ہی ہے۔ بہت سی نہیں ہوسکتیں، اور وہ اول دن سے موجود ہے ہر عہد، ہر قوم، ہر ملک اسی پر چل کر منزلِ مقصود تک پہنچا ہے۔ بعد کو پیروانِ مذہب نے ایسا کیا کہ بہت سی ٹیڑھی ترچھی راہیں نکال لیں، اور ایک راہ پر متفق رہنے کی جگہ، الگ الگ ٹولیاں بناکر متفرق ہوگئے۔ وہ کہتا ہے، اب اگر تم چاہتے ہو کہ منزلِ مقصود کا سراغ پاؤ، تو چاہیے کہ اسی سیدھی راہ پر اکٹھے ہوجاؤ۔ فصراطہا مستقیما سهلا مسلوکا واسعا موصلا الی المقصود

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا اور (دیکھو) یہ میری راہ ہے۔ بالکل سیدھی

اور برائی کی راہوں سے کنارہ کش ہوں

پس معلوم ہوا، انعام یافتہ انسانوں سے مقصود، دنیا کے تمام رسول اور اعیانِ حق ہیں جو قرآن کے نزول سے پہلے دنیا میں پیدا ہو چکے تھے اور تمام راست باز انسان ہیں جو نوعِ انسانی میں گذر چکے تھے۔ اس میں نہ تو کسی خاص نسل و قوم کی خصوصیت رکھی گئی ہے نہ کسی خاص مذہب اور اس کے پیروؤں کی۔ دنیا کے تمام نبی، تمام صدیق، تمام شہدائے حق، تمام صالح انسان، خواہ کسی ملک و قوم میں ہوئے ہوں، قرآن کے نزدیک انعام یافتہ انسان ہیں، اور انہی کی راہ "صراطِ مستقیم" ہے۔

خدا کے ان تمام رسولوں اور نوعِ انسانی کے راست باز افراد کی راہ کونسی راہ تھی؟ وہی راہ جسے قرآن دینِ حقیقی کی راہ قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے، دنیا میں جس قدر بھی سچائی کے داعی آئے، سب نے یہی تعلیم دی کہ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ ! "خدا کا ایک ہی دین قائم رکھو، اور اس راہ میں جدا جدا نہ ہو جاؤ۔" یہی راہ سچائی کی سیدھی راہ ہے

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جابجا الدین کو صراطِ مستقیم سے بھی تعبیر کیا ہے۔ سورۂ شوریٰ میں پیغمبرِ اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے، تم صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کرنے والے ہو، اور صراطِ مستقیم ہی صراط اللہ ہے، یعنی اللہ کی ٹھہرائی ہوئی راہ سعادت۔

وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ (۴۲: ۵۲-۵۳)	اور (اے پیغمبر) بلاشبہ تم صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کرنے والے ہو۔ صراط اللہ، یعنی اللہ کی راہ کی طرف۔ وہ اللہ کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے، ہاں یاد رکھو، (کائنات خلقت کا)

اسی طرح وہ جابجا کہتا ہے کہ خدا کے تمام رسولوں کی دعوت صراطِ مستقیم کی دعوت تھی۔

یہ سُبلِ متفرّقہ کیا ہیں؟ اسی گمراہی کا نتیجہ ہیں جسے قرآن نے "تشیّع" اور "تحزّب" کی گمراہی سے تعبیر کیا ہے۔ اور تشریح اس کی اوپر گذر چکی۔

دینِ حقیقی کی راہ کا سیدھا ہونا اور "سُبلِ متفرقہ" یعنی خودساختہ گروہ بندیوں کا پُرپیچ و خم ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہر انسان بغیر کسی عقلی کاوش کے سمجھ لے سکتا ہے۔ خدا کا دین اگر انسان کی ہدایت کے لیے ہے تو ضروری ہے کہ خدا کے تمام قوانین کی طرح یہ بھی صاف اور واضح ہو، اس میں کوئی راز نہ ہو، کوئی پیچیدگی نہ ہو، ناقابلِ حل معمّہ نہ ہو، اعتقاد میں سہل ہو اور عمل میں ہلکا۔ ہر عقل اسے بُوجھ لے، ہر طبیعت اس پر مطمئن ہو جائے۔ اچھا، اب غور کرو، یہ تعریف کس راہ پر صادق آتی ہے، ان مختلف راہوں پر جو پیروانِ مذہب نے الگ الگ گروہ بندیاں کرکے نکالی ہیں، یا اس ایک ہی راہ پر جسے قرآن اصل دین کی راہ بتلاتا ہے۔

ان گروہ بندیوں میں سے کوئی گروہ بندی بھی ایسی نہیں ہے، جو اپنے بوجھل عقیدوں، ناقابلِ فہم عقدوں اور ناقابلِ برداشت عملوں کی ایک طول طویل فہرست نہ ہو۔ ہم یہاں تفصیلات میں نہیں جائیں گے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا کے تمام پیروانِ مذہب کے مزعومہ عقائد و اعمال کا کیا حال ہے، اور ان کی نوعیت کیسی ہے؟ مذہب کا عقل کے لیے معمّہ اور طبیعت کے لیے بوجھ ہونا، ایک ایسی بات ہے جو عام طور پر مذاہب کا خاصّہ تسلیم کرلی گئی ہے۔ لیکن قرآن جس راہ کو دینِ حقیقی کی راہ کہتا ہے، اس کا کیا حال ہے؟ اس کی راہ تو اتنی واضح، اتنی سہل، اتنی مختصر ہے کہ عقائد و اعمال کی پوری فہرست دو لفظوں میں ختم کردی جاسکتی ہے: ایمان اور عملِ صالح۔ اس کے عقائد میں عقل کے لیے کوئی بوجھ نہیں۔ اس کے اعمال میں طبیعت کے لیے کوئی سختی نہیں ہر طرح کے پیچ و خم سے پاک، ہر معنی میں اعتقاد و عمل کی سیدھی سے سیدھی بات۔ حنیفیہ السمحۃ، لیلھا کنھارھا! اس کی رات بھی اس کے دن کی طرح روشن ہے۔

فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ	راہ۔ پس اسی ایک راہ پر چلو اور طرح طرح کے
فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ	راستوں کے پیچھے نہ پڑو۔ وہ تمھیں خدا کی
ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ	سیدھی راہ سے ہٹا کر جلد جدا کر دیں گے
تَتَّقُوْنَ ○ (۶: ۱۵۳)	یہی بات ہے جس کا خدا تمھیں حکم دیتا ہے تاکہ

چنانچہ یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے جب "صراطِ مستقیم" کی اس تفسیر پر نظر ڈالی جائے جو خود پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمائی ہے:

عن ابن مسعودؓ قال خطّ	عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں، رسول اللہ (صلی
لنا رسول اللہ صلی اللہ	اللہ علیہ وسلم) نے اپنی انگلی سے ایک لکیر کھینچی
علیہ وسلم خطّا بیدہ ○	اور فرمایا: یوں سمجھو کہ یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا راستہ
ثم قال ھذا سبیل اللہ	ہے، بالکل سیدھا، اس کے بعد اس لکیر کے
مستقیماً ثم خطّ خطوطاً	دونوں طرف بہت سی ترچھی لکیریں کھینچ دیں اور
عن یمین ذالک الخط و	فرمایا۔ یہ طرح طرح کے راستے ہیں جو بنا لیے
عن شمالہ ثم قال وھذہ	گئے ہیں۔ اور ان میں کوئی راستہ نہیں جس کی
السبیل لیس منھا سبیل	طرف بلانے کے لیے ایک شیطان موجود
الا علیہ شیطان یدعوا	نہ ہو۔ پھر یہ آیت پڑھی: وَاَنَّ هٰذَا
الیہ ثم قرأ ھذہ الآیۃ	صراطی مستقیماً الی آخرہ

اس سے معلوم ہوا، تمام اِدھر اُدھر کے ٹیڑھے ترچھے راستے "سبل متفرّقہ" ہیں جو جمعیت بشری کو متحد کرنے کی جگہ متفرق کر دیتے ہیں، اور درمیان کی ایک ہی سیدھی راہ "صراطِ مستقیم" ہے۔ یہ متفرّق کرنے کی جگہ تمام رہروانِ منزل کو ایک ہی شاہراہ پر جمع کر دیتی ہے۔

طریقہ سے بیان نہیں کی جاسکتی۔ کہ وہ کامیاب انسان کی راہ ہے۔ اگر اس کی پہچان منطقی تعریفوں کی طرح بیان کی جاتی تو ظاہر ہے، نہ تو ہر انسان بغیر کاوش فکر کے سمجھ سکتا، نہ قطعی طور پر کسی ایک ہی راہ پر منطبق کی جاسکتی

ثانیاً: جہاں تک انسانی فلاح وسعادت کا تعلق ہے، صراطِ مستقیم کی تعبیر ہی ہر لحاظ سے حقیقی اور قدرتی تعبیر ہو سکتی تھی۔ انسان کے فکر وعمل کا کوئی گوشہ ہو، لیکن صحت و درستگی کی راہ ہمیشہ وہی ہوگی جو سیدھی راہ ہو۔ جہاں انحراف اور کجی پیدا ہوئی، نقص و فساد ظہور میں آگیا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں میں سیدھا ہونا اور سیدھی چال چلنا فلاح وسعادت کے معنوں میں عام طور پر بولا جاتا ہے۔ گویا اچھائی کے معنی میں یہ ایک ایسی تعبیر ہے جو تمام نوع انسانی کی عالمگیر تعبیر کہی جاسکتی ہے۔

حضرت مسیحؑ سے چار سو برس پہلے دارا یوش اول نے جو فرامین کندہ کرائے تھے، ان میں سے بے ستون کا کتبہ آج تک موجود ہے۔ اور اس کا خاتمہ ان جملوں پر ہوتا ہے: "اے انسان! اہورا مزد کا (یعنی خدا کا) تیرے لیے حکم یہ ہے کہ برائی کا دھیان نہ کر۔ سیدھا راستہ نہ چھوڑ۔ گناہ سے بچتا رہ۔"

پس صراطِ مستقیم پر چلنے کی طلب، زندگی کی تمام راہوں میں درستگی و صحت کی راہ چلنے کی طلب ہوئی اور اسی لیے سعی وعمل کے ہر گوشے میں انعام یافتہ گروہ وہی ہو سکتا ہے جس کی راہ صراطِ مستقیم ہو۔

المغضوب علیہم اور "الضالین"

پھر صراطِ مستقیم کی پہچان صرف اس کے مثبت پہلو ہی سے واضح نہیں کی گئی بلکہ اس کا ضد مخالف پہلو بھی واضح کر دیا گیا غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ۔ ان کی راہ نہیں جو مغضوب ہوئے، نہ ان کی جو

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا ؕ (۱:۱۸)

ہر طرح کی ستائش اللہ ہی کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی، اور اس میں کسی طرح کی بھی کجی نہیں رکھی۔

بہرحال قرآن کا پیرو وہ ہے جو دین کی سیدھی راہ پر چلنے والا ہے۔ وہ راہ نہیں جو کسی خاص گروہ، کسی خاص نسل، کسی خاص قوم، کسی خاص عہد کی راہ ہے، بلکہ خدا کی عالمگیر سچائی کی راہ، جو ہر جگہ اور ہر عہد میں نمایاں ہوئی ہے اور ہر طرح کی جغرافیائی اور جماعتی حد بندیوں کے امتیازات سے پاک ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ (۶۴:۴۳)

اللہ میرا اور تمہارا دونوں کا پروردگار ہے۔ پس اسی کی بندگی کرو۔ یہی صراطِ مستقیم ہے۔

علاوہ بریں بحث و نظر کے بعض دوسرے پہلو بھی ہیں۔ جو اس موقع پر پیشِ نظر رہنے چاہئیں۔

اوّلاً: فلاح و سعادت کی راہ کو "سیدھی راہ" سے تعبیر کیا گیا، اور سیدھی راہ پر چلنا ایک ایسی بات ہے جس کی سمجھ اور طلب بالطبع ہر انسان کے اندر موجود ہے۔ پھر اس کی پہچان بتلاتے ہوئے کوئی اس طرح کی تعریف نہیں کی جس کے سمجھنے اور منطبق کرنے میں ذہنی کاوشوں کی ضرورت ہو۔ بلکہ ایک خاص طرح کے انسانوں کی طرف انگلی اٹھا دی کہ صراطِ مستقیم ان لوگوں کی راہ ہے۔ اس اسلوب بیان نے ہر انسان کے سامنے صراطِ مستقیم کو ایک محسوس و مشہود صورت میں نمایاں کر دیا۔ ہر انسان خواہ کسی عہد اور کسی ملک و قوم سے تعلق رکھتا ہو، لیکن اس بات سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ یہاں دو طرح کے انسان موجود ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کی راہ سعادت و کامیابی کی راہ ہے، ایک وہ ہیں جن کے حصے میں محرومی و شقاوت آئی ہے۔ پس کامیابی کی راہ کی پہچان اس سے زیادہ بہتر اور مؤثر

سعادت کی تمام نعمتیں بھی ان کے لیے مہیا تھیں، بایں ہمہ انھوں نے روگردانی کی، اور راہِ حق کی معرفت حاصل کر کے پھر اس سے منحرف ہوگئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہی قوم جو کل تک دنیا کی انعام یافتہ جماعت تھی، سب سے زیادہ محروم و نامراد جماعت ہوگئی۔ اسی طرح کتنی ہی جماعتیں ہیں جن کے سامنے فلاح و سعادت کی راہ کھول دی گئی لیکن انھوں نے معرفت کی جگہ جہل اور روشنی کی جگہ تاریکی پسند کی نتیجہ یہ نکلا کہ راہِ حق نہ پا سکے اور نامرادی و محرومی کی وادیوں میں گم ہوگئے۔

احادیث و آثار میں اس کی جو تفسیر بیان کی گئی ہے، اس سے یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ ترمذی اور احمد و ابن حبان وغیرہم کی مشہور حدیث ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: "المغضوب" یہودی ہیں اور "الضالین" نصاریٰ ہیں۔ یقیناً اس تفسیر کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ مغضوب سے مقصود صرف یہودی اور گمراہ سے مقصود صرف نصاریٰ ہیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ مغضوبیت اور گمراہی کی حالت واضح کرنے کے لیے دو جماعتوں کا ذکر بطور مثال کے کر دیا گیا۔ چنانچہ ان دونوں جماعتوں کی تاریخ میں ہم محرومی کی دونوں حالتوں کا کامل نمونہ دیکھ لے سکتے ہیں یہودیوں کی قومی تاریخ مغضوبیت کے لیے اور عیسائیوں کی تاریخ گمراہی کے لیے عبرت و تذکیر کا بہترین سرمایہ ہے۔

قرآن کے قصص اور استقراءِ تاریخی

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، قرآن نے ہدایت و تذکیر ام کے لیے جن جن اصلوں پر زور دیا ہے، ان میں سب سے زیادہ نمایاں اصل پچھلی قوموں کے ایّام و وقائع اور ان کے نتائج ہیں۔ وہ کہتا ہے کائناتِ ہستی کے ہر گوشے کی طرح قوموں اور جماعتوں کے لیے بھی خدا کا قانونِ سعادت و شقاوت ایک ہی ہے اور ہر عہد اور ہر ملک میں ایک ہی طرح کے احکام و نتائج رکھتا ہے۔ اس کے احکام میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور اس کے نتائج ہمیشہ اور ہر حال میں اٹل ہیں۔ جس طرح سنکھیا کی

گمراہ ہو کر بھٹک گئے۔

"مغضوب علیہ" گروہ "منعم علیہ" کی بالکل ضد ہے۔ کیونکہ انعام کی ضد غضب ہے، اور فطرت کائنات کا قانون یہ ہے کہ راست باز انسانوں کے حصّے میں انعام آتا ہے۔ نافرمانوں کے حصّے میں غضب۔ "گمراہ" وہ ہیں جو راہِ حق نہ پا سکے، اور اس کی جستجو میں بھٹک گئے۔ پس مغضوب وہ ہوئے جنھوں نے راہ پائی اور اس کی نعمتیں بھی پائیں لیکن پھر اس سے منحرف ہو گئے، اور نعمت کی راہ چھوڑ کر محرومی و شقاوت کی راہ اختیار کر لی۔ گمراہ وہ ہوئے جو راہ ہی نہ پا سکے، اس لیے ادھر ادھر بھٹک رہے ہیں، اور صراطِ مستقیم کی سعادتوں سے محروم ہیں۔

"مغضوب علیہ" کی محرومی، حصول و معرفت کے بعد انکار کا نتیجہ ہے، اور گمراہ کی محرومی جہل کا نتیجہ پہلے نے پا کر روگردانی کی اس لیے محروم ہوا، دوسرا پا ہی نہ سکا اس لیے محروم ہے، محروم دونوں ہوئے، مگر یہ ظاہر ہے کہ پہلے کی محرومی زیادہ مجرمانہ ہے۔ کیونکہ اس نے نعمت حاصل کر کے پھر اس سے روگردانی کی۔ اسی لیے اسے مغضوب کہا گیا، اور دوسرے کی حالت صرف گمراہی کے لفظ سے تعبیر کی گئی۔

ہم دیکھتے ہیں، دنیا میں فلاح و سعادت سے محروم آدمی ہمیشہ دو ہی طرح کے ہوتے ہیں جاحد اور جاہل۔ جاحد وہ ہوتا ہے جو حقیقت پا لیتا ہے، بایں ہمہ اس سے روگردانی کرتا ہے جاہل وہ ہوتا ہے جو حقیقت سے ناآشنا ہوتا ہے، اور اپنے جہل پر قانع ہو جاتا ہے۔ پس صراطِ مستقیم پہ چلنے کی طلبگاری کے ساتھ، محرومی و شقاوت کی ان دونوں صورتوں سے بچنے کی طلب بھی سکھلا دی تاکہ فلاح و سعادت کی راہ کا تصور ہر طرح کامل اور لغزشوں سے محفوظ ہو جائے۔

جہاں تک مذہبی صداقت کا تعلق ہے، دونوں طرح کی محرومیوں کی مثالیں قوموں کی تاریخ میں موجود ہیں۔ کتنی ہی قومیں ہیں جن کے قدم صراطِ مستقیم پر استوار ہو گئے تھے، اور فلاح و

کہتا ہے، کیونکہ یہ فطرت الٰہی کی قبولیت ہے۔ بُرے نتائج کو "غضب" کہتا ہے کیونکہ یہ قانونِ الٰہی کی پاداش ہے۔ وہ کہتا ہے جن اسباب و علل سے دس مرتبہ ایک خاص طرح کا معلول پیدا ہو چکا ہے، تم کیونکر انکار کر سکتے ہو کہ گیارھویں مرتبہ بھی ویسا ہی معلول پیدا نہ ہوگا؟

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ	تم سے پہلے بھی دنیا میں (خدا کے) احکام و قوانین
فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا	کے نتائج گذر چکے ہیں۔ پس ملکوں کی سیر کرو، اور
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ	دیکھو ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جنھوں نے (اللہ...

(آل عمران: ۱۳۷)

قرآن کی سورتوں میں ایک بڑی تعداد ایسی سورتوں کی ہے، جو تمام تر اسی مطلب پر مشتمل ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں جس قدر بیان بھی پچھلی عہدوں کے وقائع و قصص کا ہے وہ تمام تر سورۂ فاتحہ کی اسی آیت کی تفصیل ہے۔

سورۂ فاتحہ کی تعلیمی روح

اچھا، اب چند لمحوں کے لیے سورۂ فاتحہ کے مطالب پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالو اور دیکھو اس کی سات آیتوں کے اندر مذہبی عقائد و تصور کی جو روح مضمر ہے، وہ کس طرح کی ذہنیت پیدا کرتی ہے؟ سورۂ فاتحہ ایک دعا ہے۔ فرض کرو ایک انسان کے دل و زبان سے شب و روز یہی دعا نکلتی رہتی ہے۔ اس صورت میں اس کے فکر و اعتقاد کا کیا حال ہوگا؟

وہ خدا کی حمد و ثنا میں زمزمہ سنج ہے، لیکن اس خدا کی حمد میں نہیں جو نسلوں، قوموں اور مذہبی گروہ بندیوں کا خدا ہے، بلکہ رَبُّ الْعٰلَمِیْن کی حمد میں جو تمام کائناتِ خلقت کا پروردگار ہے۔ اور اس لیے تمام نوعِ انسانی کے لیے یکساں طور پر پروردگاری و رحمت رکھتا ہے۔ پھر وہ اسے اس کی صفتوں کے ساتھ پکارنا چاہتا ہے، لیکن اس کی تمام صفتوں میں سے صرف رحمت اور عدالت ہی کی صفتیں اسے یاد آتی ہیں، گویا خدا کی ہستی کی نمود اس کے لیے سرتاسر رحمت و عدالت کی نمود ہے۔ اور

تاثیر اس لیے بدل نہیں جا سکتی کہ وہ کس عہد اور کس سنہ میں استعمال کی گئی، اسی طرح قوموں اور جماعتوں کے اعمال کے نتائج بھی اس لیے متغیر نہیں ہو جا سکتے کہ کس ملک میں پیش آئے۔ اگر ماضی میں ہمیشہ شہد، شہد کا خاصہ رکھتا آیا ہے اور سنکھیا کی تاثیر سنکھیا ہی کی رہی ہے تو مستقبل میں بھی ہمیشہ شہد شہد ہی رہے گا۔ اور سنکھیا کی تاثیر سنکھیا ہی کی ہوگی۔ پس جو کچھ ماضی میں پیش آ چکا ہے ضروری ہے کہ مستقبل میں بھی پیش آئے۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِى الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝ (۳۳ : ۶۲)	جو لوگ تم سے پہلے گذر چکے ہیں ان کے لیے اللہ کی سنت یہی رہی ہے (یعنی اللہ کے قوانین اور احکام کا دستور یہی رہا ہے) اور اللہ کی سنت... میں کبھی ردوبدل نہیں پاؤ گے
فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ۝ (۳۵ : ۴۳)	پھر یہ لوگ کس بات کی راہ تک رہے ہیں؟ کیا اس سنت کی جو اگلے لوگوں کے لیے رہ چکی ہے؟ تو یاد رکھو، تم اللہ کی سنت کو کبھی بدلتا ہوا نہیں پاؤ گے، اور نہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ اس کی سنت کے احکام میں کبھی تغیر پاؤ گے
سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا (۱۷ : ۷۷)	(اے پیغمبر!) تم سے پہلے جن رسولوں کو ہم نے بھیجا ہے، ان کے لیے ہماری سنت یہی رہی ہے اور ہماری سنت کبھی ٹلنے والی نہیں

چنانچہ وہ ایک طرف تو انعام یافتہ جماعتوں کی کامرانیوں کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ دوسری طرف مغضوب اور گمراہ جماعتوں کی محرومیوں کی سرگذشتیں بار بار سناتا ہے، پھر جا بجا ان سے عبرت و بصیرت کے نتائج اخذ کرتا ہے جن پر اقوام و جماعات کا عروج و زوال موقوف ہے۔ وہ کھول کھول کر بتلاتا ہے کہ انعام یافتہ جماعتوں کی سعادت و کامرانی ان ان اعمال کا انعام تھی اور مغضوب و گمراہ جماعتوں کی شقاوت و محرومی ان ان بد عملیوں کی پاداش تھی۔ اچھے نتائج کو انعام سے

جو کچھ بھی اس کی نسبت جانتا ہے، وہ رحمت و عدالت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ پھر وہ اپنا سر نیاز جھکاتا اور اس کی عبودیت کا اقرار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے صرف تیری ہی ایک ذات ہے جس کے آگے بندگی و نیاز کا سر جھک سکتا ہے، اور صرف تو ہی ہے جو ہماری ساری درماندگیوں اور احتیاجوں میں مددگاری کا سہارا ہے۔ وہ اپنی عبادت اور استعانت دونوں کو صرف ایک ہی ذات کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے اور اس طرح دنیا کی ساری قوتوں اور ہر طرح کی انسانی فرمائیوں سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ اب کسی چوکھٹ پر اس کا سر جھک نہیں سکتا۔ اب کسی قوت سے وہ ہراساں نہیں ہو سکتا۔ اب کسی کے آگے اس کا دستِ طلب دراز نہیں ہو سکتا!

پھر وہ خدا سے سیدھی راہ چلنے کی توفیق طلب کرتا ہے۔ یہی ایک مدعا ہے جس سے زبانِ احتیاج آشنا ہوتی ہے۔ لیکن کونسی سیدھی راہ؟ کسی خاص نسل کی سیدھی راہ، کسی خاص قوم کی سیدھی راہ؟ کسی خاص مذہبی حلقے کی سیدھی راہ؟ نہیں، وہ راہ جو دنیا کے تمام مذہبی رہنماؤں اور تمام راست باز انسانوں کی متفقہ راہ ہے، خواہ کسی عہد، اور کسی قوم میں ہوئے ہوں۔ اس طرح وہ محرومی اور گمراہی کی راہوں سے پناہ مانگتا ہے، لیکن یہاں بھی کسی خاص نسل و قوم یا کسی خاص مذہبی گروہ کا ذکر نہیں کرتا بلکہ ان راہوں سے بچنا چاہتا ہے جو تمام محروم اور گمراہ انسانوں کی راہیں رہ چکی ہیں۔ گویا جس بات کا طلبگار ہے، وہ بھی نوعِ انسانی کی عالمگیر اچھائی ہے، اور جس بات سے پناہ مانگتا ہے، وہ بھی نوعِ انسانی کی عالمگیر برائی ہے۔ نسل، قوم، ملک، یا مذہبی گروہ بندی کے تفرقہ و امتیاز کی کوئی پرچھائیں اس کے دل و دماغ پر نظر نہیں آتی۔

غور کرو، مذہبی تصور کی یہ نوعیت انسان کے ذہن و عواطف کے لیے کس طرح کا سانچا مہیا کرتی ہے؟ جس انسان کا دل و دماغ ایسے سانچے میں ڈھل کر نکلے گا، وہ کس قسم کا انسان ہوگا؟ کم از کم دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے۔ ایک یہ کہ اس کی خدا پرستی خدا کے عالمگیر رحمت و جمال کے تصور کی خدا پرستی ہوگی دوسری یہ کہ کسی معنی میں بھی نسل و قوم یا گروہ بندیوں کا انسان نہیں ہوگا۔ عالمگیر انسانیت کا انسان ہوگا اور دعوتِ قرآنی کی اصلی روح یہی ہے۔


INDIAN COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS LIBRARY
NEW DELHI